تاریخ 39

ایڈیٹر

ڈاکٹر مبارک علی

مجلس مشاورت

ڈاکٹر سید جعفر احمد

ڈاکٹر روبینہ سہگل

پرویز وندل

ساجدہ وندل

غافر شہزاد

اشفاق سلیم مرزا

انور شاہین

نوین جی حیدر

ہما غفار

تھاپ پبلیکیشنز لاہور

خط و کتابت (برائے مضامین)
بلاک 1، اپارٹمنٹ الیف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ
فون: 042-36665997
ای میل: mubarakali21@yahoo.com

قیمت فی شمارہ غیر مجلد	:	320 روپے
قیمت فی شمارہ مجلد	:	400 روپے
سرورق	:	سعید ابراہیم
اہتمام	:	سانجھ۔ لاہور 042-37355323
پرنٹرز	:	شرکت پریس لاہور
تاریخ اشاعت	:	ستمبر 2009ء

THAAP PUBLICATIONS TRUST FOR HISTORY ART & ARCHITECTURE OF PAKISTAN
43 G-Gulberg III, Lahore
Tel : 042-35880822, Fax : 042-35725739,
email : thaappublications@gmail.com

فہرست

ابتدائیہ		5
پاکستان میں فوجی استبداد کی تاریخی بنیادیں	ڈاکٹر سیّد جعفر احمد	7
جلیانوالا باغ اور پنجاب کا مارشل لاء	یاسر حنیف	24
صبح بے نور: ایوب خان کا آمرانہ دور	روبینہ سہگل	38
فوجی اور فلسفی	نوین جی حیدر	68
پاکستان میں مارشل لاء حکومتوں کا سویلین بہروپ	محمد عابد عباسی	100
مارشل لاء کی تاریخ اور اس کے سماج پر اثرات	ڈاکٹر مبارک علی	123
آنچل سے پرچم تک	انیس ہارون	132
فوجی آمریتیں اور پاکستانی صحافت	توصیف احمد	147
مارشل لاء اور تعمیرات	پرویز وندل	205
مساجد کی تعمیراتی تشخص اور مارشل لاء	غافر شہزاد	211
بلدیاتی ادارے اور ہمارے فوجی حکمران	ڈاکٹر ظہور احمد چودھری	220
عوامی احساس رکھنے والی عدلیہ	فیصل صدیقی	226
نظریہ میں ملفوف آمریت	اشفاق سلیم مرزا	232
بعد از نو آبادیاتی ریاست میں سلامتی کا تصور	ڈاکٹر مطاہر احمد	244

دستاویزات

251

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جنرل ایوب خاں کا قوم سے خطاب 252

مارشل لاء کے نفاذ پر جنرل یحییٰ خاں کا قوم سے خطاب 256

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جنرل ضیاء الحق کا قوم سے خطاب 258

اقتدار پر فوجی قبضے کے بعد جنرل پرویز مشرف کا قوم سے خطاب 263

پاکستان میں بادشاہت کے قیام کے حق میں جنرل ایوب اور ان کے
وزیر خارجہ منظور قادر کے نام پیر علی محمد راشدی کے خطوط 265

ابتدائیہ

تاریخ میں فوج کے ذریعہ افراد اقتدار حاصل کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ فوج وہ ادارہ تھی کہ جس کے پاس ہتھیار ہوتے تھے جو طاقت اور جبر کی علامت تھے۔ مگر یہ صورتحال کولونیل دور میں اور زیادہ بدلی، جب اس نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے پیشہ ورانہ فوج تیار کی تاکہ ان کے خلاف جو مزاحمتی تحریکیں تھیں انہیں کچلا جائے اور امن و امان کو قائم رکھا جائے۔

یہ مستعد اور نظم و ضبط کی فوج کولونیل دور کے بعد نئے آزاد ہونے والے ملکوں کو بطور ورثہ ملی۔ چونکہ یہ پیشہ ور تھی، ایک ادارے کی حیثیت رکھتی تھی، اور جدید ہتھیاروں سے لیس تھی، اس لیے دوسرے ریاستی اداوں کے مقاصد میں اسے برتری حاصل تھی۔

اس کے علاوہ ہر نئے آزاد ہونے والے ملک نے اپنی فوجی طاقت کو مزید بڑھایا۔ جو اس کی شہرت، تحفظ اور مرتبہ کے لیے ضروری تھی۔ فوج کو نیا اسلحہ دیا گیا۔ ان کی تربیت کی گئی۔ اور ان میں یہ احساس پیدا کیا گیا کہ ریاست کے دوسرے ادارے ان کے مقاصد میں کم تر ہیں۔ عام شہریوں کے بارے میں ان میں حقارت کے جذبات پیدا کئے گئے۔

لہٰذا جب بھی ملک میں سیاسی ابتری پھیلی، اور سیاسی حکومتیں صورت حال کو سنبھالنے میں ناکام ہوگئیں تو فوج نے اپنی ذمہ داری سمجھی کہ ملک کی باگ ڈور خود سنبھال لے۔

پاکستان میں اس کی ابتدا 1958ء سے ہوئی اس کے بعد 1969 ,1977 اور 1999 میں فوج نے اقتدار سنبھالا۔

مارشل لاء کے پاکستان کی تاریخ پر کیا اثرات ہوئے۔ اس کا جائزہ لینے کے

لیے 'تاریخ' کی جانب سے اس موضوع پر پہلی کانفرنس 19 اپریل 2009ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ جس میں لاہور ہائی کورٹ بار نے تعاون کیا، اس کی صدارت علی احمد کرد جو پاکستان سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ انہوں نے کی۔

دوسری کانفرنس 8 مئی 2009ء کو کراچی میں ہوئی۔ جس کی صدارت جسٹس فخرالدین جی ابراہیم نے کی۔ اس کا اہتمام ڈاکٹر جعفر احمد نے کیا اور ڈاکٹر طارق سہیل نے اس کے انعقاد میں تعاون کیا، یہ کانفرنس جناح میڈیکل کالج کے آڈیٹوریم میں ہوئی۔

ہم تاریخ کی جانب سے سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن، لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن اور طارق سہیل ٹرسٹ کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمارے ساتھ تعاون کر کے دونوں کانفرنس کو کامیاب بنایا۔

تاریخ کے اس شمارے میں ان دونوں کانفرنسوں کے مقالات شامل ہیں، ہم ان مقالہ نگاروں کے شکر گزار ہیں کہ جنہوں نے ان تحقیقی مقالات کو پیش کیا۔

آخر میں، میں ڈاکٹر جعفر احمد کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنہوں نے کراچی میں پڑھے جانے والے مقالات کی تیاریوں میں مدد کی۔ اُمید ہے کہ یہ مقالات، پاکستان کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی

اگست 2009ء لاہور

پاکستان میں فوجی استبداد کی تاریخی بنیادیں

عہدِ وسطیٰ اور نوآبادیاتی دور میں ریاست و معیشت سے فوج کا تعلق

ڈاکٹر سید جعفر احمد

پاکستان اپنے قیام کے بعد پچھلے باسٹھ برسوں میں چار مرتبہ براہِ راست فوجی اقتدار کے تجربے سے گزر چکا ہے۔ ان چار ادوار میں جنرل ایوب خان (۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۹ء)، جنرل یحییٰ خان (۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۱ء)، جنرل ضیاء الحق (۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۸ء) اور جنرل پرویز مشرف (۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۸ء) مملکت کے اقتدار پر فائز رہے۔ مجموعی حیثیت سے ان چار فوجی ادوار کی مدت بتیس (۳۲) سال سے کچھ اوپر بنتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ملک کی باسٹھ سالہ تاریخ کے نصف سے زیادہ حصے میں فوج ہی اقتدار میں رہی ہے۔ پاکستان میں ریاست کے کردار اور سیاست کے بالادست اداروں کی نوعیت اور اثر و اہمیت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ وہ ادوار جن میں فوج براہِ راست طور پر اقتدار میں نہیں تھی، ان میں بھی امورِ مملکت اور حکومتوں کے قیام اور ان کی معزولی کے پیچھے فوج کا ایک کلیدی کردار رہا ہے۔ اس لحاظ سے پاکستان کی سیاسی تاریخ کو فوج کی بالادستی کی تاریخ قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسا ملک جس کے قیام سے پہلے اس کے جمہوری کردار کو طے شدہ تصور کیا گیا تھا، وہ اپنے قیام کے بعد جمہوریت کے راستے پر گامزن کیوں نہیں ہو سکا اور فوجی اقتدار اس ملک میں ایک استثناء کے بجائے معمول کی حیثیت کا حامل کس طرح بن گیا۔ سیاسی تجزیہ نگاروں اور پیشہ ور سیاسی دانش وروں نے اپنے اپنے انداز میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ بالعموم لبرل علمِ سیاسیات کے تناظر میں تحقیق کرنے والے اہل دانش نے اس سوال کا جواب قیام پاکستان کے وقت پائی جانے والی، مملکت کے اداروں کی داخلی ساخت اور ان کے باہمی عدم توازن، قیام

پاکستان کے وقت کی آئینی صورتحال اور مسلم لیگ کے داخلی تضادات کے اندر تلاش کیا ہے۔ مارکسی طرزِ فکر رکھنے والے اہلِ قلم بالعموم پاکستان کی سماجی ساخت اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے اندر اس کی ایک ذیلی یا مضافاتی (peripheral) حیثیت کو اپنے تجزیوں کی بنیاد بناتے ہیں۔ ان دونوں طرز کے تجزیوں میں قیام پاکستان کے وقت ایک مضبوط اور موثر ادارے کی حیثیت سے فوج کی موجودگی کو مستقبل میں اس کے حاکمانہ کردار کی بنیاد کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے، لیکن تحقیق اور تجزیے کے نقطۂ نظر سے صرف قیام پاکستان کے وقت فوج کی بالادستی کو شناخت کر لینا ہی شاید کافی نہیں۔ اس امرِ واقعی کو مزید پختگی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ہم فوج کے کردار کو مزید پیچھے جا کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس بات کا تعین کرنے کی سعی کرتے ہیں کہ خود ہندوستان میں انگریزی استعمار کے دور میں اور اس سے بھی قبل کے ادوار میں فوج اور مملکت کے امور کا کیا رشتہ تھا۔ اس زاویے سے دیکھیں تو ہمیں آزادی سے قبل کے ہندوستان کے ریاستی دروبست کا جائزہ لینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ آزادی کے بعد کی سیاست اور اس سے قبل کے ریاستی نظم کے درمیان کسی تعلق کی تلاش سیاست اور تاریخ کے مکالمے سے ہی ممکن ہو سکتی ہے اور اسی قسم کا ایک مکالمہ اس مضمون میں ہمارے پیش نظر ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ادھر پچھلے تیس پینتیس برسوں میں جنوبی ایشیا میں تاریخ اور سیاست کے مطالعوں میں ماقبلِ نوآبادیاتی (pre-colonial)، نوآبادیاتی (colonial) اور مابعد نوآبادیاتی (post-colonial) کی سرحدیں بہت تیزی کے ساتھ دھندلی ہوتی چلی گئی ہیں۔ ان برسوں میں بڑی تعداد میں ایسے سیاسی دانش وراور مؤرخ سامنے آئے ہیں جو اس بات کو محض ایک خام خیالی تصور کرتے ہیں کہ انگریز کے چلے جانے اور ۱۴/اور ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو علی الترتیب پاکستان اور ہندوستان کے نام سے دو مملکتوں کے قیام سے اس خطے میں ماضی سے کٹ کر کسی نئے دور کا آغاز ہو گیا تھا۔ برصغیر کی تاریخ سے متعلق نئے طرزِ فکر کے مطابق آزادی کے اعلان نامے نے سیاسی اور جغرافیائی سطح پر برصغیر میں جو ردوبدل کیا اس سے قطع نظر، معاشرے کی سماجی ساخت، اقتصادی نظام اور پیداواری رشتوں اور ریاست کے بنیادی آمرانہ کردار میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ چنانچہ مابعد نوآبادیاتی دور کے اندر نوآبادیاتی دور کا نظام رچا بسا رہا۔ ہر دو ادوار کا یہ تال میل جس نے برسوں بعد سماجی اور سیاسی مطالعوں میں اظہار پایا، ادب میں تقسیم

ہند کے وقت ہی منعکس ہونا شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی دور رس نگاہوں نے نہ صرف اپنے حال میں ماضی کے پرتو کو بہت بروقت اور عمدگی کے ساتھ پڑھ لیا تھا بلکہ اس کو اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنا لینے میں بھی کمالِ ہنر کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں فکشن اور شاعری میں سے بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ لیکن کسی ایک ہی مثال پر اکتفا کرنا ہو تو ن۔م۔راشد کی ایک نظم کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھیں تو آج کی بہت سی سماجی اور سیاسی تحقیق، راشد کی پچاس ساٹھ سال پرانی اس تخلیق میں اپنا ایک عکس دیکھ سکتی ہے۔

یہ قدسیوں کی زمیں
جہاں فلسفی نے دیکھا تھا، اپنے خوابِ سحر گہی میں
ہوائے تازہ و کشتِ شاداب و چشمۂ جانفروز کی
آرزو کا پرتو!
یہیں مسافر پہنچ کے اب سوچنے لگا ہے
'وہ خواب کا بوس تو نہیں تھا؟
وہ خواب کا بوس تو نہیں تھا؟'
اے فلسفہ گو!
کہاں وہ رویائے آسمانی؟
کہاں یہ نمرود کی خدائی!
تو جال بنتا رہا ہے جن شکستہ تاروں سے اپنے موہوم فلسفے کے
ہم اُس یقیں سے، ہم اس عمل سے، ہم اُس محبت سے
آج مایوس ہو چکے ہیں (خوابِ سحر گئی)

برصغیر کے ماضی اور اس کے حال کے درمیان ۱۹۴۷ء کے خطِ فاصل کی علمی اور تحقیقی کم مائیگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انیرُدھ دیش پانڈے (Anirudh Deshpande) کا کہنا ہے کہ وہ بہت کچھ جس کو ہم استعماری (colonial) سمجھتے تھے، بعد ازاں وہ مابعد استعماری (post-colonial) بھی ثابت ہوا اور وہ بہت کچھ جو مابعد استعماری ہے، وہ اصل میں استعماری ہی ہے۔[1] ماضی و حال کے اس گہرے تعلقِ باہمی کا ایک اچھا اظہار اب ان نئی فوجی تاریخوں میں

بھی ہو رہا ہے جن میں ماضی کے طریقے سے ہٹ کر فوج کو ایک نئے انداز سے دیکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سیاسی ادب کے قارئین کے علم میں ہوگا کہ فوج سے متعلق مطالعے بالعموم اس ادارے کے قیام اور ارتقا اور اس کی داخلی خصوصیات کے احاطے تک محدود رہے ہیں۔ ان مطالعوں میں فوج کو ایک آزاد متغیرہ (independent variable) کی حیثیت حاصل رہی ہے لیکن اب جو نئے سیاسی مطالعے اور تاریخ نویسی ہمارے سامنے آئی ہے اس میں فوج کو معاشرے کی وسیع تر حقیقت کے ایک جز اور معاشرے کے دوسرے اجزاء کے ساتھ اس کے تعلق اور تناسب کے حوالے سے زیر بحث لایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں — اور خاص طور سے برصغیر کے تناظر میں — اسٹیفن کوہن (Stephen P.Cohen)[2] اور سیما علوی[3] کی تصانیف — اور ایک نسبتاً وسیع تناظر میں — وکٹر جی کیرنن (Victor G. Kiernan)[4] کی کتاب اس نئے طرزِ فکر کو سمجھنے میں بڑی معاون ہو سکتی ہیں۔ ان مطالعوں کا اصرار ہے کہ ہر معاشرہ مختلف عناصر و عوامل سے مرتب ہوتا ہے۔ ان عناصر اور عوامل کے اپنے مخصوص طریقہ ہائے کار (modalities) اور اپنی حرکیات (dynamics) ہوتی ہیں۔ ایک اہم عنصر کی حیثیت سے فوج کا مطالعہ معاشرے کے دوسرے عناصر و عوامل کے ساتھ اس کی ہم آہنگی یا عدم ہم آہنگی کی بنیاد پر ہی درست نتائج اخذ کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

پاکستان میں فوجی اقتدار کی تاریخی بنیادیں تلاش کی جائیں تو آزادی سے متصل قبل کا استعماری دور ایک مناسب پس منظر فراہم کرنے کے لیے کافی ہے، لیکن اس سے بھی پیچھے جانے کی کوشش کی جائے تو عہد وسطی میں بھی فوج امورِ مملکت میں اہم کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ بے جا نہ ہوگا کہ اس عہد میں بھی فوج کے کردار کو ایک نظر دیکھ لیا جائے اور اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ انگریز کے آنے کے بعد اس کردار میں کیا نوعی تبدیلی واقع ہوئی۔

عہدِ وسطیٰ کے حوالے سے جو ہم عصر وقائع پائے جاتے ہیں ان میں مختلف بادشاہوں کی فوجی مہموں کے تفصیلی بیانات درج ہیں۔ ان تاریخی وقائع میں فوجوں کے انتظام وانصرام، ان کی تشکیل، جنگوں میں ان کی کارکردگی، ان کے داخلی ڈسپلن، غرض ایک ادارے کے طور پر ان کی کم وبیش سب ہی تفصیلات درج کر دینے کا رجحان دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بعد کے مؤرخین نے، خاص طور سے تاریخ نویسی میں مختلف شعبوں میں اختصاص

(specialisation) کے رجحان کی ترقی کے بعد، فوج کے ادارے کو تفصیل کے ساتھ زیرِ بحث لاتے ہوئے بہت سے قابلِ ذکر مطالعے پیش کئے ہیں۔ مثلاً گرچرن سنگھ سندھو (Gurcharan Singh Sandhu) نے سلاطینِ دہلی کے آغاز سے مغلوں کے زوال تک، ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ میں لڑی جانے والی ساری جنگوں پر اپنے انداز میں روشنی ڈالی ہے اور کم وبیش ہر دور میں فوج کی تنظیم اور اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں پر گفتگو کی ہے۔[5] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے سلطنتِ دہلی اور مغلیہ سلطنت کے بارے میں اپنی کتابوں میں ایک، ایک باب مکمل طور پر افواج کے موضوع کا احاطہ کرنے کے لیے مختص کیا ہے۔[6] اسی طرح ولیئم اِروائن (William Irvine) نے مغلیہ دور میں افواج سے متعلق ساری تفصیلات اپنی کتاب میں دے دی ہیں۔ اس دور میں فوج میں بھرتی کا طریقۂ کار کیا تھا، فوج میں مختلف رینک کون کون سے تھے، تنخواہوں اور انعامات کی ادائیگی کس طرح ہوتی تھی، فوج کے مختلف شعبہ جات کون کون سے تھے، اسلحہ کی قسمیں کیا تھیں، ہاتھیوں اور دوسرے جانوروں کو جنگ میں کس طرح اور کس جگہ استعمال کیا جاتا تھا، جنگوں کو لڑنے کی حکمت عملی کیا ہوتی تھی، یہاں تک کہ مالِ غنیمت کو لوٹنے کے طے شدہ اور غیر طے شدہ طریقے کیا تھے — غرض فوج اور جنگ کے متعلق شاید ہی کوئی پہلو ہو جو اِروائن کی نظرِ تحقیق شعار سے اوجھل رہ گیا ہو۔[7] ہندوستان کے دو مصنفوں نے اپنی ایک مشترکہ تصنیف میں مغل افواج کی جنگی حکمت عملی کو اپنے تجزیے کے لیے منتخب کیا ہے اور یوں اپنے موضوع پر ایک گہرائی کی حامل کتاب پیش کر دی ہے۔[8] یہ ساری تحقیق اپنی جگہ اہم ہے مگر اس کا محور فوج اور صرف فوج ہے۔ البتہ مجموعی ریاستی در و بست میں اور وسیع تر سماجی اور سیاسی تناظر میں فوج کا کردار بعد کے برسوں میں اس وقت زیرِ بحث آنا شروع ہوا جب بیسویں صدی میں سیاسیات اور تاریخ نویسی کے شعبوں میں تحقیق کے نئے زاویے اجاگر ہونا شروع ہوئے۔ اس سیاسی اور تاریخی ادب میں عہدِ وسطیٰ میں فوج کے کردار کو بنیادی طور پر دو حوالوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک تو خود ریاست کے وسیع تر در و بست اور اس کے نظمِ حکمرانی کا زاویہ ہے جس کے حوالے سے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عہدِ وسطیٰ میں کس بادشاہ کے دور میں مرکزی اقتدار کتنا مضبوط تھا، مقامی ریاستوں اور صوبوں کو کتنی خود مختاری حاصل تھی، اس خود مختاری نے کب اور کس وجہ سے بغاوت کی شکل اختیار کی، مملکت میں مذہبی رواداری یا عدم رواداری نے کس طرح سیاست کی ضروریات کو

پورا کیا اور پھر یہ کہ ریاست نے اپنے قیام اور بقاء کے لیے فوج کے ادارے پر کتنا دارومدار کیا۔ دوسرا زاویہ سیاسی معیشت کا زاویہ ہے۔ اس زاویے سے فوج پر نظر ڈالنے والے مصنفین نے ہندوستان کی سماجی ساخت کو بنیاد بناتے ہوئے یہاں کے طبقاتی نظام اور پیداواری رشتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس انداز سے تحقیق کرنے والوں کی بھی رائے یہی بنی کہ عہدِ وسطیٰ میں ہندوستان کا نظامِ پیداوار اپنے تسلسل اور بقاء کے لیے فیصلہ کن انداز میں ریاست کی عسکری طاقت پر انحصار کرتا رہا۔ یہاں ہم ان دونوں زاویوں سے ہونے والے مطالعوں کی تفصیل میں جائے بغیر ان کے حاصلِ کلام اور نتائجِ فکر کا مختصر سا تذکرہ کریں گے۔

ریاست اور فوج عہدِ وسطیٰ میں

جہاں تک ریاست اور اس کے امور میں فوج کے کردار کا تعلق ہے، عہدِ وسطیٰ میں ہندوستان کا ریاستی نظام اس کی عسکری قوت کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ گو اس دور کی تاریخ کا بیشتر حصہ محلات کے اندر ہونے والی داخلی چپقلشوں اور سازشوں، دربار کی سرگرمیوں، فنونِ لطیفہ اور تعمیرات کے تذکروں سے پر نظر آتا ہے لیکن محلوں کے شب و روز ہوں یا بادشاہوں کا کرّ و فر، یا پھر بادشاہت کی یہ اہلیت کہ وہ نظروں کو خیرہ کر دینے والے تعمیر و ترقی کے منصوبوں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل لا سکے، ان سب کا دارومدار بادشاہ کی عسکری طاقت پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف کے مطابق 'اس عہد میں حکمراں طبقے کا ہر فرد ہتھیار بند ہے اور حکومت خود اس کا حق ہے جو تیغ زنی اور معرکہ آرائی کا مردِ میدان اور عسکری قیادت کے لیے ممتاز ہو۔'[9]

عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی ریاست ۱۰۰۰ء سے ۱۷۰۰ء کے دوران چھوٹی چھوٹی مقامی بادشاہتوں کے ادغام سے ایک مرکزی ریاست کی شکل میں ظہور پزیر ہوئی۔ سلطنتِ دہلی سے مغل دور تک دور افتادہ علاقے اس مرکزی ریاست میں شامل ہوتے رہے۔ اکبر کے زمانے تک یہ ریاست برصغیر کے بیشتر علاقے پر محیط ہو چکی تھی۔ بحیثیتِ مجموعی یہ ریاست ایک مرکزیت پسند عسکری بادشاہت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس ریاست میں بہت سے خوشحال طبقے بھی پائے جاتے تھے۔ امراء، منصب داروں اور تاجروں کی خوشحالی ایک حقیقت تھی اور ان حلقوں کی اپنی ایک پر از شان و شوکت مجلسی زندگی بھی تھی لیکن مملکت کا بنیادی دارومدار اور انحصار فوج پر ہی تھا۔ چنانچہ

متمول طبقات میں سے ایک یعنی تاجر طبقے کے بارے میں ڈاکٹر کے۔ایم۔اشرف لکھتے ہیں کہ:

'مرکزی شہروں میں تاجر پیشہ لوگ بھی رہتے ہیں جن کا کاروبار دیس بھر میں پھیلا ہوا ہے اور ان کی ہنڈیاں تغلق عہد سے برابر چلتی ہیں۔ یہ مغل عہد میں نگر سیٹھ اور جگت سیٹھ اور ملک التجار کے لقب سے نوازے جاتے ہیں اور بسا اوقات امیروں اور بادشاہوں کو بڑی بڑی رقمیں سودی قرضے پر دیتے ہیں بلکہ انہی میں سے ایک سورت کے تجارتی مرکز کا گورنر ہوتا ہے اور شاہ بندر کہلاتا ہے۔ مگر دولت اور درباری اثر کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس عسکری ملوکیت میں اس کو کوئی فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ مجلسی اعتبار سے یہ ضرور نظر آئے گا کہ ان کا معیارِ زندگی بہت بلند ہے اور یہ یورپ اور بیرون جات کے ساز وسامانِ آرائش کا استعمال کرتے ہیں'
[10]

عہدِ وسطیٰ میں جو مختلف خاندان ہندوستان پر حکومت کرنے میں کامیاب ہوئے، خواہ وہ خاندانِ غلاماں ہو یا خاندانِ بلبن، خواہ وہ خلجی اور تغلق خاندان ہوں یا سید یا لودھی یا پھر مغل حکمران — یا ایک مختصر عرصے کے لیے خاندانِ سور —، ان سب حکمرانوں کا اقتدار اپنے قیام یا بقاء یا دونوں کے لیے سب سے زیادہ جس عنصر پر منحصر تھا وہ عسکری طاقت ہی تھی۔ ان حکمرانوں نے جتنی توجہ اور محنت فوج کے ادارے کو مضبوط بنانے اور اس کو اپنے تابع رکھنے پر صرف کی وہ کسی اور شعبے پر صرف نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ فاتحین سے زیادہ فوج کی اہمیت اور کس پر واضح ہوسکتی تھی۔ سلطنت دہلی کے بارے میں تو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے ایک بڑا بلیغ فقرہ لکھا ہے کہ 'اس کا تو آغاز ہی ایک فوجی چھاؤنی (armed camp) سے ہوا تھا جس کو ایک مخاصمت رکھنے والی اور کسی حد تک مغلوب آبادی کے عین بیچ میں قائم کرنے اور عوام کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں کچھ وقت درکار تھا'[11]

یہی نہیں بلکہ جو بھی حکمراں دہلی کے تخت پر براجمان ہوا اُس کو بیرونی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی ہمیشہ ایک مضبوط فوج درکار رہی۔ داخلی اور خارجی ضروریات کے تناظر میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فوج کے ادارے کی اہمیت بڑھتی چلی گئی۔ مملکت کی وسعت میں

اضافے نے بھی فوج کی اہمیت میں اضافہ کیا۔ یہ اسی عمل کا نتیجہ تھا کہ دہلی کے ترک حکمرانوں کے زمانے میں ہی کئی قسم کی افواج مملکت کی عسکری قوت کا حصہ بن چکی تھیں۔ 'ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی اساس' کے مصنف اے۔ بی۔ ایم۔ حبیب اللہ اس ضمن میں چار قسم کی افواج کا ذکر کرتے ہیں۔

فوج کی پہلی قسم وہ مستقل سپاہیوں کو قرار دیتے ہیں جو براہِ راست سلطان کے ماتحت ہوتے تھے اور ان کی ملازمتیں بھی مستقل ہوتی تھیں۔ یہ لوگ بالعموم بادشاہ کی حفاظت اور محل کے اندر نظم وضبط قائم رکھنے پر مامور ہوتے تھے۔ ان کو وقتاً فوقتاً شہر سے باہر لے جا کر تربیت بھی دلوائی جاتی تھی۔ ان سپاہیوں کو جنگوں میں بھی شریک کیا جاتا تھا لیکن ان کی بنیادی حیثیت بادشاہ کے اپنے ذاتی دستے کی ہوتی تھی۔ فوج کی دوسری قسم وہ تھی جو صوبائی گورنر رکھتے تھے اور ان کی حیثیت بھی وہی تھی جو سلطان کے ماتحت کام کرنے والے سپاہیوں کی ہوا کرتی تھی۔ فوج کی تیسری قسم ان سپاہیوں پر مشتمل تھی جنہیں زمانۂ جنگ اور لڑائیوں کے وقت خصوصی طور پر بھرتی کیا جاتا تھا۔ اس قسم کی بھرتی کا بھی ایک طریقہ کار بن چکا تھا۔ جنگ کے موقع پر لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے پر آمادہ کیا جاتا تھا اور ایسے موقعوں پر ان کے جذبات کو اپیل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چنانچہ ۱۲۴۱ء میں منگولوں کی طرف سے لاہور کا محاصرہ کرنے پر صدر الصدور منہاج سراج سے بادشاہ نے کہا کہ وہ لوگوں کو کافروں سے لڑنے کے لیے نصیحت کرے۔ ۱۲۵۸ء میں بادشاہ نے مسلمانوں کو جنگ میں شامل ہونے پر آمادہ کرنے کی خاطر اُن میں جہاد کا جذبہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اس قسم کی فوجی بھرتی جس میں مذہب کو حوالہ بنایا جاتا تھا ظاہر ہے کہ مسلمانوں تک محدود تھی لیکن بحیثیت مجموعی فوج میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی شامل ہوتے تھے۔ فوج کی چوتھی قسم رضا کار شہریوں کی تھی۔ یہ وہ سپاہی تھے جو خود ہی کسی جنگ میں حصہ لینے کے لیے اپنا نام درج کراتے تھے۔ یہ لوگ بعض اوقات اپنے ہتھیار اور گھوڑے بھی خود مہیا کرتے تھے۔ رضا کار شہری فوجیوں کے سوائے تمام سپاہیوں کو ایک مقررہ معاوضہ نقد رقم یا زمین کے قطعہ کی صورت میں دیا جاتا تھا۔ فوجیوں کو جنگ کے مالِ غنیمت میں سے بھی حصہ ملتا تھا۔[۱۲]

فوج کا ادارہ کیونکہ بادشاہوں کے اقتدار کی پشت بانی کے لیے ناگزیر تھا لہٰذا بادشاہ بھی فوج کے اُمور پر براہ راست نظر رکھتے تھے اور اس کی تنظیم کرتے وقت جملہ سیاسی پہلوؤں کو

سامنے رکھتے تھے۔ سلاطین دہلی کے عہد میں ایک وزارتِ دفاع یا وزارت جنگ موجود تھی جس کو 'دیوان عرض' کہا جاتا تھا۔ اس وزارت کا سربراہ 'عریضِ ممالک' کہلاتا تھا جو فوج کے انتظام و انصرام اور اس کو ہر وقت مستعد رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ وہ فوج میں بھرتی کرنے اور فوجیوں کی تنخواہوں کے معاملات بھی طے کرتا تھا۔ سال میں کم از کم ایک مرتبہ تمام سپاہیوں کا معائنہ کیا جاتا تھا۔ تمام اہم جنگوں میں عریض فوج کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ خود بادشاہ بھی براہ راست فوج کے ساتھ رابطے میں رہتا تھا اور وہی فوج کا سپہ سالار بھی ہوتا تھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا کہنا ہے کہ جن بادشاہوں نے اپنی افواج کی تربیت کی طرف سے عدم توجہی کا مظاہرہ کیا ان کی افواج کی صفوں میں نظم وضبط بھی متاثر ہوا اور ان کی عسکری صلاحیت بھی کمزور پڑ گئی۔ اس سلسلے میں وہ فیروز شاہ کا خاص طور سے حوالہ دیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ بلبن کا ذکر کرتے ہیں جن کے عریض نے سپاہیوں کے ساتھ رحمدلی کا سلوک کرتے ہوئے ان کی ضروریات کو پورا کرنے اور وقتاً فوقتاً اُن کی مدد کرنے کی پالیسی اختیار کی لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی کارکردگی کا اعلیٰ معیار برقرار رکھنے کو بھی پیش نظر رکھا۔[۱۳]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلاطینِ دہلی نے ایک پالیسی کے تحت یہ بات بھی طے کر لی تھی کہ ایک موثر اور مستحکم فوج کی تشکیل کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا انحصار کسی ایک طبقے، علاقے، مذہب اور نسل پر نہ ہو۔ ان کا خیال تھا کہ فوج میں اگر کسی ایک نسل کی بالادستی ہوگی تو بادشاہ کا اس پر انحصار خود بادشاہ کی کمزوری کا ذریعہ بن جائے گا۔ خود مختلف سلاطین کے عروج و زوال میں اس عنصر نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ مرکز میں برسر اقتدار آنے سے پہلے خلجیوں نے بنگال میں اپنی نیم خودمختار حکومت قائم کر لی تھی اور بعد میں انہوں نے بلبن خاندان کو تخت سے محروم کر دیا تھا۔ بعد ازاں خود خلجیوں کا اقتدار بھی اسی طرح ختم ہوا۔ محمد بن تغلق نے خصوصی توجہ دیتے ہوئے اپنی فوج میں ترک، خلجی، ایرانی اور ہندوستانی سپاہیوں کو بھرتی کیا۔ شیر شاہ سوری نے اپنے افغان پس منظر کے باوجود صرف افغانیوں پر انحصار نہیں کیا اور فوج میں دوسری نسلوں کے لوگوں کو بھی شامل کیا۔ وسیع النظری کی یہ پالیسی صرف نسلی اور لسانی تنوعات ہی کے حوالے سے نہیں تھی بلکہ یہ مذہبی تنوعات کے حوالے سے بھی تھی۔ غزنوی افواج میں بھی ہندوؤں کو نہ صرف شامل کیا گیا بلکہ اعلیٰ عہدے بھی دیئے گئے۔ غزنوی افواج میں شامل ہندوؤں نے سلجوقوں کے خلاف جنگ میں حصہ

لیا۔ قطب الدین ایبک کی فوج میں بھی ہندو شامل رہے۔ بعد میں مغل افواج میں بھی کثیر النسلی اور کثیر المذہبی روایت اور کردار برقرار رکھا گیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ یہی روایت بعد میں انگریزوں کے بھی پیش نظر رہی۔[14]

مغلوں کے زمانے میں بھی ریاست اور فوج کے درمیان مزید قربت پیدا ہوئی۔ مغلوں نے بھی فوج کی اہمیت کو پیش نظر رکھا اور اس کے مختلف شعبوں مثلاً توپخانے اور پیادہ افواج کو غیر معمولی اہمیت دی۔ ابوالفضل نے اکبر کے توپخانے کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ ترکی کے سوا اور کوئی ملک سلطنت مغلیہ کے توپخانے کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ابوالفضل نے توپخانے میں موجود اسلحے اور اس کی باربرداری کے لیے استعمال ہونے والے جانوروں خصوصاً ہاتھیوں کے بارے میں مفصلاً اظہارِ خیال کیا ہے۔[15] مغلوں کے عہد میں فوج کے لیے قلعوں کی تعمیر پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ مغلیہ دور کی پوری تاریخ مختلف ریاستوں کی بغاوتوں کی بھی تاریخ ہے۔ ان بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے بھی مضبوط فوج کی ضرورت تھی جو بیشتر بادشاہوں کے پیش نظر رہی لیکن مغلوں کے زوال کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے مورخین نے یہ رائے بھی قائم کی ہے کہ باوجود مغل ریاست کے اندر فوج کے مرکزی کردار اور فوج کی تشکیل و توسیع میں مغلوں کی دلچسپی کے، یہ مغل سلطنت میں عسکری قوت اور سلطنت کی وسعت کا عدم تناسب تھا جس نے مغلوں کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا یہ بھی خیال ہے کہ مغلوں کی فوجی مشینری مستعد بھی نہیں رہی تھی بلکہ وہ تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ مغل ایک بڑی سلطنت بنانے میں کامیاب اس لیے ہوگئے تھے کہ ان کا سابقہ اپنے سے کمزور دشمنوں سے پڑا تھا جو ان کے وسائل کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مغلوں کی فوج اپنے غیر لچکدار اور جامد طریقوں کی وجہ سے غیر موثر ہوتی چلی گئی۔[16]

عہدِ وسطیٰ میں فوج اور سیاسی معیشت کے حقائق

عہدِ وسطی میں ریاست اور فوج کے تعلق کے علاوہ فوج کے کردار کو سمجھنے کا ایک اور زاویہ مملکت کی سیاسی معیشت سے فوج کی وابستگی کا زاویہ ہے۔ اس حوالے سے کئی مارکسی تاریخ نویسوں نے قابلِ ذکر کام کیا ہے جن میں مبسوط کتابیں اور وقیع علمی مقالے شامل ہیں۔ اس موضوع پر علمائے تاریخ

میں بحث ومباحثہ بھی ایک عرصے سے جاری ہے۔اس ضمن میں آغازِ گفتگو تو خود کارل مارکس کی طرف سے ہوا جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دنوں میں اور اس جنگ کے بعد بھی ہندوستان کے متعلق اپنی تحریروں میں یہاں کے بندوبستِ اراضی، یہاں کی زرعی معیشت اور ہندوستان کی پسماندگی کے سماجی اور تاریخی اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مارکس کے یہ خیالات اس کے اخباری تجزیوں میں سامنے آئے۔ یہ تجزیے ظاہر ہے کہ اخباری ضرورت کے پیشِ نظر عجلت ہی میں لکھے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے پر مارکس کے خیالات میں تبدیلی بھی آئی۔ تاہم ان تجزیوں میں ایک واضح طرزِ فکر اُجاگر ہوا جس پر بعد کے مورخین نے زیادہ یکسوئی کے ساتھ اور تفصیل میں جا کر تحقیق کی۔ مارکس کا خیال تھا کہ ہندوستان میں دیہی معیشت، ایشیائی طرزِ پیداوار (Asiatic mode of production) ہی کی ایک شکل ہے اور یہ یورپ کے کلاسیکی فیوڈل نظام سے یکسر مختلف ہے۔ یورپ میں فیوڈل دور میں زمین بڑے بڑے زمینداروں کی ذاتی ملکیت تھی اور اس کی حیثیت موروثی تھی۔ مارکس کا خیال تھا کہ ہندوستان میں یہاں کے مخصوص طبعی حالات، خاص طور سے یہاں زراعت کے لیے بارانی پانی کی بہت کم دستیابی کی وجہ سے زمین پر کاشت کا انحصار مصنوعی آب پاشی پر تھا۔ آب پاشی کا نظام انفرادی سطح پر استوار نہیں کیا جا سکتا تھا اور صرف حکومت ہی اس کا انتظام کر سکتی تھی۔ مارکس کے خیال میں یہی بنیادی سبب تھا جس کی وجہ سے ہندوستان میں زمین ریاست کی ملکیت بنی۔ البتہ ریاست اس زمین کو ایک خاص مدت کے لیے کاشت کے لیے دوسروں کو دے سکتی تھی۔ [۱۷]

ریاست کی طرف سے زمین کا مخصوص افراد کو دیا جانا ہندوستان میں منصب داری نظام کی اساس قرار پایا۔ منصب داری نظام دو مختلف طبقوں یا دو مختلف وظائف کو یکجا کرنے کی ایک صورت تھی۔ یہ دو وظائف اقتصادی اور عسکری وظائف تھے۔ منصب داری نظام میں یہ دونوں وظائف یوں یکجا ہو گئے تھے کہ منصب دار زمین کے حصول کے بعد ریاست کے لیے جہاں ایک طرف محصولات بہم کرنے کا ذمہ دار تھا وہیں دوسری طرف جنگوں کے دوران سپاہی اور باربردار جانور فراہم کرنا بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ منصب داروں کو پیداوار میں سے ایک حصہ بھی ادا کیا جاتا تھا تاہم زمین پر ان کی ملکیت نہ ہونے کے سبب ان کے مرنے پر زمین واپس ریاست کو منتقل ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر عرفان حبیب نے منصب داری نظام کی یہ سب تفصیلات اپنی کتاب 'مغلیہ ہندوستان کا زراعتی نظام'

میں مرتب کردی ہیں۔[18]

منصبداری نظام کے ذریعے فوج کی ذمہ داریوں اور ریاست کی اقتصادی سرگرمیوں کو جس طرح ہم آہنگ کیا گیا اس کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے یہ رائے قائم کی ہے کہ روایتی مسلم تاریخ نویسوں نے ریاست کے ملازمین کی تین اقسام بیان کی تھیں: پہلے، 'اصحاب السیف' — یہ وہ سپاہی اور جنگجو تھے جو ریاست کے دفاع کا کام کرتے تھے۔ دوسرے، 'اصحاب القلم'، جن میں مالیات کا حساب کتاب رکھنے والے اور لکھت پڑھت کرنے والے لوگ شامل تھے۔ تیسری قسم مذہبی رہنماؤں اور قاضیوں کی تھی جن کو 'اصحاب العمامہ' کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر قریشی کا خیال ہے کہ مغلوں نے مذکورہ بالا تین ریاستی کارگزاروں میں سے دو یعنی اصحاب السیف اور اصحاب القلم کو ایک قالب میں ڈھال دیا تھا۔ یہ کام زیادہ مربوط انداز میں بادشاہ اکبر کے زمانے میں ہوا۔[19] منصبداری نظام کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ ریاست کی معیشت اور اس کا دفاع دونوں آپس میں جڑ گئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ریاست کا دفاع اس کی معاشی کارکردگی اور اس کی معیشت کا دارومدار اس کی عسکریت کے اوپر ہو گیا تھا۔ آج کل کی زبان میں جس چیز کو ہم 'نیشنل سیکورٹی اسٹیٹ' کہتے ہیں، عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی ریاست بھی اپنی نوعی خصوصیات کے حوالے سے اس سے ملتی جلتی ریاست تھی۔

انگریزی استعمار کا دور

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد اور تجارت سے سیاسی تسلط تک اس کا سفر ایک نئے دور کا نقیب ثابت ہوا۔ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ماضی کے حملہ آوروں کے قبضے سے بہت مختلف اس لیے تھا کہ جہاں ماضی کے حملہ آور ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد یہیں متمکن ہو گئے اور انہوں نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنالیا۔ وہاں انگریز نے ہندوستان پر قبضے کے باوجود اس کو اپنے اصل وطن یعنی انگلستان سے کنٹرول کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ یوں ہندوستان صحیح معنوں میں پہلی مرتبہ ایک نوآبادی بنا اور سماجی اور سیاسی سطح پر اس نوآبادیاتی دور کے دوررس نتائج مرتب ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان پر اپنا قبضہ مکمل کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی عنانِ اقتدار تاجِ برطانیہ کے سپرد کردی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی معیشت میں جو سب سے اہم

نوعی تبدیلی واقع ہوئی وہ یہاں زمین کی نجی ملکیت کا آغاز تھا۔ انگریز نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے عمل میں جن مقامی دیہی عمائدین سے تعاون حاصل کیا تھا ان کو زمین کی ملکیت دینے میں فوقیت دی گئی۔ وفادار جاگیرداروں کا یہ طبقہ ماضی کے منصبداروں کی طرح جنگوں کے موقع پر انگریز کے بہت کام آیا اور پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں اس طبقے نے اپنے زیر اثر علاقوں سے فوجی بھرتی اور بار بردار جانوروں کی فراہمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

انگریز نے ہندوستان میں فوج کے ادارے کو اپنے نقطۂ نظر سے مزید مربوط بنایا اور اس کی قوت میں اضافہ کیا۔ معروف مورخ کرس اے بیلی (C.A. Bayly) نے 'دی نیو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا'، کے سلسلۂ کتب میں اپنی تصنیف جو ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے قیام کے موضوع پر لکھی گئی ہے، یہ رائے قائم کی ہے کہ ہندوستان میں کمپنی کا اقتدار بنیادی طور پر اس کے فوجی استبداد پر منحصر تھا۔ وہ اس فوجی استبداد کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً وہ ٹیپو سلطان جیسے بعض مقامی حکمرانوں کی مزاحمت اور ہندوستان میں فرانس جیسی دوسری استعماری طاقتوں کی طرف سے درپیش چیلنجوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ بالآخر کمپنی کی فوج ان رکاوٹوں کو عبور کرنے میں کامیاب ہوگئی اور اس کے فوراً بعد ہندوستان میں برطانوی فوجی توسیع کا کام شروع کر دیا گیا۔ کرس بیلی کا خیال ہے کہ ۱۷۹۰ء کے بعد ہندوستان میں برطانوی فوج کے پھیلاؤ میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا اور ۱۸۰۵ء تک اس کی تعداد کسی بھی یورپی فوج کے مقابلے میں زیادہ ہو چکی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ابتدا میں کمپنی کو ہندوستان کی 'کیولری' میں مقامی گھوڑوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا لیکن انیسویں صدی کے آغاز تک وہ ایک مضبوط 'کیولری' بنانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس 'کیولری' کی اہمیت یہ تھی کہ جہاں ایک طرف یہ پیادہ فوج اور توپخانے تک سپلائی لائن کا کام کرتی تھی وہیں دوسری طرف یہ دور افتادہ دیہی علاقوں کو کنٹرول کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتی تھی۔

کرس بیلی اس پہلو پر بھی اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ کمپنی کی حکومت کے زمانے میں ہی فوج اور معیشت کے درمیان ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ باوجود اس امر کے کہ آرتھر ویلز لے (Arthur Wellesley) نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ فوج اور سویلین، نیز عدالتی اور انتظامی اختیارات کو الگ رکھیں گے، عملاً یہ انتظام نہیں کیا جا سکا اور محصولات کی وصولی کا نظام جو

منرو (Munro) اور ریڈ (Reade) نے ان علاقوں میں قائم کیا جن پر ۱۷۹۲ء میں ٹیپو سلطان کو شکست دے کر قبضہ کیا گیا تھا، وہاں وہی نظام اختیار کیا گیا جو ماضی میں سلاطین کے دور میں مروج تھا۔ یعنی محصولات کے حصول سے فوج کے اخراجات پورے کرنا۔ اس طریقہ کار کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ فوج کے افسر اور سپاہی مالیات کے شعبوں بلکہ سیاسی معاملات میں بھی دخیل ہونے لگے۔[20]

انگریزی عہد میں فوج کے ادارے کو جدید خطوط پر منظم کیا گیا۔ پہلی مرتبہ ایک ہمہ وقت تیار فوج (standing army) ہندوستان میں وجود میں آئی۔ فوج کی تنخواہوں، الاؤنسوں اور پینشن کا ایک باقاعدہ نظام قائم کیا گیا۔ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا کہ معاشرے کے ایسے طبقات فوج میں آئیں جن کے پاس متبادل اقتصادی وسائل موجود نہ ہوں مثلاً ایسے دیہی علاقوں سے فوج میں بھرتی کا انتظام کیا گیا جہاں یا تو زراعت بالکل نہیں تھی یا اس کی پیداوار اتنی زیادہ نہیں تھی کہ مقامی باشندوں کی کفالت کر سکتی۔

نوآبادیاتی دور میں فوج کی تشکیل کرتے وقت انگریز کے پیشِ نظر یہ حقیقت بھی تھی کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے سے خود فوج کے اندر گروہ بندی پیدا ہو سکتی تھی۔ انگریز نے اس سلسلے میں بہت سوچ بچار کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ فوج میں بھرتی کرتے وقت سپاہیوں اور افسروں سے حلف تو ان کے مذہب کے نام پر ہی لیا جاتا تھا لیکن خود فوج کے اندر سپاہیوں کو متحرک کرنے اور ان کو اپنی جانیں قربان کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے مذہبی جذبات کو استعمال کرنے سے احتراز کیا جاتا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنی مادّی ضرورتوں اور روزگار کے حصول کی خاطر فوج میں بھرتی ہونے والے افسران جنگوں میں کس جذبے کے ساتھ لڑ سکتے تھے۔ کسی قومی یا مذہبی جذبے سے عدم وابستگی کی صورت میں، برطانوی استعمار کے لیے جنگیں لڑنا کیوں کر ممکن تھا؟ اس چیز کا انتظام انگریز نے بہت غور و فکر کے بعد کیا تھا اور وہ یہ کہ انہوں نے ہندوستانی سپاہیوں کی مختلف النوع وابستگیوں کو ایک دوسرے کے اندر ضم کرتے ہوئے ایک نئی وابستگی تشکیل دی تھی۔ یہ وابستگی وہ یکساں احساسِ تفاخر تھا جو ہندوستانی سپاہیوں کے اندر خود کو باقی معاشرے سے ممتاز دیکھ کر پیدا ہوتا تھا۔ دیہی علاقوں سے آنے والے پس ماندہ سماج کے افراد کو اس جذبے سے مامور کر دیا جاتا تھا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے رکھوالے ہیں۔ ان کے اندر اپنی یونٹ، اور اپنی رجمنٹ سے وابستگی کو بھی مستحکم کیا جاتا تھا جس کے نتیجے میں فوجی کسی قومی وابستگی کے بجائے یونٹ اور رجمنٹ یا ایک سلطنت کی فوج سے وابستگی کے احساس سے سرشار رہتا تھا۔[21]

انگریز کی فوجی بھرتی کی پالیسی میں ایک اور اہم پہلو نسلی انتخاب کا بھی تھا۔ انگریز کا

خیال تھا کہ ہندوستان میں بعض نسلیں دوسری نسلوں کے مقابلے میں زیادہ لڑاکا اور جنگجو واقع ہوئی ہیں۔ چنانچہ فوج میں بھرتی کرتے وقت ان علاقوں کو فوقیت دی گئی جہاں زیادہ تنومند اور صحت مند آبادیاں تھیں۔ ان نسلوں میں سکھ، گورکھا، راجپوت، پنجابی اور پختون شامل تھے۔ تامل، تیلگو، گجراتی اور بنگالی آبادی کو بالعموم فوج میں نظر انداز کیا جاتا تھا۔ فوج میں بھرتی ہونے والوں کے احساس تفاخر کی ایک بنیاد یہ سوچ بھی تھی کہ ہم باقی ماندہ ہندوستانیوں کے مقابلے میں برتر نسل کے لوگ ہیں۔

انگریزی استعمار کے مفادات جوں جوں عالمگیر شکل اختیار کرتے گئے ویسے ویسے ہندوستانی فوج کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس ہندوستانی فوج نے صرف ہندوستان میں ہی انگریز کے اقتدار کو مستحکم نہیں کیا بلکہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں جہاں جہاں انگریز کی نوآبادیات قائم تھیں یا جن علاقوں میں اس کو فوج کی ضرورت تھی وہاں ہندوستانی افواج کو کوئی نہ کوئی کردار حاصل ہو جاتا تھا۔ خود فوج کے ان افراد کو جو دور دراز علاقوں میں تعینات ہوتے تھے، اس تعیناتی کا فائدہ اضافی آمدنی کی صورت میں ہوتا تھا۔ چنانچہ ملایا، ہانگ کانگ اور بحرِ ہند کے دوسرے ساحلی علاقوں میں تعینات ہونے والے فوجی دوسرے ہندوستانی فوجیوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر آمدنی اور مراعات کے حامل بن جاتے تھے۔ یہ فوجی اپنی آمدنیاں جب اپنے گھروں کو بھیجتے تھے تو ان کے اہلِ خاندان بھی باقی ماندہ فوجیوں کے خاندان کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ خوشحال زندگی گزارتے تھے۔ اس طرح انگریز کی استعماری فوج میں بھرتی ہونے والے مقامی فوجیوں کا ذہن بھی غیر محسوس طور پر ایک استعماری ذہن بن جاتا تھا۔

انگریز کو آخر وقت تک اپنے ہندوستانی انتظام وانصرام پر ناز رہا اور وہ برملا اپنے نظمِ حکمرانی کا راز اپنے تشکیل کردہ دو اداروں یعنی افسر شاہی اور فوج کو قرار دیتا تھا۔ یہی وہ دو ادارے ہیں جنہوں نے تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کی باگ ڈور سنبھالی۔ پاکستان میں اگر افسر شاہی کے علاوہ فوج کی بالادستی باسٹھ سال سے قائم ایک حقیقت کے طور پر موجود ہے تو اس کی تاریخی بنیاد یہی ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان اپنے ماضی کے اور خاص طور سے نوآبادیاتی دور کے اقتصادی اور سیاسی نظام سے گلو خلاصی حاصل نہیں کر سکا۔ پاکستان کس طرح نوآبادیاتی نظام سے چھٹکارہ حاصل کر سکتا تھا یا کس طرح خود کو decolonise کر سکتا تھا اور اس کے لیے اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی سطح پر اس کو کس طرح کے اقدامات اُٹھانے کی ضرورت تھی یہ ایک اہم مگر ایک الگ موضوع ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ انیرُدھ دیش پانڈے، 'Introduction'، مشمولہ پارتھا سراتھی گپتا اور انیرُدھ دیش پانڈے (مرتبین)، *The British Raj and its Indian Armed Forces 1857-1939* (نئی دہلی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲ء)، ص۔۱

۲۔ اسٹیفن کوہن نے ہندوستان اور پاکستان کی افواج کے حوالے سے دو الگ الگ کتابیں لکھی ہیں۔ نوآبادیاتی دور کا حوالہ ان دونوں کتابوں میں تفصیلی طور پر آیا ہے۔ دیکھئے، *The Indian Army* (برکلے: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، ۱۹۷۱ء)، اور *The Pakistan Army* (برکلے: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، ۱۹۸۴ء)۔

۳۔ سیما علوی، *The Sepoy and the Company: Tradition and Transition in Northern India 1770-1830* (نئی دہلی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء)۔

۴۔ وکٹر جی۔ کیئرنن، *European Empires from Conquest to Collapse, 1815-1960* (لندن: فونٹانا، ۱۹۸۲ء)۔

۵۔ دیکھئے: میجر جنرل گرچرن سنگھ سندھو، *The Military History of Medieval India* (نئی دہلی: ویژن بکس، ۲۰۰۳ء)۔

۶۔ دیکھئے: آئی۔ ایچ۔ قریشی، *The Administration of the Sultanate of Dehli* (کراچی: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۵۸ء)، باب۔۷، اور *The Administration of the Mughul Empire* (کراچی: یونیورسٹی آف کراچی، ۱۹۶۶ء)، باب:۶

۷۔ دیکھئے: ولیم اِروائن، *The Army of the Indian Moghuls* (نئی دہلی: یوریشیا پبلشنگ ہاؤس (پرائیویٹ) لمیٹڈ، تاریخ ندارد)۔

۸۔ دیکھئے: عبدالشہاب الدین اور راج شری شکلا، *The Mughal Strategy of War* (دہلی، گلوبل ویژن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء)۔

۹۔ 'تاریخ اور مؤرخ' (ڈاکٹر کے۔ایم اشرف کی تحریریں)، مرتبہ: ڈاکٹر مبارک علی (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء)، ص۔۶۳

۱۰۔ ایضاً، ص۔۶۵

۱۱۔ آئی۔ایچ۔قریشی، *The Administration of the Sultanate of Dehli*، بحوالۂ سابقہ، ص۔۱۳۶

۱۲۔ دیکھئے: اے۔بی۔ایم۔حبیب اللہ، 'ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی اساس' (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۴)، ص ص۔۳۰۴۔۳۰۹

۱۳۔ ایضاً، ص ص۔۳۸۔۱۳۷

۱۴۔ ایضاً، ص ص۔۵۲۔۱۵۱

۱۵۔ ابوالفضل، 'آئین اکبری' منقولہ از آئی۔ایچ۔قریشی، *The Administration of the Mughul Empire*، بحوالہ سابقہ، ص۔۱۳۰

۱۶۔ ایضاً، ص۔۱۳۹

۱۷۔ ہندوستان کے بارے میں کارل مارکس کے تجزیوں اور ان کے تجزیے کے لیے دیکھئے: سبط حسن، 'مارکس اور مشرق'، مرتبہ: ڈاکٹر سید جعفر احمد (کراچی: مکتبۂ دانیال، ۲۰۰۹ء)۔

۱۸۔ عرفان حبیب، *The Agrarian System of Mughul India*، بمبئی، ۱۹۶۳ء

۱۹۔ آئی۔ایچ۔قریشی، *The Administration of the Mughul Empire*، بحوالۂ سابقہ، ص۔۸۸

۲۰۔ سی۔اے۔بیلی، *Indian Society and the Making of the British Empire*، بسلسلہ *The New Cambridge History of India*، جلد ۲:۱ (کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۸ء)، ص ص۔۸۸۔۸۴

۲۱۔ اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: اسٹیفن۔پی۔کوہن، *The Pakistan Army*، بحوالۂ سابقہ، ص ص۔۳۷۔۳۶

جلیانوالہ باغ اور پنجاب کا مارشل لاء

یاسر حنیف*

جلیانوالہ باغ کا واقعہ اور اس کے نتیجے میں لگنے والا مارشل لاء غیر منقسم برصغیر کی تاریخ کا پہلا مارشل لاء قرار دیا جاسکتا ہے۔ جنگ عظیم اوّل کے دوران تاج برطانیہ نے برصغیر سے بھرپور فائدہ اٹھایا، برصغیر سے تیرہ لاکھ ہندوستانی سپاہی اور مزدور یورپ، افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں سلطنتِ برطانیہ کے جھنڈے تلے جمع تھے۔ ہندوستان کی حکومت اور ریاستوں نے بڑے پیمانے پر خوراک، اسلحے اور پیسے کے ذریعے برطانیہ کی مدد کی۔

اس جنگِ عظیم کے دوران ہی ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ ہو چکا تھا جو انگریزوں کے بنیادی مقصد یعنی برصغیر پر مکمل حکمرانی کی راہ میں ایک رکاوٹ بن سکتا تھا۔ یہی ہندو۔ مسلم اتحاد انگریز پالیسی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ برطانوی استعمار کے ۹۰ سالہ دور میں انگریز نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ برصغیر کے عوام جو مختلف ثقافتی تنوعات کے حامل تھے، کسی ایک سیاسی پلیٹ فارم پر یکجا ہوں۔ ہندو مسلم اتحاد کی انگریزوں کی نگاہ میں کیا اہمیت تھی اس کا اندازہ بمبئی کے گورنر لارڈ الفنسٹن کے الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے جو اس نے ۱۴ مئی ۱۸۵۹ء کو اپنی روداد (Minutes) میں لکھے۔

"Divide et Impera was the old Roman motto, and it should be our's"[1]

۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو وزیرِ ہند مانٹیگو (Montegue) کی جانب سے ایک اعلان کیا

---

* لیکچرار، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی۔

گیا جس میں یہ وعدہ کیا گیا کہ جنگ کے بعد برصغیر میں برطانوی پالیسی کا مقصد بتدریج ایسی خودمختار حکومت کا قیام ہے جو مکمل طور پر ہندوستان کے نمائندوں کے سامنے جوابدہ ہوگی۔ ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا گیا کہ جنگ کے بعد ذمہ دار حکومت کی پہلی قسط کو نافذ کر دیا جائیگا اور اس کی تیاری کے لیے وزیر ہند جلد ہندوستان کا دورہ کریں گے۔[۲] جنگ کے دوران برصغیر میں بہت جوش وخروش تھا اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ میں شرکت کی وجہ سے جنوبی ایشیا کے مسلمان قدرتی طور پر ترکوں کے ساتھ تھے۔

جنگ کے بعد بڑے پیمانے پر ہونے والی ہلاکتوں، غربت اور مہنگائی میں اضافے، بھاری ٹیکسوں کے بوجھ، ساتھ ہی متعدی بیماریوں کے حملے اور جنگ کے دوران تجارت میں کمی کی وجہ سے ہندوستان کے عوام کی مجموعی حالت بہت خراب تھی اور جنگ کے خاتمے پر سلطنت عثمانیہ کے ساتھ کیا جانے والا ہتک آمیز صلح نامہ (معاہدہ سیورے) بھی مسلمانوں میں ہیجان کا سبب تھا۔ مسئلہ خلافت مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کر رہا تھا، ۱۹۱۸ء میں گاندھی بھی مسئلہ خلافت کے حق میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

جنگ عظیم کے دوران ہی بہت سے ایسے واقعات ہوئے جو رولٹ ایکٹ (Rowlett Act) کے نفاذ کا سبب بنے، ان میں افغانستان میں مہندر پرتاب کی قائم کی گئی حکومت جس کے بارے میں حکومت کا خیال تھا کہ اس کے تعلقات روس کی بالشویک پارٹی سے تھے، اس کے علاوہ بنگال اور پنجاب میں انقلابی تحریکیں سرگرم عمل تھیں۔ دیگر یہ کہ ہندوستان کی بھی عمومی حالت بہتر نہیں تھی۔

سلطنت برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کے حالات کو جاننے کے لیے ۱۹۱۸ء میں Sedition Committee بنائی گئی جس کی صدارت ایک انگریز جج سڈنی رولٹ کے پاس تھی۔ اس کمیٹی کی ذمہ داری تھی کہ ہندوستان کی مسلح تحریکوں، بالخصوص بنگال اور پنجاب میں موجود تحریکوں کے تعلقات کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔

اس کمیٹی کی سفارشات پر رولٹ ایکٹ جو Defence of India Act 1915 کا Extension تھا، جاری ہوا۔ اس کے ذریعے وائسرائے کی حکومت کو بے انتہا اختیارات حاصل ہوسکتے تھے۔ Imperial Legislative Council میں سرکاری ممبرز

اکثریت میں تھے، غیر سرکاری ممبرز جن میں قائداعظم محمد علی جناح بھی شامل تھے، نے اس بل کی شدید مخالفت کی۔ ابھی یہ قوانین زیر بحث تھے کہ گاندھی نے اس کے خلاف ستیہ گرہ کی تحریک شروع کردی۔ ۲۴ فروری کو گاندھی نے ۲۵ لیڈروں کی ایک کانفرنس بلائی جنھوں نے ستیہ گرہ کے حلف نامے پر دستخط کیے اور چند ہفتوں میں ہزاروں عوامی جلسوں میں اس حلف نامے کو دہرایا گیا۔ مارچ ۱۹۱۹ء کے آخر میں سرکاری ووٹوں کی بدولت یہ بل پاس ہوکر ایکٹ بن گیا۔[۳]

رولٹ ایکٹ دو بلوں کا مجموعہ تھا جو الگ الگ پاس ہوکر ایکٹ بنے۔ ان قوانین کے تحت سرکاری افسران کو یہ اختیارات حاصل ہوئے کہ وہ وجہ بتائے بغیر مقامی افراد کو نظر بند کرسکتے تھے، پریس پر پابندی عائد کی جاسکتی تھی اور بغیر کسی مقدمے کے سزا دی جاسکتی تھی۔ اس ایکٹ کے نفاذ سے عوام میں یہ تاثر پھیلا کہ حکومت آئندہ مزاحمت کو دبانے کے لیے یہ قوانین نافذ کررہی ہے لہٰذا یہ ایکٹ حکومت کی بدعہدی کا نشان سمجھا جانے لگا۔[۴] گاندھی کی ستیہ گرہ کی تحریک کے تحت سارے برصغیر میں جلسے منعقد ہونا شروع ہوئے امرتسر کے دو لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو (Kitchlew) اور ڈاکٹر ستیہ پال بھی گاندھی کی سول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہوئے۔ ۲۳ مارچ اور ۲۹ مارچ کو دو اجلاس ہوئے جن میں گاندھی کی تحریک کی حمایت کا فیصلہ کیا گیا۔

گاندھی نے پہلے ۳۰ مارچ اور پھر ۶ اپریل کو ہڑتال کی کال دی، دونوں دن پرامن ہڑتالیں اور احتجاجی جلسے ہوئے۔ دہلی میں ۳۰ مارچ کو جلوس پر پولیس نے فائرنگ کی لیکن اس کے باوجود ۶ اپریل کو دوبارہ جلوس نکالا گیا۔ ہندوستان کے دیگر شہروں میں بھی ہڑتالیں کی گئی اور جلسے منعقد ہوئے۔ ۹ اپریل کو رام نومی کا تہوار تھا اس دن پھر دکانیں بند رہیں یعنی عملاً ہڑتال رہی یہ تہوار مذہبی کم اور سیاسی زیادہ تھا۔[۵] ہندو اور مسلمانوں نے اس تہوار کو یک جہتی کے طور پر منایا۔

ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح پنجاب میں بھی یہ مظاہرے پرامن رہے لیکن پنجاب کے انتظامی حکمران لیفٹیننٹ گورنر مائیکل اوڈوائر (Lt. Governor Michael O'Dwyer) ان مظاہروں کو برداشت نہ کرسکے اور انہوں نے لاہور اور امرتسر میں جگہ جگہ فوجی دستے تعینات کردیئے، ساتھ ہی ان ہڑتالوں کے رہنماؤں کی نظر بندی کے احکامات جاری ہوئے۔ امرتسر کے ڈپٹی کمشنر مائیلز ارونگ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کے اثر و رسوخ سے سخت پریشان تھے انہوں نے کمشنر اور لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کو خط لکھا جس میں واضح

کیا کہ امرتسر کے عوام بے چین ہیں اور زور دیا کہ امرتسر میں فوج کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ پنجاب حکومت نے اس مکتوب پر بلا تاخیر عمل کیا اور ڈاکٹر صاحبان پر کسی بھی مجمع میں تقریر کرنے پر پابندی عائد کردی، ۱۹ اپریل کو حکومتِ پنجاب نے دونوں کے امرتسر سے اخراج اور کانگڑہ کے دھرم شالہ میں نظر بندی کے احکامات جاری کر دیئے۔

اگلے دن ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو ڈپٹی کمشنر نے اپنے بنگلے پر بلایا۔ ڈاکٹر صاحبان اپنے چند دوستوں کے ساتھ بنگلے پر پہنچے، وہاں سپرنٹنڈنٹ پولیس Mr. Rehil کی رہنمائی میں مختصر دستے کے ساتھ انہیں نظر بندی کے لیے روانہ کر دیا گیا اور ان کے دوستوں کو ایک گھنٹے تک بنگلے پر ہی روکے رکھا تا کہ یہ خبر فوراً عام نہ ہو سکے۔ ۱۱:۳۰ منٹ پر یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی اور ہر طرف دکانیں بند ہونے لگیں، لوگوں کا ہجوم ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی جانب روانہ ہوا۔ ان کا مقصد ڈپٹی کمشنر کے سامنے اپنا احتجاج ریکارڈ کرانا تھا ان لوگوں کے پاس کسی قسم کا کوئی اسلحہ موجود نہیں تھا۔ یہ لوگ نعرے لگا رہے تھے کہ ہمارے لیڈروں کو رہا کر دیا ہمیں بھی گرفتار کرو۔

حکومت کو اس بات کا اندازہ تھا کہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی نظر بندی پر شہر میں ہنگامے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے پہلے سے اسٹیشن، رام باغ، ریلوے کے پل، ہسپتال اور پولیس لائنز پر چیک پوسٹیں قائم کی جا چکی تھیں۔ کوتوالی کی حفاظت کے لیے بھی ۷۵ پولیس والوں کو متعین کیا گیا تھا۔

ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی جانب جانے والے ہجوم کو روک لیا گیا جس کے بعد یہ لوگ پرامن نہیں رہے، اس ہجوم پر فائرنگ ہوئی جس کے نتیجے میں کچھ افراد ہلاک ہو گئے، یہ ہجوم واپس ہو گیا اور کچھ دیر کے بعد پہلے سے زیادہ تعداد میں جمع ہو گیا، اس بار ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں موجود تھیں۔ دونوں پلوں پر، جن کو عبور کر کے سول لائنز میں داخل ہوا جا سکتا تھا، پولیس کا پہرہ تھا۔ وکلاء کے ایک گروپ نے درمیان میں آ کر صلح کرانے کی کوشش کی مگر اس دوران ہجوم کا ایک حصہ پل کے نیچے ریلوے لائن پر پھیل گیا وہاں فوجی کیمپ تھا اور سنتری پہرے پر موجود تھے۔ ان پہرے داروں نے جب ہجوم کو اسٹیشن کی جانب بڑھتے دیکھا تو گولی چلا دی جس کی آواز سن کر اوپر موجود ہجوم نے پولیس پر پتھر اور لکڑی کے ٹکڑے پھینکے جواب میں پولیس نے فائرنگ کر دی اور دس

افراد ہلاک ہو گئے۔

ان ہلاکتوں کے بعد مشتعل افراد نے نیشنل بینک، الائنس بینک، ٹاؤن ہال، مشن ہال، چارٹرڈ بینک اور بھگتانوالہ ریلوے اسٹیشن کو جلا دیا اور پانچ افراد کو ہلاک کر دیا، جن میں چار یورپین شامل تھے۔ ایک مشنری خاتون مس شیر ووڈ (Sherwood) پر حملہ کر کے اسے بری طرح زخمی کر دیا گیا۔ دس اپریل کے یہ تمام واقعات آنے والے دنوں میں ہونے والے ہنگاموں کی ابتدا ثابت ہوئے، اگر ان پر امن مظاہرین کو ڈپٹی کمشنر کے بنگلے تک جانے دیا جاتا تو ممکن ہے کہ دس اپریل کے واقعات رونما نہیں ہوتے۔

دس اپریل کے واقعات کے بعد امرتسر میں مکمل سکون تھا مگر سول انتظامیہ اس صورتحال سے مطمئن نہیں تھی، لاہور اور جالندھر سے مزید فوج طلب کر لی گئی ان فوجوں کی کمان میجر میکڈونلڈ کے ہاتھ میں تھی۔ رات میں جب میجر نے فوجی دستوں کے ساتھ شہر کا دورہ کیا تو شہر کی گلیوں اور بازاروں کو سنسان پایا حالانکہ اس وقت کوئی کرفیو آرڈر جاری نہیں ہوا تھا۔

۱۱ر اپریل کو شہریوں نے سول انتظامیہ کی اجازت سے ہلاک شدگان کی آخری رسومات ادا کیں جس کے لیے انہیں دوپہر دو بجے سے چار بجے تک کا وقت دیا گیا تھا، اسی روز صبح جالندھر سے بھی مزید فوجیں امرتسر پہنچ گئیں جن کی کمان بریگیڈیئر جنرل آر۔ ای۔ ایچ۔ ڈائر (Brig. Gen. Reginald Edward Harry Dyer) کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ڈائر نے میجر میکڈونلڈ سے چارج لے کر اپنا ہیڈ کوارٹر ریلوے اسٹیشن سے رام باغ منتقل کر دیا۔ رام باغ سے وہ مقامی آبادی کی سرگرمیوں کا زیادہ قریب سے جائزہ لے سکتا تھا۔ جنرل ڈائر نے امرتسر پہنچتے ہی ایک میٹنگ بلائی جس میں مقامی افسران، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈینٹ پولیس نے شرکت کی۔ جنرل ڈائر شہر میں ہونے والے واقعات بالخصوص مس شیر ووڈ کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ پر بہت برہم تھا، پولیس کی رپورٹ کے مطابق شہر مکمل طور پر باغیوں کے قبضے میں تھا اور پولیس اہل کار تھانوں میں محصور تھے یہ رپورٹ ملنے کے بعد کمشنر نے شہر کے انتظامات جنرل ڈائر کے حوالے کر دیئے اور اسے اختیار دیا کہ امن اور قانون کے بحالی کے لیے جو چاہے کریں، یعنی قانون اور آئین معطل ہو گئے۔ اس کے بعد جنرل ڈائر کی جانب سے کیے جانے والے اقدامات کسی قانون کے تحت نہیں بلکہ ایک شخص کی ذاتی انا کے تحت تھے جنرل ڈائر

نے شہریوں کا مورال توڑنے کے لیے امرتسر کے لیے بجلی اور پانی کی فراہمی منقطع کرادی۔

۱۲ر اپریل کو جنرل ڈائر کو اطلاع ملی کہ ایک ہجوم شہر کے باہر جمع ہو رہا ہے اس خبر کے بعد جنرل نے سپاہیوں کے ساتھ شہر کا گشت کیا، اس نے دیکھا کہ لوگ اسے دیکھ کر زمین پر تھوک رہے ہیں اور مختلف جگہوں پر انہیں دیکھ کر ہندو۔ مسلم کی جے کے نعرے لگائے گئے، جنرل نے بارہ افراد کو گرفتار بھی کرایا۔ جنرل ڈائر نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں واپس آ کر ایک اعلان جاری کیا جس کے تحت امرتسر کے رہائشیوں کو اطلاع دی گئی کہ اگر انہوں نے کسی املاک کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی یا امرتسر کے مضافات میں کسی قسم کا دنگا فساد کیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ کام امرتسر شہر کے اکسانے پر ہوا ہے اور اس کے مرتکبوں کو فوجی قانون کے مطابق سزا دی جائے گی۔ تمام جلسوں اور اجتماعات کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے اور انہیں فوجی قانون کے تحت فی الفور منتشر کیا جائے گا۔ لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس اعلان کی نشر و اشاعت کو یقینی بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے گئے۔[۶]

۱۲ر اپریل کو نا صرف امرتسر بلکہ پورے پنجاب میں سرکاری حکم ناموں کی خلاف ورزی کی گئی اور ہڑتالیں کی گئیں بعض شہروں میں ٹیلی گراف سسٹم اور ریلوے لائن کاٹ دی گئیں۔ ان دنوں امرتسر ایک فوجی کیمپ کی صورت اختیار کر گیا تھا، لالہ گردھاری لال، ڈپٹی چیرمین پنجاب چیمبرز آف کامرس، ۱۱ر اپریل کو امرتسر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ پولیس کی ٹولیاں ریلوے اسٹیشن کی حفاظت کر رہی ہیں، خود ریلوے اسٹیشن ایک آرمی کی چوکی لگ رہا تھا۔ نہ کوئی قلی تھا نہ کوئی سواری۔ انتہائی مشکلات کے بعد وہ پیدل چلنے والوں کے پل پر پہنچے وہاں موجود فوجی کسی کو بغیر تلاشی کے شہر میں داخل نہیں ہونے دے رہے تھے۔ شہر میں بھی ہر طرف فوج اور پولیس دکھائی دے رہی تھی۔[۷]

بارہ تاریخ کو ہی ہندو سبھا اسکول میں سو افراد کی میٹنگ ہوئی، جس میں ہنس راج، جو بعد میں سلطانی گواہ بنا، نے یہ اعلان کیا کہ اگلے روز جلیانوالہ باغ میں ایک جلسے کا انعقاد کیا جا رہا ہے جس کی صدارت امرتسر کے ایک معزز شخص لالہ کنہیالال کریں گے۔ بعد میں لالہ کنہیالال سے پوچھا گیا تو انہوں نے اس جلسے اور اس میں اپنی صدارت کے اعلان سے لاعلمی کا اظہار کیا۔[۸] ہنس راج نے ان کا نام صرف اس لیے استعمال کیا تا کہ لوگوں کی بڑی تعداد جلیانوالہ باغ میں جمع

ہو سکے۔

۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کو اتوار کا دن تھا اور پنجاب میں اس دن بیساکھی کا تہوار بھی منایا جا رہا تھا، یہ تہوار بہت جوش و خروش سے منایا جاتا ہے اور اس میں قرب و جوار کے کسان جمع ہو کر خوشیاں مناتے ہیں۔ سکھوں کے لیے یہ مزید اہمیت رکھتا ہے کہ کیونکہ اس دن خالصہ کا نفاذ ہوا تھا اور تمام سکھوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس دن دربار صاحب میں اپنی حاضری کو ممکن بنائیں۔ ۱۰، ۱۱ اور ۱۲/اپریل کے واقعات کے باوجود ۱۳/تاریخ کو امرتسر کے شہر میں دوسرے علاقوں سے آنے والوں کی ایک بڑی تعداد جمع تھی اور یہ لوگ تھکن اتارنے کی غرض سے باغ میں جمع تھے۔

۱۳/اپریل کو جنرل ڈائر اور دیگر افسران، جن میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی موجود تھے، شہر کے انیس مقامات پر گئے اور ڈھول کے ذریعے لوگوں کو اکٹھا کر کے اردو اور پنجابی میں اعلان کرایا 'ہر گاہ یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص جو اس شہر میں رہتا ہے اسے اجازت نہیں ہے کہ وہ اجازت نامہ کے بغیر اپنی یا کرائے کی سواری پر یا پیدل شہر کو چھوڑ کر جائے۔ امرتسر شہر میں رہائش پذیر کسی شخص کو اجازت نہیں کہ آٹھ بجے کے بعد اپنے گھر سے باہر نکلے۔ آٹھ بجے کے بعد اگر کسی کو گلی یا بازار میں دیکھا گیا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔ کسی قسم کا کوئی جلوس شہر کی گلیوں یا شہر کے کسی حصے یا اس کے باہر کسی وقت نکالنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایسے کسی جلوس یا چار آدمیوں کے اجتماع کو خلاف قانون سمجھا جائے گا اور اگر ضروری ہوا تو اسلحے کی طاقت سے منتشر کیا جائے گا'۔[9]

امرتسر شہر کی کل آبادی ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی اور بیساکھی کے تہوار کی وجہ سے دیگر علاقے کے لوگ بھی امرتسر آئے ہوئے تھے اس لیے انیس مقامات پر اعلان کرنا کافی نہیں تھا، اور اس میں بھی شہر کے اہم مقامات چھوڑ دیے گئے تھے۔

جنرل ڈائر کے اس اعلان کے کچھ دیر بعد ہی امرتسر کے بعض علاقوں میں چند افراد ٹین بجا کر اعلان کرتے نظر آئے جس کے مطابق برطانوی حکومت کا خاتمہ ہو گیا ہے، کسی کو جنرل کے اعلان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں اور شام کو جلیانوالہ باغ میں جلسہ عام ہے۔

بارہ بج کر چالیس منٹ پر جنرل کو اس جوابی دعویٰ (Counter Proclaimation) کی اطلاع ملی، جلسے کا وقت چار بجے تھا، یعنی تین گھنٹے بیس منٹ جنرل ڈائر کے پاس تھے جس میں وہ جلسے کو روکنے کے لیے بہت سے اقدامات کر سکتا تھا، وہ چاہتا تو شہر

میں دوبارہ منادی کرا سکتا تھا کہ کسی بھی قسم کے اجتماع پر پابندی ہے مگر جنرل کا کہنا ہے کہ شہر میں انتہائی سخت گرمی تھی اس لیے دوبارہ نکلنا مشکل تھا۔ وہ جلسہ گاہ کے داخلی راستوں پر اپنے حکم نامے چسپاں کرا سکتا تھا اور ان راستوں پر سپاہیوں کی ڈیوٹیاں لگا سکتا تھا جو لوگوں کو اندر جانے سے روکتے مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس تمام وقت میں اس نے صرف ایک ہی بات سوچی کہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی ہے اور اس کی سزا ہونی چاہیے اور ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد چار بجے اسے جب اس بات کی اطلاع ملی کہ لوگ جلیانوالہ باغ میں جمع ہو چکے ہیں وہ جلسہ گاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔

ہنٹر کمیٹی میں بھی جب اس سے پوچھا گیا کہ اس نے ایسے اقدام کیوں نہ اٹھائے جن کے ذریعے اس جلسے کو روکا جا سکتا تھا تو اس کے جواب میں جنرل ڈائر نے کہا کہ میں نے تمام وقت تیاریوں میں صرف کیا اور میرا خیال تھا کہ میں اعلان نامے کے ذریعے پوری کوشش کر چکا ہوں۔

جنرل ڈائر امرتسر آنے کے بعد سے ہی شہر کے باغیوں کو سزا دینا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں کوئی بھی فوری قدم اٹھانے پر راضی تھا، پر ایک سپاہی کی حیثیت سے وہ جانتا تھا کہ گلیوں اور محلوں میں اگر کوئی کارروائی کی گئی تو خود اسے نقصان ہو سکتا ہے۔ اس دوران جلیانوالہ باغ میں جلسے کی اطلاع میں جنرل ڈائر کو باغیوں کو سبق سکھانے کے خواب کی تعبیر نظر آئی۔

جلیانوالہ باغ کوئی باغ نہیں تھا۔ یہ زمین کا ایک ٹکڑا تھا جس کے چاروں طرف مکانات بنے ہوئے تھے۔ واقعہ کے وقت یہ ایک نجی جائداد تھی جو کئی افراد کی مشترکہ ملکیت تھی۔ داخلے کا اصل راستہ اتنا تنگ تھا کہ اس میں سے کوئی گاڑی نہیں گزر سکتی تھی۔ آنے جانے کا اور کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا، اصل داخلی راستے کے ساتھ زمین قدرے اونچی تھی اور اس جگہ سپاہیوں کو متعین کر کے ہجوم پر بہ خوبی فائر کرائے جا سکتے تھے۔

چار بجے جنرل ڈائر، کیپٹن برگز (Biggs) کے ہمراہ جلیانوالہ باغ کی جانب روانہ ہوا، ان کے ساتھ دو آرمرڈ کاریں بھی تھیں جن پر مشین گنیں نصب تھیں۔ Mr. Rehil پولیس کار میں تھے اور ان کے ساتھ Mr. Polmer موجود تھے اور ان کے آگے پیچھے پیدل سپاہی موجود تھے جن میں ۲۵ گورکھے اور ۲۵ سکھ رائفل بردار تھے مزید چالیس گورکھوں کے پاس تلواریں

موجود تھیں۔ جنرل ڈائر جب جلیانوالہ باغ کی طرف آرہا تھا تو ذہنی طور پر تیار تھا کہ اگر جلسے پر پابندی کے بارے میں واقعی خلاف ورزی ہوئی تو وہ فائر کھول دے گا۔ وہ اس انتباہ کو جو اس نے صبح کیا تھا فائرنگ کے جواز میں کافی سمجھتا تھا ایسے ہجوم پر جو اس کے احکام کی خلاف ورزی میں جمع ہوا تھا۔

جلیانوالہ باغ پہنچنے سے پہلے آمرڈ کاروں کو تنگ راستے کی وجہ سے پیچھے چھوڑنا پڑا۔ جنرل ڈائر جس وقت باغ میں پہنچا اس وقت درگا داس جو 'وقت' اخبار کے ایڈیٹر تھے، ایک نظم پڑھ رہے تھے اور ان سے پہلے چھ مقرر خطاب کر چکے تھے جو حکومت پنجاب کے مطابق دس اپریل کے ہنگاموں میں ملوث تھے۔

مجمع کی کل تعداد بیس ہزار کے قریب تھی، حاضرین میں ہر عمر کے لوگ موجود تھے کچھ افراد گود میں چھوٹے بچوں کو بھی لائے ہوئے تھے، ان کے پاس کوئی لاٹھیاں یا ڈنڈے نہیں تھے۔ جنرل ڈائر نے یہ گمان کیا کہ اگر یہ مجمع بپھر گیا تو صرف ہاتھوں سے بھی اس کا اور اس کی فوج کا حال برا کر سکتا ہے اس لیے اس نے کسی قسم کی تنبیہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور فوراً اپنے سپاہیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے فائر کا حکم دے دیا۔ مجمع میں ہڑبونگ مچی اور لوگ بھاگنے لگے، فائر اس وقت رکے جب اسلحہ ختم ہو گیا تھا، دس منٹ مسلسل فائرنگ ہوئی اور اس دوران کل ۱۶۵۰ راؤنڈز فائر ہوئے، یعنی ہر فوجی نے کل ۳۳ فائر کیے۔ جب فائرنگ رکی تو باغ کے اندر اور باہر لاشیں اور زخمی موجود تھے اور باغ کسی چھوٹے میدان جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا۔' اس فائرنگ میں ۳۷۹ افراد ہلاک ہوئے اور ۱۲۰۰ سے زیادہ زخمی، سوامی شردھانند کے مطابق ۱۵۰۰ افراد ہلاک ہوئے جب کہ مدن موہن مالویہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۱۰۰۰ تک بتاتے ہیں۔'[10] 'ان میں سے تقریباً ۱۸۷ اجنبی یا دیہاتی تھے جو امرتسر میں قریبی اضلاع سے آئے تھے۔'[11] جنرل ڈائر نے اس انتہائی قدم سے پہلے کسی سے مشورہ کرنے یا اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی خود ڈپٹی کمشنر مائیلز اروِنگ بھی جنرل ڈائر کے اس فیصلے سے لاعلم تھے۔

یہ ایک جرم تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں معصوم افراد کو قتل کیا گیا۔ کوئی قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا چاہے فوجی ہو یا شہری کہ بغیر انتباہ کے لوگوں پر فائرنگ کی جائے۔ مگر جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر نے کسی قسم کی بھی وارننگ نہیں دی۔ ہنٹر کمیٹی میں جب جنرل ڈائر سے اس

سلسلے میں پوچھا گیا تو اس کا جواب تھا کہ وارننگ کے ذریعے یہ لوگ کچھ وقت کے لیے بکھر جاتے مگر پھر جمع ہو کر اس کا مذاق اُڑاتے۔ ہنٹر کمیٹی ہی میں اس سے پوچھا گیا کہ اگر وہ آرمرڈ کاریں اندر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا تو کیا مشین گنوں کا استعمال کرتا؟ اس سلسلے میں ڈائر کا جواب تھا کہ وہ یقیناً انہیں استعمال کرتا۔[۱۲] اس نے زخمیوں کو بھی کوئی امداد دینے یا ہسپتال لیجانے کے سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی، ایسا کرنا اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا۔ اگر اس سلسلے میں کوئی کام کر لیا جاتا تو ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کی جانیں بچ جاتیں۔ فائرنگ کے دوران اس نے وقفے وقفے سے اہداف کا جائزہ لیا اور ان اطراف میں فائر کرنے کی ہدایت دی جہاں ہجوم زیادہ گنجان تھا، اور یہ اس نے اس لیے نہیں کیا کہ لوگ جلدی جگہ چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آ رہے تھے بلکہ اس نے اپنے ذہن میں یہ بات ٹھان لی تھی کہ وہ انہیں یہاں جمع ہونے کی سزا دے گا۔ جنرل ڈائر کا کہنا تھا کہ میرے نزدیک فرانس کا میدان جنگ اور امرتسر بالکل یکساں تھے۔ اگر اس طرح کے خیالات ایک مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ذہن میں ہوں تو ناممکن ہے کہ جلیانوالہ باغ جیسے واقعہ کے موقع پر انصاف کا مظاہرہ ہو سکے۔ جنرل ڈائر کا خود کہنا ہے کہ اس نے اپنا فرض ادا کیا، اس طرح کی فائرنگ کے ذریعے وہ پورے پنجاب میں اخلاقی اثر پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس کے ذریعے پنجاب بھر میں باغیوں کا مورال توڑنا چاہتا تھا۔[۱۳]

۱۴ اپریل کو ہلاک ہونے والوں کی آخری رسومات کی اجازت ملی، اسی دن کمشنر نے ایک میٹنگ بلائی جس میں میونسپل کمشنر، مجسٹریٹ اور تاجر موجود تھے کمشنر نے کہا 'تم لوگ امن چاہتے ہو یا جنگ۔ ہم ہر طرح تیار ہیں۔ حکومت بہت طاقت ور ہے۔ سرکار نے جرمنی فتح کر لیا ہے اور وہ جو چاہے کر سکتی ہے۔ جنرل کو آج حکم نامہ جاری ہو گیا ہے اور شہر اس کے حوالے ہے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تم لوگ احکامات کی پابندی کرو'۔[۱۴] اس کے بعد جنرل ڈائر، مائیلز ارونگ، Mr. Rahil، Mr. Polmer اور دیگر فوجی داخل ہوئے جنرل نے انتہائی غصے کے عالم میں اردو میں تقریر کی جس میں واضح طور پر کہا گیا کہ خود دکانیں اور کاروبار کھولو ورنہ طاقت استعمال کی جائیگی، اپنی تقریر کے آخر میں اس نے کہا کہ 'تم لوگوں نے انگریزوں کو قتل کر کے انتہائی برا اقدام کیا ہے اس کا بدلہ تم لوگوں اور تمہاری اولاد سے لیا جائے گا'۔[۱۵]

اگلے روز یعنی ۱۵ اپریل کو تمام بازار کھل گئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب سول حکومت

کام کرے گی، لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ۱۹/اپریل ۱۹۱۹ء کو جنرل Beynon نے مارشل لاء کے نفاذ کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ یہ مارشل لاء ۹ جون ۱۹۱۹ء تک رہا اور اس دوران عوام کی زندگی کو مختلف طریقوں سے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ جس گلی میں Ms. Sherwood کو پیٹا گیا تھا وہاں تازیانے لگانے کے لیے ٹکٹکی لگائی گئی اور اس گلی سے گزرنے والوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ کہنیوں اور گھٹنوں کے بل اس گلی کو عبور کریں۔ تمام افراد پر لازم تھا کہ نہ صرف انگریز افسران بلکہ عام انگریز شہریوں کو بھی کھڑے ہو کر سلام کریں۔ شہر کے تمام وکلاء کو تذلیل کی خاطر اسپیشل کانسٹیبل بنا دیا گیا اور ان سے عام قلیوں کا کام کرایا گیا۔ لوگوں کو بلا امتیاز اور بغیر کسی الزام کے گرفتار کیا جانے لگا اور ان کی معاشرتی حیثیت سے قطع نظر حراست کے دوران طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں اور انہیں رشتہ داروں اور عزیزوں سے ملاقات کی اجازت بھی نہیں تھی، ساتھ ہی تشدد کے ذریعے جھوٹی گواہیوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ لاہور میں سائیکل رکھنا بھی مارشل لاء قوانین کے خلاف قرار پایا۔ Bengal State Offences Regulation 1804 کے سیکشن II کے تحت گورنر جنرل ان کاؤنسلز نے ایسے تمام ڈسٹرکٹس میں جہاں حکومت کی رٹ کو چیلنج کیا گیا تھا، عام کریمنل کورٹس معطل کر دیں اور ان کی جگہ فوجی عدالتوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ جنہوں نے قانون کے نام پر شدید بے انصافیاں کیں اور بے گناہ ملزموں کو اپیل کا حق بھی نہیں دیا گیا۔

جلیانوالہ باغ کے واقعہ کی تحقیقات کے لیے دو کمیٹیاں بنائی گئیں، ایک سرکاری کمیٹی جسے وائسرائے اور گورنر جنرل نے وزیر ہند کی توثیق کے بعد ۱۴/اکتوبر ۱۹۱۹ء کو قائم کیا جس کے صدر لارڈ ولیم ہنٹر تھے۔[16] جنرل ڈائر نے اپنی مفصل رپورٹ ۲۵ اگست ۱۹۱۹ء کو جنرل اسٹاف ۱۶ ڈویژن کو بھیج دی تھی، ۱۹/نومبر کو جنرل ڈائر، ہنٹر کمیٹی کے روبرو پیش ہوا۔[17] دوسری کمیٹی کانگریس نے تشکیل دی اس کا قیام ۱۴/نومبر ۱۹۱۹ء کو عمل میں آیا۔ لارڈ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۱۳/اپریل کو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر مائیکل اوڈوائر نے جنرل آفیسر کمانڈنگ ۱۶ ڈویژن اور چیف جسٹس ہائیکورٹ کے مشورے سے گورنر جنرل ان کاؤنسلز سے درخواست کی کہ اسے مجاز قرار دیا جائے کہ امرتسر اور لاہور کے اضلاع میں عام فوجداری عدالتوں کی کارکردگی کو معطل کر دیا جائے، ان کے بجائے یہاں مارشل لاء نافذ کیا جائے تاکہ ملزمان کے مقدمات کی سماعت بنگال ریگولیشن ۱۸۰۴ء کے تحت کریں۔ اگلے روز حکم نامہ ملنے پر ۱۵/اپریل کو لاہور اور امرتسر اور پھر پنجاب کے

مختلف شہروں میں مارشل لاء کا نفاذ کیا گیا۔

پنجاب میں مارشل لاء کے نفاذ کی توثیق کے جواز میں ۱۰ر اپریل کے واقعات کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ جس میں چند یورپین ہلاک ہوئے اور چند عمارتوں کو جلایا گیا لیکن اس بات پر کسی نے غور نہیں کیا کہ ہجوم کو اشتعال کس بات پر اور کیوں آیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ مارشل لاء کے نفاذ کے لیے کسی کھلی بغاوت کا ہونا ضروری ہے، اگر ۱۰ر اپریل کے واقعات کو کھلی بغاوت میں شمار کیا جائے تو اس سے پہلے احمد آباد میں کچھ انگریز مارے گئے تھے۔ دہلی، بمبئی اور چند دوسرے مقامات پر بھی تخریبی کارروائیاں ہوئی تھیں، وہاں مارشل لاء کیوں نہیں لگایا گیا؟

کھلی بغاوت کے لیے آتشیں اسلحہ ہونا ضروری ہے اور کوئی سازش بھی ضرور ہونی چاہیے، مگر امرتسر میں ۱۰ر اپریل کو ایسا کچھ نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ چند لوگوں کی ہلاکت کے بعد جب یہ ہجوم واپس پلٹا تو اس نے کسی اسلحہ کی دکان کو نہیں لوٹا اور نہ ہی اس کے پیچھے کسی سازش کا کوئی ثبوت مل سکا۔ اگر سیاسی بے چینی کو سازش قرار دیا جائے تو سیاسی بے چینی تو پورے ہندوستان میں تھی پھر سارے ہندوستان میں مارشل لاء لگانا چاہیے تھا۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ جدید تعلیم اور مواصلاتی سہولتوں کی بدولت پنجاب میں سیاسی شعور کی بیداری سے حکومتِ پنجاب پریشان تھی اور ان کو کچلنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھی جو جلیانوالہ باغ کی صورت میں انہیں ملا۔

امرتسر کے ہنگامے، جلیانوالہ باغ کا قتل عام، مارشل لاء کا نفاذ اور اس کے تحت سزائیں، پنجاب بھر میں نہتے افراد پر فائرنگ، پیٹ کے بل رینگنے کے حکم سے تازیانوں کی سزائیں اور فوجی عدالتوں کے ذریعے دی جانے والی سزاؤں سے انصاف کی دھجیاں اڑائی گئیں۔

جہاں تک جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے مرتکب مرکزی کرداروں کا تعلق ہے ان میں بریگیڈیئر جنرل ڈائر کو انتظامی حکمران مائیکل اوڈوائر اور ان کے ماتحتوں نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ اعلیٰ اور فوجی حکام ڈائر کو داد دیتے رہے مگر جب تحقیقات کے بعد نتائج سامنے آئے تو انہی حکام نے جنرل ڈائر کو قربانی کا بکرا بنا دیا۔ جنرل ڈائر کو پینشن دے کر ملازمت سے فارغ کر دیا گیا، اس کے حصے میں مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں آیا۔ جلیانوالہ باغ کے واقعہ کے ڈھائی سال بعد نومبر ۱۹۲۱ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا اور چند سال ایک مفلوج شخص کے طور پر گزار کر ۲۳ جولائی ۱۹۲۷ء کو انتقال کر گیا۔

پنجاب میں ہونے والے مظالم کا مرکزی کردار مائیکل اوڈوائر تھا جس کے جرم میں لارڈ چیمسفورڈ برابر کا شریک تھا کیونکہ وہ ان تمام باتوں سے واقف تھا مگر اس جرم کی پردہ پوشی کررہا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا قتل عام بھی اسی کے ایما پر ہوا اور پنجاب میں مارشل لاء لگا کر اہل پنجاب کے حوصلے پست کرنے کی تدبیر بھی اسی کی تھی۔ ہندو۔ مسلم کی تفریق اس کے نزدیک استعمار کی سربلندی کے لیے ضروری تھی۔ اخبارات، سیاسی اجتماعات اور جلسوں پر پابندیاں عائد تھیں، فوجی بھرتی رضا کارانہ ہوتی ہے مگر پنجاب میں اس میں جبر کا عنصر غالب تھا ان حالات میں پنجاب جو حکومتِ برطانیہ کا بازوئے شمشیر زن تھا، کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ پنجاب کی سیاسی بے داری کو اوڈوائر نے اپنے استبدادی نظام پر حملہ تصور کیا اور اسے کچلنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔

پنجاب کا یہ حکمران اور جلیانوالہ باغ کا مجرم حکومت کی مصلحت کی بدولت تو سزا سے بچ گیا مگر قدرت کے ہاتھوں سے نہ بچ سکا۔ ادھم سنگھ نامی ایک پندرہ سالہ لڑکا جلیانوالہ باغ میں لوگوں کو پانی پلانے کی ڈیوٹی پر معمور تھا، اس جلسے پر ہونے والی فائرنگ میں وہ زخمی ہوا اور اس نے قاتلوں سے انتقام لینے کا عہد کیا۔ بارہ یا تیرہ مارچ ۱۹۴۰ء کو اسے یہ عہد پورا کرنے کا موقع ملا۔ اس روز کاکسٹن ہال Caxton Hall لندن میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن (East India Association) اور رائل سینٹرل ایشین سوسائٹی (Royal Central Asian Society) کے زیر اہتمام جلسہ تھا، مائیکل اوڈوائر جلسے سے خطاب کے بعد ڈائس سے اترا اور ادھم سنگھ کے ریوالور کی گولیاں اس کی پشت پر لگیں اور اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ گرفتاری کے بعد ادھم سنگھ نے اپنا نام محمد سنگھ آزاد بتایا اور اس نے بیان دیا کہ مائیکل اوڈوائر اسی قابل تھا، ادھم سنگھ کا کہنا تھا کہ میں نے اکیس سال اسی دن کے انتظار میں گزارے ہیں اور مجھے اس قتل پر کسی قسم کا کوئی افسوس نہیں ہے، ادھم سنگھ کو ۳۱ جولائی ۱۹۴۰ء کو پھانسی دی گئی۔

حوالا جات

۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام اور مظالم پنجاب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴، صفحہ۔۸

۲۔ سید نور احمد، مارشل لاء سے مارشل لاء تک، دارالکتاب، لاہور، صفحہ۔۱۲

3. For details see H.N. Mitra and N.N. Mitra (eds.), *The Indian Annaul Register*, Gian Publishing House, Delhi, 1988, pp. 124-28.

۴۔ سید نور احمد، بحوالہ سابقہ، صفحہ۔۱۳

۵۔ ایضاً، صفحہ۔۱۴

۶۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، بحوالہ سابقہ، صفحہ۔۱۳۹

7. Dr. Sangh Mittra, *Indian Mutiny to Jallianwala Bagh Tragedy, 1857-1919*, Commonwealth Publishers, New Delhi, 2003, p.357.

۸۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، بحوالہ سابقہ، صفحہ۔۱۸۷

9. Dr. Sangh Mittra, *op.cit.*, p.358.

10. *Ibid.*, p.361.

۱۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، بحوالہ سابقہ، صفحہ۔۱۴۲

۱۲۔ ایضاً، صفحہ۔۱۵۶

۱۳۔ ایضاً، صفحہ۔۱۵۷

14. Mittra, *op.cit.*, p.367.

15. *Ibid.*, p.368.

۱۶۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، بحوالہ سابقہ، صفحہ۔۱۱۷

۱۷۔ ایضاً، صفحہ ۲۰۳

صبحِ بے نور

ایوب خان کا آمرانہ دور (1958-1968)

روبینہ سہگل

''میرے عزیز ہم وطنو! اسلام وعلیکم!

آج میں آپ سے بے حد سنجیدہ اور گھمبیر معاملات پر مخاطب ہوں۔ یہ بہت اہم ہے کہ آپ غور سے ان باتوں کو سنیں اور سمجھیں تا کہ آپ کا طرزِ عمل تعمیری ہو۔ ہماری اور آئندہ نسلوں کی بقا صحیح عمل کرنے میں ہے۔

آپ سن چکے ہوں گے کہ صدر نے آئین کو معطل کر دیا ہے اور پورے پاکستان میں مارشل لاء کا نفاذ کر دیا ہے۔ صدر نے مجھے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا ہے، اور مسلح افواج کو، جن میں سول مسلح افواج بھی شامل ہیں، میرے ماتحت کر دیا ہے۔ یہ شدید اور سخت قدم بادلِ نخواستہ لیا گیا ہے۔ لیکن اس یقین کے ساتھ لیا گیا ہے کہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ملک شدید خطرات سے لاحق تھا اور انتشار کا نشانہ بن جاتا اور ٹوٹ بھی سکتا تھا۔ اگر ہم ان حالات کا خاتمہ نہ کرتے اور بدستور یہ صورتحال قائم رہتی تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہ کرتی۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ انتشار اور بدامنی کے یہ حالات ان افراد کے اعمال کا نتیجہ تھے جو خود کو سیاستدان کہتے ہیں مگر مکمل طور پر مفاد پرست لوگ ہیں۔ انہوں نے ذاتی مفادات کی خاطر ملک کا سودا کر دیا اور تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا۔ ان میں سے کچھ نے تو اپنا حق سمجھا کہ وہ جو چاہیں کریں کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے پاکستان بنایا، اور کچھ ایسے ہیں جو قیام پاکستان کے تصور ہی کے خلاف تھے اور اس کو ختم کر ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کے مقاصد میں صرف طاقت کی بھوک اور خود کو آگے بڑھانا شامل ہیں۔

کمزور اور عزم سے محروم حکومتیں اس منظر کو بزدلی اور نااہلی کی بنا پر کچھ کیے بغیر دیکھتی رہی ہیں۔ انہوں نے نظم ونسق اور ضبط کے پرخچے اُڑا دیئے۔

قائداعظم اور لیاقت علی خان کی وفات کے بعد سیاستدانوں نے ایک دوسرے کے خلاف کھلم کھلا لڑائی جھگڑا شروع کر دیا اور ہر قسم کے حربے استعمال کیے۔ ان مسلسل اور شدید لڑائیوں کا ملک پر بہت برا اثر ہوا۔ یہ لوگ صرف اپنی ذاتی بھوک اور گندے عزائم پورے کرنا چاہتے تھے۔ ان کی اخلاقی پستی، جھوٹ اور دھوکہ دہی کی کوئی حد نہیں ہے۔ تعمیری سوچ کے فقدان کی بناء پر انہوں نے صوبائی اور لسانی جذبات کو اُبھارا اور فرقہ پرستی، مذہبی اور نسلی امتیاز کے ذریعے ایک پاکستانی کو دوسرے پاکستانی سے لڑا دیا۔ انہیں کسی اور میں کوئی اچھائی نظر نہیں آتی تھی، صرف اپنا ذاتی مفاد عزیز تھا۔ طاقت حاصل کرنے کے نشے میں انہوں نے پرواہ نہیں کی کہ ملک اور عوام تباہی کی نذر ہو جائیں۔

ان میں سے چند کے علاوہ ان کا ضمیر مر چکا تھا اور آئے دن اپنی پارٹی بدلتے رہتے تھے۔ کوئی بھی ایسا شخص جس کا ضمیر زندہ ہو اپنا مذہب اور اپنی پارٹی نہیں بدل سکتا۔ لیکن ہمارے ان نام نہاد نمائندوں نے بارہا

بلا تامل اپنی پارٹیاں بدل لیں اور ان کے ضمیر نے ملامت نہ کی۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر پاکستان میں جمہوریت چلتی رہی ہے۔ اس عمل کے دوران اعلیٰ سوچ اور عظیم مذہبی اور ثقافتی اقدار کو پامال کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک مکمل طور پر انتظامی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی بحران سے دوچار ہو گیا۔ آج کل کے خطرناک حالات میں یہ سب کچھ برداشت کرنا ممکن نہیں تھا۔ پاکستان اس عیش وعشرت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس کے اندرونی مسائل اس قدر زیادہ ہیں کہ یہ بیرونی خطرات کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ملک جن مشکلات سے دوچار ہے ان کا واحد حل ایک محفوظ اور مستحکم بنیاد کے رکھنے میں ہے،

ہمارے لوگ فطری طور پر حب الوطن اور اچھے ہیں۔ ان میں برداشت اور عمل ہے اور اگر انہیں اچھی قیادت ملے تو یہ عظمت کی انتہا کو پہنچ سکتے ہیں۔ ہمارے لوگ ذہین ہیں اور بخوبی جانتے ہیں کہ ان کی نظروں کے سامنے کیا ہو رہا ہے۔ لوگ معاملات کو مزید بگاڑنا نہیں چاہتے تھے یا شاید پھر وہ فوج کے جذبات مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بالآخر فوج وہ ادارہ ہے جو قانون اور نظم ونسق کا ذمہ دار ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ فوج نے بے حد وفاداری اور صدقِ دل سے ان کی خدمت کی ہے۔ لیکن مجھے نظر آنے لگ گیا تھا کہ لوگوں کا فوج پر سے بھی اعتبار اٹھنے لگا تھا کیونکہ وہ محسوس کر رہے تھے کہ ہم بھی انہیں اس ظلم اور ذہنی اور روحانی اذیت سے نجات نہیں دلا رہے۔ مجھے یقین ہے کہ عوام ان بے اصول سیاستدانوں سے تنگ آ چکے ہیں اور چھٹکارا چاہتے ہیں۔ فوج کو بھی اس صورتحال کا ادراک تھا۔ مگر وہ تحمل کے ساتھ ان حالات کا جائزہ لے رہی تھی جس کی کچھ اہم وجوہات ہیں۔

اب وقت آ گیا ہے کہ اپنے عزیز ہم وطنوں کو اعتماد میں لوں اور فوج کے رویے اور اعمال کے بارے میں بتاؤں۔ قیامِ پاکستان کے وقت

سے ہی ہماری مسلح افواج کو ملک کے اندرونی مسائل کا احساس تھا۔ اور بیرون ملک سے آنے والے خطرات کا ادراک بھی تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہمارے وسائل محدود ہیں۔ لیکن ہم نے یہ عزم کیا کہ ہم ایک قومی فوج کی تعمیر کریں گے جو کہ سیاست سے علیحدہ ہو، صدقِ دل سے اپنے فرائض سرانجام دے اپنی عزت اور اپنے وقار کا خیال رکھے اور لوگوں کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو۔ ایک ایسی فوج جو ملک کا موثر دفاع کر سکے۔

میں فوج کو ہمیشہ کہتا رہا کہ ہمارا بنیادی کام یہ ہے کہ ہم سرحدوں کی حفاظت کریں تا کہ اس حفاظت کے سائے میں ایک مضبوط جمہوری نظام کی بنیاد رکھی جا سکے اور ایک مستحکم اور روشن مستقبل کی جانب قدم رکھا جا سکے۔ لہٰذا ہم سیاست سے بالکل دور رہے۔

شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ میں نے بارہا جناب غلام محمد مرحوم کی اس پیشکش کو مسترد کیا کہ میں ملک کی باگ ڈور سنبھال لوں۔ یہ میں نے اس لیے کیا کہ مجھے یقین تھا کہ میں پاکستان کی خدمت بہتر طور پر اسی انداز میں کر سکتا ہوں جس میں کرتا رہا۔ ایک ہلکی سی اُمید یہ بھی تھی کہ سیاستدان موقع کی نزاکت کو پہچان لیں گے اور پاکستان کو بہتر مستقبل کی جانب گامزن کریں گے۔ لیکن حالات نے میری اس اُمید کو غلط ثابت کیا اور آج ہم اس ڈگر پر کھڑے ہیں۔ ایک اچھا بھلا ملک مذاق بن چکا ہے۔ یہ ایک افسوسناک بات ہے۔ تاہم صورتحال کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور حل نکالنا ہوگا۔ انشاءاللہ ایسا ضرور ہوگا۔

میں بہت صاف اور واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا نصب العین بالآخر جمہوریت کی بحالی ہے۔ لیکن ایک ایسی جمہوریت جسے لوگ سمجھ پائیں اور جو کامیاب ہو سکے۔ جب وقت آئے گا تو آپ کی آزادانہ رائے معلوم کی جائے گی لیکن ایسا کب ہوگا، اس کا تعین صرف حالات ہی کر سکتے ہیں۔ فی الحال ہمیں ان خرابیوں کو دور کرنا ہے تا کہ اس

ملک کی کشتی بھنور سے نکل سکے اور آگے بڑھ سکے۔

چند مسائل کا فوری حل ضروری ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کا حل وقت طلب ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ تمام مسائل کا حل نکالا جائے اور ملک کو تمام لڑائیوں سے پاک کیا جائے لیکن اس کام میں ہمیں آپ کی مکمل حمایت، تعاون اور تحمل درکار ہوں گے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ محنت کریں گے کیونکہ صرف محنت سے ریاست کی تعمیر ہوتی ہے۔ نعرہ بازی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ صرف محنت و مشقت سے کام چلے گا۔ جو کچھ ہماری طاقت میں ہوگا وہ ہم ضرور کریں گے، لیکن چند ایسے حل ہیں جو ہمارے قابو میں نہیں ہیں۔ ان کے لیے ہم پوری کوشش کر سکتے ہیں اور نتائج کو خدا پر چھوڑتے ہیں۔ جب آپ ہماری کارکردگی کا فیصلہ کریں تو ان تلخ حقائق کو ملحوظ خاطر رکھیں۔

مارشل لاء کے نفاذ کی خاطر میں سول اداروں کو بروئے کار لاؤں گا۔ مسلح افواج کا استعمال کم سے کم کیا جائے گا۔ ان کی توجہ سرحدوں کی حفاظت پر مرکوز رہے گی۔

اس قسم کے مارشل لاء کے ضابطے بنائے جائیں گے جو موجودہ قوانین کو مؤثر بنا سکیں اور افسران کی کاہلی اور بے اثری کو دور کر سکیں اور ہر قسم کی رشوت خوری، بدعنوانی، ذخیرہ اندوزی اور سمگلنگ اور چور بازاری کو ختم کر سکیں۔ یہ ایسے ضابطے ہوں گے کہ ہر قسم کی سرگرمیاں جو سماج، معاشرے اور ریاست کے خلاف ہوں ان کا تدارک کیا جا سکے۔ تمام ایسی کارروائیوں کے ساتھ سختی سے نمٹا جائے گا بدکردار افراد کے کالے دھندوں کو سختی سے روکا جائے گا تاکہ پاکستان قانون کی پابندی کرنے والے شہریوں کے لیے محفوظ جگہ بن سکے۔

چونکہ مارشل لاء کا انتظام عمومی طور پر سویلین اداروں کے ہاتھ میں ہوگا میں ان سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس ناخوشگوار کام کو دیانتداری،

انصاف اور ایمانداری سے سرانجام دیں۔ یہ موقع ہے کہ آپ اپنی کارکردگی دکھائیں۔ جایئے اور دکھایئے کہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔ آپ کی خدمات کی بہت اعلیٰ روایات ہیں۔ ان روایات کو ایک دفعہ پھر زندہ کر دکھایئے تاکہ آپ کو مسلح افواج کی بھرپور حمایت حاصل ہو۔ اس نازک موقع پر یہ امر اور بھی اہم ہے کہ ہماری مسلح افواج سرحد پار خطرات کے لیے پوری طرح چاک و چوبند ہوں۔ انہیں معلوم ہے کہ اگر انہیں بیرونی خطرات اور جارحیت کا مقابلہ کرنا ہے تو اندرون ملک استحکام کا ہونا لازمی ہوگا۔

مسلح افواج کے چند افراد کو مارشل لاء کے فرائض سرانجام دینے کو کہا جائے گا۔ جو بھی یہ فرائض ہوں میں امید کرتا ہوں کہ انہیں بلا تامل، وفاداری اور پھرتی سے نبھایا جائے گا۔ انہیں یہ کام نظم وضبط، غیر جانبداری اور صحیح طریقے سے کرنا چاہیے۔ خواہ کوئی بھی مشکل ہو مجھے ان کی قابلیت اور حوصلے پر پورا اعتماد ہے۔

میں چند الفاظ موقع پرستوں، سمگلروں، چور بازاروں اور تخریب کاروں کے بارے میں کہنا چاہوں گا۔ یہ عناصر سماجی جراثیم ہیں۔ ہماری فوج کے سپاہی اور عوام ان سے سخت تنگ آ چکے ہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ایسے لوگ اپنے تیور بدل لیں اور صحیح روش پر چلیں ورنہ ان سے سختی سے نمٹا جائے گا۔ ہم ان کے اعمال سے بخوبی واقف ہیں۔

میرے عزیز ہم وطنو! میں نے آپ کے ساتھ ایک طویل گفتگو کی ہے تاکہ آپ کو پوری طرح صورتحال سے آگاہ کیا جا سکے، تمام وسوسوں اور شکوک کو دور کیا جا سکے اور آپ کو بتایا جا سکے کہ یہ شدید قدم کیوں اٹھانا پڑا۔ یہ قدم آپ کے اور ملکی استحکام کے مفاد میں اُٹھایا گیا۔ آیئے اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ایک اچھے مستقبل کی جانب گامزن کرے اور ہم امتحان کی اس گھڑی سے ایک مستحکم اور مضبوط قوم بن کر اُبھریں۔ آمین! پاکستان پائندہ باد!

مندرجہ بالا تقریر جنرل ایوب خان نے 8 اکتوبر 1958ء کو ریڈیو پاکستان کراچی سے کی اور پاکستان کی تاریخ کا پہلا اور طویل مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ ایوب خان کی اس تقریر میں ہمیں اس دور کی سوچ کے تمام بنیادی پہلو ملتے ہیں۔ ان پہلوؤں کو بعد ازاں بار ہا دہرایا گیا اور ایوب کے بعد آنے والے آمروں نے اسی سے ملتی جلتی تقاریر کے ذریعے آمرانہ ادوار کا آغاز کیا۔

اس تقریر کے کلیدی نکات یہ ہیں: پاکستان کی بقا خطرے میں ہے۔ پاکستان اندرونی و بیرونی خطرات سے دوچار ہے۔ لیکن اس کے باوجود خود غرض اور مفاد پرست سیاستدانوں کو کوئی پرواہ نہیں ہے۔ وہ ملک کو دونوں ہاتھوں سے، بے دردی سے لوٹ رہے ہیں اور قیمتی وقت لڑائی جھگڑوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ پاکستان کی مسلح افواج، جو کہ ملک کی صحیح وفادار ہے، کچھ دیر تک تو یہ تماشہ تحمل سے دیکھتی رہی لیکن بالآخر یہ ملک کو تباہ ہوتے نہ دیکھ سکی اور ہمیں یہ سخت قدم لینا پڑا اور نام نہاد جمہوری نظام کو ختم کر کے مارشل لاء کا نفاذ کرنا پڑا۔ ہم نے یہ قدم بادل نخواستہ اٹھایا کیونکہ ہم صدقِ دل سے چاہتے تھے کہ یہ نظام چلے مگر ہم مایوس ہو کر حکومت کو برطرف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سیاستدانوں میں نہ تو کوئی نظم وضبط ہے، نہ ملک سے کوئی لگاؤ۔ انہیں صرف اقتدار کی بھوک ہے اور یہ اخلاقی طور پر پست ہیں اور ذاتی مفاد کے لالچ میں اندھے ہیں۔ نتیجتاً ملک انتشار، بدامنی، بدعنوانی اور بیرونی خطرات سے دوچار ہو گیا۔ لوگ بے کس ہو گئے اور ملک کا پورا نظام درہم برہم ہو گیا۔ لوگوں کا فوج پر بھی اعتبار اٹھنے لگا اور انہیں لگا کہ فوج بھی ان کے دفاع کو نہیں آئے گی۔ صرف فوج ہی لوگوں کو ظلم وستم اور روحانی اذیت سے بچا سکتی ہے۔ لوگ سیاستدانوں سے تنگ آ چکے ہیں، لہٰذا فوج کو اپنا فرض نبھانا پڑا۔ فوج ملک کو استحکام سے ہمکنار کرے گی اور ہم ایک ایسی جمہوریت لے کر آئیں گے جو لوگ سمجھ سکتے ہوں اور جو لوگوں کے لیے کارآمد ثابت ہو۔ چنانچہ اس قدم میں لوگ فوج کا ساتھ دیں۔ بنیادی کام سول ایجنسیاں کریں گی اور صرف چند مخصوص کام فوج کے اہلکار کریں گے۔ عوام فوج کے اس قدم کا ساتھ دیں، حمایت کریں اور ملک استحکام اور مضبوطی کی جانب بڑھے گا اور تخریب کاروں کو سخت سزا دی جائے گی۔

پاکستان کے عوام پچاس سال کے بعد بھی ایسے ہی الفاظ سننے کے عادی ہیں اور ان الفاظ سے بے حد مانوس ہو چکے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہی تقریر 1977ء میں جنرل ضیاء الحق اور پھر 1999ء میں جنرل مشرف نے کی۔ بنیادی نکات یہی تھے۔ الفاظ کا ردوبدل ضرور ہو سکتا

ہے۔ مگر ایوب خان کے الفاظ کی بازگشت کئی دہائیوں تک ملک کے چپے چپے میں سنائی دی۔ ایسا لگتا ہے کہ کچھ بدلا ہی نہیں۔ گویا 1958ء سے 2008ء تک تاریخ منجمد ہوگئی ہو، وقت رُک گیا ہو اور ڈرامے کا سین نہ بدلا ہو، صرف کرداروں کے چہرے بدلتے رہے ہوں۔

ایوب خان کے جن تصورات کا تسلسل ہمیں آج بھی نظر آتا ہے، ان میں چند بہت اہم ہیں لہٰذا تبصرہ طلب ہیں۔ ان قابل ذکر سیاسی تصورات میں جو نمایاں ہیں وہ حقیقی جمہوریت کا تصور، سیاستدانوں کی مکاری، عیاری، نااہلی اور نالائقی کا تصور، خزانہ خالی ہونے کا تصور، بیرونی اور اندرونی خطرات اور دشمن کا تصور، فوج کا بطور ایک بہترین ادارہ ہونے کا تصور، ایک واحد ادارہ جو ملک کو مصائب سے نکال سکتا ہو، ملک کی بقاء خطرے میں ہونے کا تصور اور خاموش انقلاب کا تصور۔ بہت سے اور بھی تصورات ہیں جو ہر آمر نے استعمال کئے مگر ان میں سے یہ چند متواتر بروئے کار لائے گئے۔ ایوب خان کے دور کے چند اقدامات اور واقعات جنرل مشرف کے دور سے بے حد مشابہت رکھتے ہیں۔ ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرنا ضروری ہے۔ ان میں شامل ہیں حقیقی جمہوریت، آزاد عدلیہ، خاموش انقلاب، معیشت کی بحالی، بیرونی خطرات کا تواتر کے ساتھ ذکر اور جنگجوئی۔

حقیقی جمہوریت

ایوب خان نے اپنے دور میں جمہوریت کا ایک منفرد تصور پیش کیا۔ یہ تصور جمہوریت کے روایتی خدوخال کے برعکس تھا۔ ایوب خان کو معلوم تھا کہ وہ غیر جمہوری طریقے سے آئے تھے لہٰذا انہیں اپنے اقدامات کو جمہوریت کی زبان میں ڈھال کر ان کے لیے جواز فراہم کرنا ضروری تھا۔ اپنے نئے نظام کو فروغ دینے سے قبل انہیں یہ ثابت کرنا تھا کہ جس نظام کا انہوں نے خاتمہ کیا تھا وہ ملک کو تباہی کی جانب لے جا رہا تھا۔ انہیں لوگوں کو قائل کرنا تھا کہ جو کچھ انہوں نے اکتوبر 1958ء میں کیا تھا وہ بالکل درست اور ناگزیر تھا۔

پرانے نظام کو ناکام اور ناکارہ ثابت کرنے کی غرض سے ایوب خان نے نت نئے ہتھکنڈے ایجاد کئے۔ ان میں سرفہرست یہ تھا کہ لوگوں کو سیاست دانوں اور سیاست کے عمل سے بدگمان کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے سیاست دانوں پر پے در پے حملوں کا آغاز کیا۔ وہ کئی برس تک

اپنی مختلف تقریروں میں سیاست دانوں کو برا بھلا کہتے رہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ سیاستدان نااہل، بے ایمان، خودغرض اور نالائق ہیں اور انہوں نے معیشت کو تباہ کر دیا ہے اور ملک کو شدید بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر 6 مارچ 1959ء ایک عام جلسے سے خطاب کے دوران انہوں نے کہا:

> ایک طرف قوم اور خلقِ خدا کی خدمت سے سرشار ہماری مسلح افواج نے گیارہ برس دن رات ایک کر کے خود کو دنیا کی بہترین افواج میں شامل کر لیا، اور اپنی بہادری اور حب الوطنی سے دنیا کی قوموں میں مُلک کی عزت و ناموس بڑھائی، وہاں دوسری طرف ہمارے سیاستدانوں اور خودساختہ رہنماؤں نے باضابطہ طور پر قومی یک جہتی کو تار تار کر دیا۔ خدا نے ہمیں ایک وسیع ملک عطا کیا، جہاں کے لوگ بھی اچھے ہیں، جہاں بے پناہ قدرتی وسائل ہیں اور ایک اچھا مذہب ہے۔ لیکن ہمارے نام نہاد لیڈروں نے ناشکری کا مظاہرہ کیا اور ان عنایات کو ضائع کر دیا اور ان کے ضمیر نے ملامت تک نہ کی۔ اسلام کے نام پر انہوں نے قوم کو دھوکہ دیا، عوام کو گمراہ کیا اور ہمارے وسائل، خوراک، تجارت اور صنعت کو سیاسی بدعنوانی اور ذاتی مفاد کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اس طرح ملک کا تمام تر نظام تباہی کی جانب گامزن ہو گیا اور لوگوں کی اخلاقی قدریں گرنے لگیں۔ ملک کے خزانے خالی ہونے لگے۔ ہم نے یہ سب کچھ پریشانی مگر صبر کے ساتھ دیکھا۔ ہمیں ہر وقت یہ امید رہی کہ کوئی خدا کا بندہ اُٹھے اور بددیانتی، فریب اور جھوٹ کا یہ ڈرامہ اپنے اختتام کو پہنچے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہم نا اُمید ہوتے چلے گئے اور ہر جانب تاریکی پھیل گئی۔ پھر ایسا وقت آیا کہ ملٹری کو اپنے فرائض سرانجام دینا پڑے۔ بیرونی دشمن اتنا خطرناک نہیں ہوتا جتنا کہ اندرونی دشمن ہوتا ہے۔ سیاست دان صرف اپنے ذاتی اغراض اور مفادات کی خاطر عدم اعتماد کی فضاء پیدا کر رہے تھے اور ملک انتشار سے ہمکنار تھا۔ یہ ملک کے بدترین دشمن تھے۔ خدا کا شکر

ہے کہ ہمارے انقلاب نے ان سیاست دانوں کے ناپاک عزائم کا خاتمہ کر دیا۔

ایوب خان مارشل لاء کی تمامتر ذمہ داری سیاست دانوں پر ڈالتے تھے اور انہیں بارہا بددیانت، بے ایمان، بدعنوان، خودغرض، نااہل اور ملک دشمن کہا۔ وہ یہ تاثر دیتے تھے کہ مسلح افواج نے ملک کی حفاظت کی اور دشمن سے بچایا۔ مارشل لاء کو ملکی حفاظت سے جوڑ کر وہ اس پر تنقید کا منہ بند کرنا چاہتے تھے۔ تاہم ان کے مارشل لاء کے خلاف تنقید مسلسل آتی رہی، حتیٰ کہ ان کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ جمہوریت کا کوئی انوکھا تصور تراش کریں جو ان کی بے پناہ طاقت بھی قائم رکھے اور ان کے من پسند نظام کو جمہوری شکل فراہم کر دے۔

جمہوریت کے ایک نت نئے تصور کی تشکیل سے قبل انہوں نے ضروری سمجھا کہ پارلیمانی نظام کی خرابیوں کو اُجاگر کیا جائے۔ 1956ء کا آئین پارلیمانی جمہوریت کے تصورات پر مبنی تھا۔ ایوب خان نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پارلیمانی نظام پاکستان کے حالات کے لیے موزوں نہیں ہے۔ یکم مارچ 1962ء کو جب انہوں نے نئے آئین کے خدوخال بیان کئے تو اپنے خطاب میں کہا کہ:

> میں یہ بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا نصب العین جمہوریت کی بحالی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی جمہوریت ہونی چاہیے کہ جسے لوگ سمجھ سکیں اور اس پر عمل کر سکیں۔ وقت آنے پر آپ کی آزادانہ رائے لی جائے گی۔ مگر پہلے ہمیں اس نظام کو درست کرنا ہے اور ملک کو صحیح راستے پر گامزن کرنا ہے۔

پارلیمانی نظام کی خامیوں کو اُجاگر کرنے کی غرض سے 26 اکتوبر 1963 کو ایوب خان نے قوم سے خطاب کے دوران کہا کہ پارلیمانی نظام منتخب نمائندوں کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ جب چاہیں حکومت بنالیں یا گرا دیں۔ اس طرح ملک میں استحکام نہیں رہتا۔ یہ نظام برطانوی راج کا دیا ہوا نظام ہے جو پاکستانی معاشرے سے مناسبت نہیں رکھتا۔ پارلیمانی نظام کی خرابیوں کی فہرست پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ نظام بارہا کئی صوبوں میں ناکام ہوا، آئین کو معطل کرنا پڑا اور گورنر راج لگانا پڑا۔ انہوں نے اپنے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں مغربی اور برطانوی

طرزِ فکر کے مطابق نہیں سوچنا چاہیے بلکہ یہ سوچنا چاہیے کہ صدارتی نظام ہمارے معاشرے کے عین مطابق ہے۔ اپنی کئی تقاریر میں ایوب خان نے کہا کہ پارلیمانی نظام کی خامیوں پر خود برطانیہ میں بھی تنقید ہو رہی ہے اور ہمیں ان کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ پارلیمانی نظام کی جگہ پاکستان کو صحیح قسم کی جمہوریت کی ضرورت ہے۔

اپنے مخصوص تصور کا دفاع کرتے ہوئے 10 اکتوبر 1962ء کو ایوب خان نے ''مرر'' (The Mirror) کی ایڈیٹر بیگم حمید اللہ کو ایک خط میں لکھا کہ:

> میں آپ کے حقیقی جمہوریت سے منسوب جذبات کی قدر کرتا ہوں، تاہم میں آپ کے دلائل سے متفق نہیں ہوں۔ معلوم ہوتا ہے آپ سمجھتی ہیں کہ جو لوگ جمہوریت کے نام پر شور وغل مچا رہے ہیں وہ دل سے حب الوطن ہیں اور میں واحد شخص ہوں جو ان کے راستے کی دیوار بنا ہوا ہوں۔ ایسے نتائج اخذ کرنے سے قبل آپ جمہوریت کے نام پر ان کے ماضی کا ریکارڈ ضرور مدِ نظر رکھیں اور اس کا موازنہ میرے اعمال سے کریں کیونکہ میں نے تو خود طاقت عوام کے ہاتھ میں دے دی ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

ایوب خان نے اسی خط میں لکھا کہ کوئی تندرست وتوانا سیاسی پروگرام اُبھرتا ہوا نظر نہیں آتا کیونکہ سیاست دانوں نے مل کر اصولوں پر کام کرنا نہیں سیکھا۔ جو لوگ 1962ء کے آئین کو جمہوری بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ آئین کو دیکھیں کہ اس میں کتنی جوابدہی ہے اور لوگوں کی نمائندگی ہے۔ اور پھر اس آئین کو دو تہائی اکثریت سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ جب کوئی ترمیمی بل میرے پاس آئے گا تو میں وسیع تر قومی مفاد کو سامنے رکھ کر فیصلہ کروں گا۔ ایوب خان نے کئی مرتبہ خود کو عقلِ کُل کے طور پر پیش کیا کیونکہ ان کا یہ ماننا تھا کہ وہ بہتر جانتے ہیں کہ قوم وملک کے مفاد میں کیا ہے۔

پارلیمانی نظام کو یکسر رد کرتے ہوئے ایوب خان نے صدارتی نظام کی ایک مخصوص شکل مرتب کی جسے انہوں نے بارہا حقیقی یا درست جمہوریت کا نام دیا۔ 1962ء کے آئین کے نمایاں پہلوؤں میں جو باتیں شامل تھیں ان میں بنیادی یا بلدیاتی جمہوریت، سیاسی پارٹیوں پر پابندی،

صدر کے بے شمار اختیارات، عوامی نمائندوں کا براہِ راست منتخب نہ ہونا سرِ فہرست تھے۔ یہ آئین معاشرے کو قطعی طور پر غیر سیاسی بنانے کا ایک ایجنڈا تھا۔ اس ''حقیقی'' جمہوریت کے اندر ایک آمرانہ نظام اور آمرانہ ذہنیت پنہاں تھے۔ ایک انتظامی ڈھانچے کو سیاسی نظریئے کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس ''حقیقی'' جمہوریت کے سینے میں مطلق العنانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

بنیادی جمہوریت کا قیام Basic Democracies

نام نہاد حقیقی جمہوریت کے خواب کی تعبیر پوری کرنے کے لیے ایوب خان نے ایک بیورو قائم کیا جس کا نام تھا Beurau for National Reconstrection (BNR) یعنی تعمیرِ نو کا بیورو۔ اس بیورو کا کام تھا کہ وہ ایک نئے نظام کو جنم دے جس کا نام تھا ''بنیادی جمہوریت'' Basic Decomcracies جو کہ ایک ضلعی اور بلدیاتی نظام تھا۔ اس نظام کا دفاع کرتے ہوئے ایوب خان نے اکثر کہا کہ جو لوگ اس نظام پر تنقید کر رہے ہیں وہ ان طبقات سے تعلق رکھتے ہیں جو روایتی طور پر مراعات یافتہ طبقے ہیں۔ ایسے طبقے نہیں چاہتے کہ عام لوگوں تک طاقت پہنچائی جائے۔ بقول ایوب خان یہ جمہوریت کا ایک نظام تھا جو لوگوں کے لیے سمجھنا آسان تھا اور وہ اس پر آسانی سے عمل کر سکتے تھے۔ اس نظام کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

> ہمارا بنیادی جمہوریت کا نظام منفرد اور انوکھا ہے۔ اس نظام کی وجہ سے عوام میں فخر، اُمید، احساس شمولیت اور ذمہ داری پیدا ہو رہے ہیں اور وہ بڑے پیمانے پر اس میں شریک ہو رہے ہیں۔ اس طرح ایک اصلی جمہوری معاشرے کی بنیاد مضبوط ہو رہی ہے۔ اس لیے ہمیں اسے پروان چڑھانا چاہیے۔ اس نظام میں لوگوں کے براہِ راست منتخب نمائندے ہوں گے جو ایلیکٹورل کولج (Electoral College) ہوں گے اور وہ اسمبلی کے ارکان اور صدر کا انتخاب کریں گے۔ وہ قومی اور صوبائی اداروں کا انتخاب کریں گے۔

اس نظام کا دفاع کرتے ہوئے انہوں نے مزید کہا کہ ماضی میں سیاستدان عام لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر ووٹ دینے کے لیے لے جاتے تھے، اب وہ لوگ مقامی نمائندوں کو چنیں گے جنہیں وہ خود جانتے ہوں گے اور جو مقامی معاشرے کی پُر وقار شخصیات میں سے ہوں گے۔ اس نظام کے ذریعے ایوب خان نے عام لوگوں کو براہِ راست اپنے صوبائی اور قومی نمائندوں کے انتخاب سے محروم کر دیا۔ انہوں نے یہ تاثر پیدا کیا کہ عام لوگوں کو نہیں معلوم ہوتا کہ

کون ان کے لیے بہتر یا بدتر ہے لہٰذا مقامی نمائندے صوبائی اور قومی اسمبلی کے ارکان کا انتخاب کریں گے۔ انہوں نے اپنے اس من پسند نظام کی اس قدر تعریف کی کہ یہ بھی کہہ دیا کہ مشرقی پاکستان میں لوگ اس نظام سے بہت خوش ہیں اور اسے بخوبی چلا رہے ہیں۔

بنیادی جمہوریت (Basic Democracies) کا یہ نظام دراصل جمہوریت کی مکمل نفی کے مترادف تھا۔ لوگوں سے ان کے نمائندے چننے کا حق درحقیقت چھینا جا رہا تھا لیکن تاثر یہ دیا گیا کہ جمہوریت کی کوئی اصلی اور حقیقی شکل تیار کی جا رہی ہے۔

سیاسی پارٹیوں پر پابندی

1962ء کے دستور میں معاشرے کو غیر سیاسی بنانے کی غرض سے ایک اور عنصر شامل کیا گیا جو بے پناہ تنقید کا نشانہ بنا۔ یہ تھا سیاسی پارٹیوں پر پابندی۔ یہ عمل بذات خود ایک سیاست تھی۔ کیونکہ سیاسی جماعتوں کو باہر رکھ کر ایوب خان بلدیاتی نظام کے ذریعے ایسے لوگوں کو منتخب کروا سکتے تھے جو ان کے من پسند نمائندوں کو اپنی مرضی کے چنیں۔ یعنی وہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اپنی مرضی کے لوگ بھر سکتے تھے جو ان کے اقدامات کو تحفظ فراہم کر سکیں۔ اس طرح شخصی سیاست کو فروغ دیا گیا کیونکہ سیاسی پارٹیاں ہی کوئی نہ کوئی نظریاتی پروگرام دے سکتی ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں ایک شخصی نظام جنم لیتا ہے جو مخصوص، وفادار اور خوشامدی افراد کو طاقت کے عہدوں تک لے جاتا ہے۔ بلدیاتی نظام اور سیاسی پارٹیوں پر پابندی دراصل ایوب خان کے آمرانہ نظام کو تقویت پہنچانے کی غرض سے شامل کیے گئے۔ یکم مارچ 1962ء کو قوم سے خطاب کے دوران ایوب خان نے فرمایا:

> ماضی میں سیاسی جماعتوں کا تجربہ افسوسناک رہا ہے اور اگر انہیں ایک بار پھر اُبھرنے کا موقع دیا گیا تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ حالات مختلف ہوں گے۔ ویسے بھی قومی اسمبلی کے انتخابات تک مارشل لاء کا نفاذ ضروری ہے۔ لہٰذا آئندہ انتخابات ذاتی میرٹ کی بنیاد پر منعقد ہوں گے۔ امیدواروں کو ثابت کرنا ہوگا کہ وہ پاکستان پر ایمان رکھتے ہیں اور نظریہ پاکستان پر یقین رکھتے ہیں۔ مزید ان کے اعمال کو بھی دیکھا جائے گا اور جانچا جائے گا کہ ان کا چال چلن کیسا ہے۔ کیا ہم ایک متحد، منظم اور مستحکم پاکستان کے خواہاں ہیں کہ نہیں؟ میرے خیال میں کسی شخص کو جاننے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ کسی پارٹی کا منشور اس سے بہتر نہیں ہو سکتا..... ہمارے ہاں سیاسی پارٹیاں اتحاد کو ختم کرتی ہیں، لوگوں میں کسمپرسی کا عالم پیدا کرتی ہیں اور اخلاق سے عاری سیاستدان عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ لہٰذا میرا یقین ہے کہ ہم اپنی

سیاست کو پارٹی سسٹم کے بغیر بہتر چلا سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ اتنا خطرناک نہیں جتنا کہ ان گروپوں کا پاکستان پر قبضہ ہے۔ تاہم اگر یہ نظام کارآمد نہ ثابت ہوا تو پھر پارٹی سسٹم کا احیاء کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے قومی اسمبلی کی اجازت کی ضرورت ہوگی اور ہمیں یقینی بنانا ہوگا کہ بہت زیادہ پارٹیاں نہ ہوں اور ان کے تندرست قومی پروگرام ہوں۔

چنانچہ لوگوں کو سیاسی پارٹیوں سے محروم کر کے انہوں نے اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ جب وہ مناسب سمجھیں سیاسی پارٹیوں کا نظام پھر سے رائج کر دیں۔ اس کے باوجود کہ انہوں نے کئی تقریروں میں بارہا سیاسی پارٹیوں کو غلط قرار دیا، لیکن بالآخر جب سیاسی پارٹیاں پھر سے منظر عام پر نمودار ہوئیں تو خود ایوب خان نے مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کر لی۔

1962ء کے آئین میں ایوب خان نے صدر کے لیے بے شمار اختیارات رکھ دیئے۔ یہ اس حد تک تھے کہ ان کا نظام شخصی آمریت کی عکاسی کرتا تھا۔ مثال کے طور پر آئینی ترمیم کے لیے اسمبلی کی دو تہائی اکثریت ضروری تھی لیکن صدر کے دستخط کے بغیر یہ ترمیم ممکن نہیں تھی۔ البتہ اگر اسمبلی کے 75 فیصد ارکان اس ترمیم کو ایک دفعہ پھر قبول کر لیتے تو صدر کا ویٹو بے معنی ہو جاتا۔ لیکن ایوب خان کا خیال تھا کہ وہ پھر بھی کسی بل پر اس وقت تک دستخط نہیں کریں گے جب تک کہ وہ خود مطمئن نہ ہو جائیں کہ یہ قانون عوام کی بہتری اور قوم کے مفاد میں ہوگا۔ خود کو عقل کُل تصور کرنا ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو معلوم ہوتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ نہ تو کوئی ان سے اور مسلح افواج سے بڑھ کر محبِ وطن ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی سیاستدان دانشور یا صحافی ان سے بہتر سمجھتا ہے کہ ملک وقوم کے مفاد میں کیا ہے۔ یہ خود فریبی ان کے آمرانہ ذہن کی عکاسی کرتی ہے۔

آزادئ صحافت پر پابندی

سیاسی پارٹیوں پر پابندی اور بنیادی جمہوریت کے نظام کے علاوہ ایوب خان کی ''حقیقی جمہوریت'' کے چند دیگر پہلو غور طلب ہیں۔ آزادئ صحافت پر پابندیاں اور طلبہ سرگرمیوں کی روک تھام بھی ایوب خان کے دور کی تکلیف دہ یادگاروں میں سے ہیں۔

ایوب خان کے مروجہ آئین اور مارشل لاء پر ابتداء سے ہی کڑی تنقید کی جا رہی تھی۔ وہ اس

تنقید کے بارے میں بہت حساس تھے۔ مارچ 23، 1962ء میں قوم سے خطاب کے دوران انہوں نے کہا:

> دانشور آزادیٔ اظہار اور حق رائے دہی کے بارے میں مُصر ہیں۔ یہ آزادی انہیں حاصل ہے۔ لیکن اس آزادی کا استعمال اُنہیں مکمل ذمہ داری کے ساتھ کرنا چاہیے۔ ہمارا معاشرہ ابھی تشکیل دیا جارہا ہے۔ ایسے معاشروں میں عوام ان لوگوں کی سوچ، عمل اور الفاظ سے بہت متاثر ہوتے ہیں جو سوچنا، پڑھنا اور لکھنا جانتے ہیں۔ تنقید بے شک گراں قدر ہوتی ہے، لیکن صرف جب اصلاح کی غرض سے کی جائے نہ کہ تباہی پھیلانے کے لیے ہو۔

ایوب خان کی اس تنبیہہ کے باوجود ان کے آمرانہ نظام پر کڑی تنقید جاری رہی اور ان کو برملا اپنے اقدامات کا دفاع کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ صحافیوں اور وکلاء نے ان کے دور کو ملک کی تاریخ کا ایک تاریک دور کہا اور ایوب خان جواب میں ماضی کی یادداشت تازہ کرتے رہے اور اسی بات کو دہراتے رہے کہ سیاستدانوں نے ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا تھا اور انہوں نے ملک کو ڈوبنے سے بچایا۔ یکم اکتوبر 1963ء کو جب کہ 1962ء کے آئین پر تنقید عروج پر تھی تو ایوب خان نے صحافیوں کو خبردار کیا:

> میں صحافیوں سے کہتا ہوں کہ وہ اپنا رویہ تبدیل کریں اور قومی مسائل کی جانب ایک معروضی انداز اپنائیں۔ حالیہ پریس آرڈی نینس پر بلاوجہ اتنا شور وغل مچایا جارہا ہے۔ صحافت پر جو صوبائی سطح پر حالیہ پابندیاں لگائی گئی ہیں ان کا بہت جواز ملتا ہے..... میں اُمید کرتا ہوں کہ پریس خود اپنے لیے ایک ضابطہ اخلاق ترتیب دے گا۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب رہا تو اس نئے آرڈی نینس کے تحت قدم اُٹھانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہا تو حکومت کو اپنی ذمہ داری نبھانا پڑے گی۔ شہریوں کا حق ہے کہ ان تک صحافیوں کے ذریعے معروضی معلومات پہنچیں اور حالات کا ایک منصفانہ جائزہ ہو جو کہ ایک صحیح

زاویئے سے دیا گیا ہو..... میں تسلیم کرتا ہوں کہ صحافیوں کے جائز مفادات کو تحفظ دینا ضروری ہے لیکن اُتنا ہی اہم یہ بھی ہے کہ لوگوں کو چھپے الفاظ کے ظلم سے بچایا جائے۔ ایسے الفاظ جو حقائق مسخ کرتے ہیں اور لوگوں کو آپس میں بانٹ دیتے ہیں۔

پریس کو اس نوعیت کی دھمکیاں بارہا دی گئیں۔ اور خبردار کیا گیا کہ صحافی خود کو سدھاریں ورنہ اُن کے ساتھ سختی سے نمٹا جائے گا۔ یکم نومبر 1963ء کو ایوب خان نے پہلے صحافیوں کو سراہا کہ وہ کسی حد تک سلجھ گئے ہیں اور پھر کہا:

مجھے خوشی ہوئی ہے کہ چند صحافیوں کے علاوہ صحافت کے معیار میں بہتری آئی ہے۔ لیکن جو چند صحافی اب بھی اُسی ڈگر پر قائم ہیں، میں سوچتا ہوں کہ کاش وہ اس بات کا احساس کریں کہ سخت تنقید اور جارحانہ رویے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایک صحافی کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرے اور حقائق کی بجائے غلط بیانی کرے.....

آپ گذشتہ 15 مہینوں کی تقاریر پڑھیں یا وہ مضامین پڑھیں جو چھاپے گئے ہیں۔ کیا آپ کو لوگوں کے مسائل اور ان کے حل کے بارے میں کچھ ملتا ہے؟ صرف اور صرف بنیادی حقوق، بالغ رائے دہی اور پارلیمانی طرزِ حکومت پر نعرے ملتے ہیں۔ کیا ان سے لوگوں کی مشکلات دور ہوں گی؟..... ہمارے سیاسی مبصرین کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ حقیقت پسند نہیں ہیں۔ ان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ تنازعات کو جذباتی حد تک اُبھار دیا جائے تاکہ لوگ گمراہ ہوں۔ یہ لوگوں کی خدمت نہیں ہے۔ اصل خدمت تو تب ہوتی ہے جب وہ لوگوں کے مسائل کے ایسے حل پیش کریں جو نافذ العمل ہوں اور کارآمد ثابت ہوں۔

ایوب خان خود پر تنقید کو برداشت نہیں کرتے تھے اور اسے گمراہ کرنے سے تشبیہہ دیتے تھے۔ جب بھی ان کے بنائے ہوئے صدارتی نظام پر اور منشور پر تنقید ہوتی تو وہ عوامی مسائل کی جانب اشارہ کر کے کہتے کہ صحافی لوگوں کے اصل مسائل پر توجہ نہیں دے رہے۔ ان کے نزدیک

آمریت اور سیاسی نظام کی خامیاں لوگوں کے مسائل میں شامل نہیں تھیں۔ صحافت پر تنقید دو بنیادوں پر کرتے تھے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے روزمرہ کے مسائل کو اُجاگر نہیں کیا جارہا اور دوسرا یہ کہ ملک وقوم کو اندرونی اور بیرونی خطرات لاحق ہیں لہٰذا لوگوں کو تنقید کی بجائے سوچنا چاہیے کہ قوم کی بہتری کس چیز میں ہے۔ تاہم ایوب خان کے پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی نینس پر کڑی تنقید جاری رہی۔

طلبہ کی سرگرمیوں پر پابندی

ایوب خان کے دور میں مختلف پارٹیوں میں طلبہ کی تنظیمیں سرگرم تھیں۔ ان میں بائیں بازو کی تنظیمیں بھی شامل تھیں۔ طلبہ باقاعدگی سے سیاسی عمل کا حصہ تھے اور سیاسی سوچ رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ایوب خان ان سے خائف تھے اور ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگانا چاہتے تھے۔ 24 دسمبر 1962ء کو انہوں نے قوم سے خطاب کے دوران کہا کہ کچھ عناصر اپنے خودغرض مقاصد کے لیے لوگوں میں بدامنی اور انتشار پھیلا رہے ہیں اور قوم و ملک کے خلاف سرگرم ہیں۔ اور میں انہیں خبردار کرتا ہوں کہ وہ طلبہ کو اپنی اس سیاست میں شامل نہ کریں۔ بقول ایوب خان طلبہ اس ملک کا سرمایہ ہیں اور ان سے قوم کی امیدیں اور مستقبل وابستہ ہیں۔ حکومت ان کی تعلیم پر گراں قدر اور کثیر وسائل خرچ کر رہی ہے اور اگر وہ اپنے اصلی نصب العین سے چوک گئے اور گمراہ ہو گئے تو یہ ایک قومی سانحہ ہوگا۔ یہ ہماری آنے والی نسلوں کے ساتھ ایک بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔ طلبہ کی سیاست کو ایوب خان نے بدامنی اور انتشار سے منسوب کیا اور مشورہ دیا کہ ان کو غیر سیاسی رہنے دیا جائے۔ غالباً ایوب خان خوفزدہ تھے کہ طلبہ ایک قوت ہیں جو منظم ہو جائیں تو طوفان آسکتے ہیں۔ ایک آمر کو نوجوانوں سے خوف تھا کیونکہ نوجوانوں میں اکثر جذبہ مضبوط اور شدید ہوتا ہے۔

یکم دسمبر 1963ء کو ایک دفعہ پھر ایوب خان نے اسی امر کی جانب اشارہ کیا اور کہا:

> گذشتہ چند سالوں میں آپ چند سیاستدانوں کی حرکتوں کو دیکھیں۔ انہوں نے طلبہ کو سیاست میں دھکیلنے کی کوشش کی ہے۔ کیا یہ ان بے چارے طالب علموں سے ناانصافی نہیں ہے جنہیں شاید معلوم بھی نہ ہو کہ ان کا استحصال کیا جارہا ہے؟ انہیں ان کی پڑھائی سے دور کرنا، ان کا

قانونی حکام سے تصادم کروانا، ان کا تعلیمی اور پیشہ وارانہ مستقبل تباہ کرنا، یہ سب کچھ کیا قوم کی خدمت ہے۔ اس سے بڑی برائی کیا ہو سکتی ہے۔ یہ تو ان غریب والدین سے زیادتی ہے جنہوں نے کئی قربانیاں دے کر اپنے بچوں کو سکولوں اور کالجوں میں بھیجا۔ ان والدین کا کیا قصور ہے کہ یہ لوگ ان کے بچوں کو گمراہ کر رہے ہیں اور تباہ کر رہے ہیں؟ ایسے والدین کو چاہیے کہ وہ حکومت کو شواہد فراہم کریں تا کہ ان عناصر کے خلاف کارروائی کی جا سکے جو طالب علموں کو ورغلا رہے ہیں۔

ایوب خان نے طلبہ سے بھی اپیل کی کہ وہ ان سیاست دانوں کے شکنجے میں نہ آئیں اور اپنی تعلیم پر توجہ دیں۔ انہوں نے طلبہ کو ہوشیار کیا کہ انہیں پڑھائی سے دور لے جانے والے شر پسند عناصر ہیں اور وہ ان کی باتوں میں نہ آئیں۔ ایک دفعہ پھر ایوب خان نے ملک کی بقاء اور استحکام کا واسطہ دے کر طلبہ کو سیاست سے روکا۔ ایوب خان کے دور کی تعلیمی پالیسی میں بھی یہی تجاویز دی گئیں کہ طلبہ یونین پر پابندی ہو اور ان کی تمام تر توجہ اپنی پڑھائی اور مستقبل پر ہو۔ طلبہ کی یونین پر پابندی لگانے کے باوجود ایوب خان ان نوجوانوں کو منظم ہونے سے نہ روک پائے اور بالآخر 1968ء میں جب وہ اقتدار سے علیحدہ ہوئے تو اس میں طلبہ کا نمایاں کردار تھا۔

ایوب خان کی ''حقیقی جمہوریت'' درحقیقت آمریت کی ایک انوکھی شکل تھی۔ پورے معاشرے کو غیر سیاسی بنا کر وہ ایک انتظامی ریاست کی تعمیر کر رہے تھے، ایک ایسی ریاست جہاں قواعد و ضوابط تو بے شمار ہوں لیکن سیاست نہ ہو، جہاں معاشرے کی ناہمواریاں اور عدم برابریاں انتظامی ڈھانچے کے پیچھے روپوش ہو جائیں۔ جہاں لوگوں کی آواز اُٹھانے کے لیے سیاستدان اور سیاسی پارٹیاں نہ ہوں۔ جہاں ظلم، ناانصافی اور حق تلفی کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے صحافی نہ ہوں، یا پھر ان کے لب سی دیئے گئے ہوں۔ اور جہاں تبدیلی لانے کے لیے نوجوانوں کا جوش و جذبہ نہ ہو۔ ایک مشینی ریاست جہاں ہر پرزہ اپنا کام پھرتی سے سرانجام دے رہا ہو، لیکن غم و غصہ کے جذبات اُبھر نہ سکیں، تنقید نہ ہو سکے۔ بے جان انسانوں کی ریاست جہاں زندگی کے آثار مٹ چکے ہوں اور ہر شخص مشین کا ایک پرزہ ہو جو صبح سے شام تک صرف اپنا کام کرتا رہے اور اسے معلوم نہ ہو کہ وہ کیوں یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ اس کے جذبات کچل کر ختم کر دیئے گئے ہوں تا کہ نہ وہ کچھ

سوچ سکے اور نہ محسوس کر سکے۔ یہ تھی وہ صبحِ بے نور جس پر حبیب جالب بول اُٹھے تھے۔

میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا
ایسے دستور کو، صبح بے نور کو

سیاستدانوں، صحافیوں اور طالب علموں کے علاوہ ایوب خان کا ایک جھگڑا مسلسل وکلاء اور عدلیہ کے ساتھ چلتا رہا۔ وکلاء اور قانون دان متواتر قانون کی بالادستی اور آزاد عدلیہ کا مطالبہ کرتے رہے اور ایوب خان ہر دَم یہ دعویٰ کرتے رہے کہ انہوں نے قانون کی حکمرانی قائم کر دی ہے اور عدلیہ کو ایگزیکٹو (Executive) سے علیحدہ کر کے اسے آزاد و خود مختار بنا دیا ہے۔

قانون کی حکمرانی اور عدلیہ کی آزادی

مارشل لاء لگنے کے بعد وکلاء اور قانون دان متواتر عدلیہ کی آزادی اور قانون کی بالادستی کا مطالبہ کرتے تھے۔ ایوب خان ان کی مسلسل تنقید کے معاملے میں حساس تھے اور انہوں نے کئی مرتبہ ان اُمور پر وکلاء کے کنونشن اور بار ایسوسی ایشنز سے خطاب کے دوران اظہارِ خیال کیا۔ 30 ستمبر 1960ء کو کراچی میں وکلاء کے کنونشن سے خطاب کے دوران ایوب خان نے قانون کی حکمرانی پر اپنا مؤقف پیش کرنے کے بعد کہا:

> آپ نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ حکومت اکثر اپنے احکامات کو حتمی شکل دے دیتی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ حکومت کے اختیارات پر مناسب پابندیاں ہونی چاہئیں۔ اور میں یہ بھی مانتا ہوں کہ بالآخر یہ عدلیہ کا حق ہے کہ وہ اس بات کا تعین کرے کہ آیا حکومت نے ان پابندیوں کی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں۔ لیکن میں یہ نہیں تسلیم کرتا کہ یہ پابندیاں غیر ضروری حد تک سخت ہوں اور ان میں کوئی لچک نہ ہو۔ یہ ممکن نہیں ہونا چاہیے کہ عدلیہ حکومت کے کاموں میں مداخلت کرے۔ کبھی کبھی یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ حکومت کے افسران ہر دَم قانون توڑنے میں لگے رہتے ہیں اور عدلیہ کے افسران کا کام ہے کہ وہ ان پر پابندیاں لگائیں۔ اس قسم کے رویئے سے ان دونوں کے مابین اختلاف، تصادم

اور ناراضگی پیدا ہوتی ہے جو کہ تندرستی کی نشانی نہیں ہے۔ ہر اچھی حکومت اپنے افسران پر قابو رکھتی ہے اور ان کی غلطیوں کو درست کرتی ہے۔ عدلیہ کے عوامل بہت طویل مدت پر مشتمل ہوتے ہیں اور چند افراد کے مفاد کی خاطر تھم جاتے ہیں جبکہ اکثر یہ ضروری ہوتا ہے کہ ملک کے وسیع تر مفاد میں جلد فیصلے کئے جائیں۔ ہم نے عمومی طور پر سرکاری احکامات کو حتمی نہیں گردانا، بس اتنا ہی کیا ہے جتنا کہ ماضی میں ہوتا رہا۔ صرف ایک یا دو مرتبہ ایسا ہوا کہ کوئی ایسا معاملہ آیا جس پر فوری قدم اُٹھانا ضروری تھا تا کہ قومی مفاد متاثر نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہ عدلیہ پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ کوئی حکومتی قدم قانونی ہے یا نہیں۔

ایوب خان کو عدلیہ کا حکومتی اقدامات پر نظر رکھنا مداخلت معلوم ہوتا تھا۔ ایوب خان ایک آمر تھا۔ وہ بندوق کے زور پر اپنی ہر بات منوانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے قانون کے ماتحت ہونا مشکل تھا کیونکہ قانون مرضی کی راہ میں حائل ہوتا ہے اور آمر عموماً اپنی مرضی قوم پر مسلط کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت پر کوئی سخت پابندیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ جبکہ عدلیہ کا تو کام ہی یہی ہے کہ حکومت کے ہر قدم کو دیکھے اور تعین کرے کہ وہ قانونی ہے یا غیر قانونی تا کہ حکومت لوگوں کے حقوق کو پامال نہ کر سکے۔ عدلیہ کا یہ بنیادی مقصد آمروں کو اپنی راہ کا پتھر محسوس ہوتا ہے اور ایوب خان بھی اس ''مداخلت'' سے تنگ تھے۔

وکلاء اور قانون دانوں کا ایوب خان سے مسلسل استفسار تھا کہ بنیادی حقوق کو قانون کا حصہ بنایا جائے تا کہ اگر وہ پامال ہوں تو عوام عدالت سے رجوع کر سکیں۔ اس بات پر بھی ایوب خان ان سے خائف تھے اور انہیں ڈر تھا کہ اگر بنیادی حقوق کو قانون کے ماتحت کر دیا تو پھر عدلیہ قانون سازی کا حصہ بن جائے گی نہ کہ صرف آئین کی محافظ۔ 27 اپریل 1962ء کو لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے دوران ایوب خان نے کہا کہ برطانیہ تک میں جوڈیشل ریویو (Judicial Review) کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اس بات کا فیصلہ صرف مقننہ یا پارلیمنٹ کو کرنا چاہیے کہ کیا بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہوئی یا نہیں۔ بقول ایوب خان اس طرح جج صاحبان قانون ساز اسمبلیوں پر (Superindent.....) بن جائیں گے اور ان کا کردار

قانون سازوں جیسا ہو جائے گا جبکہ عدلیہ کا کام مروجہ قوانین کا دفاع اور اطلاق ہے قانون بنانا ان کا کام نہیں ہے۔ اگر جج صاحبان کو قانون ساز اسمبلی پر اتنا اختیار دے دیا گیا تو یہ قانون سازی کے عمل کی نفی ہوگا اور ذاتی مفادات کو فروغ ملے گا کیونکہ پھر سیاستدان عدالتوں کو اپنے من پسند جج صاحبان سے پیک کر دیتے ہیں۔ عدالتوں کی پیکنگ کے خوف کو بہانہ بنا کر ایوب خان نے بنیادی حقوق کے عدالتی دفاع کا موقع ختم کر دیا۔

1962ء کے اسی خطاب کے دوران ایوب خان نے دعویٰ کیا کہ عدلیہ آزاد اور خودمختار ہے۔ وکلاء کے اس مسلسل مطالبے پر کہ عدلیہ کو آزاد ہونا چاہیے ایوب خان نے کہا:

> آپ لوگ عدلیہ کی ایگزیکٹو (Executive) سے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ اور اس امر کو عدلیہ کی آزادی سے منسوب کرتے ہیں کیونکہ یہ علیحدگی اور آزاد عدالتیں جمہوریت کے لیے ناگزیر ہیں۔ یہ عمل پوری طرح سے جاری ہے اور نئے آئین میں ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ اس بات کو یقینی بنایا جائے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ حکومتی اور قانون ساز اسمبلیوں کے نمائندوں پر عدالتوں میں مقدمات چلائے جا سکتے ہیں، اور صدر پر قومی اسمبلی مقدمہ چلا سکتی ہے، لیکن عدلیہ کے افسران اور جج صاحبان پر صرف عدلیہ خود مقدمہ چلا سکتی ہے۔

ایوب خان نے کہا کہ غالباً وکلاء کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ضلعی سطح پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس عدالتی اختیارات ہیں اور یہ مجسٹریٹ بنیادی طور پر انتظامی امور اور حکومت کا حصہ ہیں۔ یہ اختیارات شاید وکلاء برادری ضلعی جج کے ہاتھوں میں تھامنا چاہتی تھی تاکہ حکومت سے عدلیہ کو بالکل علیحدہ کر دیا جائے۔ ایوب خان کے مطابق یہ محض ایک انتظامی مسئلہ تھا جس کا تعلق مالی امور سے بھی تھا۔ انہوں نے وکلاء کا یہ مطالبہ یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ خالصتاً انتظامی امور کو عدالتوں کے ماتحت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد ایوب خان نے وکلاء سے کہا کہ ان کا مطالبہ یہ رہا ہے کہ عدلیہ کے ارکان کو بار میں سے لیا جائے۔ ہائی کورٹ کی سطح پر تو یہی طریقہ کار تھا لیکن اس سے نیچے کی سطح پر پکے ملازمین کی ضرورت تھی جو کہ امتحان پاس کر کے آئیں اور ان میں سے اعلیٰ عدالتوں میں تقرریاں ضروری تھیں۔ چنانچہ بار ایسوسی ایشنز، وکلاء اور ایوب خان کے درمیان اعلیٰ عدلیہ میں

تقرری کے اصولوں پر اختلاف چلتا رہا اور ایوب خان کی کوشش تھی کہ یہ تقرریاں وفادار افسران میں سے کی جائیں اور وکلاء کی خواہش تھی کہ اعلیٰ عدالتوں میں تقرری بار میں سے کی جائے۔

اسی تقریر کے دوران ایوب خان نے قانون کی بالادستی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ قانون کی حکمرانی کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ ملک میں حالات قانون کے مطابق چل رہے ہیں، لہٰذا جب بار ایسوسی ایشنز قانون اور نظم ونسق کے بارے میں قراردادیں منظور کرتی ہیں تو انہیں خیال رکھنا چاہیے کہ ملک میں نظم وضبط کی بھی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح ایوب خان نے نظم ونسق کو قانون کی بالادستی سے متضاد قرار دیا۔ انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اگر قانون کی بالادستی ہوئی تو معاشرے میں بدنظمی ہوسکتی ہے۔ بطور ایک آمر انہوں نے قانون کو اپنی راہ میں حائل پتھر تصور کیا۔ آخر میں انہوں نے وکلاء کو ترغیب دی کہ وہ مغربی ممالک کے ماڈل کی تقلید کرنے کی بجائے اپنے معاشرے کی مقامی روایات کے مطابق قانون اور دیگر امور پر نئی اور منفرد سوچ تعمیر کریں۔ جس شعبے میں ایوب خان جدّت پسند اور مغربی روایات کی پیروی کرنا چاہتے تھے، وہاں انہوں نے امریکہ یا برطانیہ کی تقلید سے گریز نہیں کیا لیکن جہاں قانون کا معاملہ تھا انہوں نے وکلاء کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا مقامی نظام ترتیب دیں۔

16 جولائی 1963ء کو راولپنڈی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے دوران ایوب خان نے مارشل لاء دور کے قوانین کا ایک دفعہ پھر دفاع کیا۔ انہوں نے خبردار کیا کہ جو قوانین انہوں نے رائج کئے ہیں، اگر ان کا دفاع نہ کیا گیا تو ملک ایک شدید انتشار سے دوچار ہوجائے گا۔ ایک بہت بڑا بحران پیدا ہوجائے گا۔ 1963ء کے اس خطاب کے دوران انہوں نے کہا:

> میرا نظریہ ہے کہ ایک ریاست کے تین ستون ہوتے ہیں۔ ایک مقنّنہ، ایک حکومت یعنی وزراء اور کابینہ اور تیسرا ستون ہے عدلیہ۔ یہ تینوں جتنا ایک دوسرے کے کام میں کم مداخلت کریں اتنا بہتر ہے۔ ہمارے ہاں ایک رجحان پیدا ہوگیا ہے کہ جب تک قانون ساز اسمبلی یا مقنّنہ حکومت کے کام میں مداخلت نہ کرسکے وہ بے اثر اور بے بس ہے اور اسی طرح ایک رجحان ہے کہ جب تک عدلیہ حکومت کے کاموں میں مداخلت نہ کرے تو اسے غیر مؤثر سمجھ لیا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہے اور اگر آپ

چاہتے ہیں کہ مقننہ اور عدلیہ ملک کا نظام چلائیں تو پھر حکومت جیسا سفید ہاتھی آپ کو کیوں چاہیے؟ پھر آپ اس ستون کو ختم کر دیجئے۔ آپ کی بہت بچت ہوگی اور آپ سب کچھ بچا سکیں گے۔ لوگوں کو کسی ذمہ داری کے بغیر مداخلت کا حق دینا دنیا کی سب سے خطرناک چیز ہے۔

ایوب خان بے حد پریشان تھے کہ حکومت کے کاموں میں عدلیہ یا مقننہ کی مداخلت کیوں ہوتی ہے۔ جسے وہ مداخلت کہتے تھے وہ دراصل عدلیہ اور مقننہ کا بنیادی فرض ہے۔ کابینہ اور حکومت مقننہ کو جوابدہ ہوتی ہے اور عدلیہ کا کام ہوتا ہے کہ ہر ادارے اور ہر شخص پر نظر رکھے تاکہ تمام کام قانون اور آئین کے مطابق چلیں نہ کہ حکومت آئین اور قانون سے بالاتر ہو کر کام کرے۔ ایوب خان اس جوابدہی کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک اس سے کام میں تاخیر ہوتی تھی۔ ان کی تقریروں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ نہ تو مقننہ کو اور نہ ہی عدالتوں کو جواب دینا چاہتے تھے۔ انہیں اس قدر یقین تھا کہ وہ عقلِ کُل ہیں اور سب سے بہتر جانتے ہیں کہ قوم کا برا بھلا کس چیز میں ہے، کہ انہیں قانونی اور آئینی ضروریات ایک رکاوٹ کی طرح محسوس ہوتی تھیں۔ انہوں نے فٹ بال کے امپائر کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ دور بیٹھا کوئی شخص بھی میچ دیکھ رہا ہو با آسانی کسی کھلاڑی پر تنقید کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ اس نے بال کو صحیح طرح نہیں پھینکا۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ اس کھلاڑی کی جگہ اگر وہ خود ہوتا تو کیسے بال کو پھینکتا۔ دور سے بیٹھ کر تنقید کرنا بہت آسان ہے جب خود اپنی ذمہ داری نہ ہو۔ لیکن جب ایک معاشرے کی ذمہ داری کندھوں پر ہو تو نظارہ بہت فرق نظر آتا ہے۔ ان کا کہنے کا مطلب غالباً یہ تھا کہ وکلاء، صحافیوں اور دانشوروں کی جانب سے تنقید تو بہت آ رہی تھی مگر اگر وہ خود حکومت میں ہوتے تو جانتے کہ کتنا مشکل ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ:

> ایک رجحان نظر آ رہا ہے کہ عدلیہ اور مقننہ کو زیادہ طاقتور بنایا جائے۔ حکومت کو کمزور کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اگر آپ ایسا ہی چاہتے ہیں تو پھر کام پورا کر دیجئے۔ حکومت کو، ایگزیکٹو کو ختم ہی کر دیجئے۔ کیونکہ جن لوگوں کو مداخلت کا حق ہوتا ہے انہیں نتائج کی ذمہ داری بھی لینی چاہیے۔ تاکہ اگر کچھ غلط ہو جائے تو وہ بھی جوابدہ ہوں۔

صنعت لگانے کے پرمٹ اور لائسنس دیئے گئے۔ مزید انہیں آسان شرائط پر قرضے فراہم کئے گئے اور بے شمار منافع کمانے کے مواقع دیئے گئے۔ نتیجتاً ملک میں طبقاتی کشمکش شدید ہوئی جو کہ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کی شکل میں نمودار ہوئی۔ دولت کی تقسیم اس قدر غیر منصفانہ تھی کہ 22 خاندانوں کے پاس ملک کی بیشتر دولت جمع ہوگئی تھی۔ صنعت کا 66 فیصد حصہ، انشورنس کا 97 فیصد حصہ اور بینکاری کی صنعت کا 80 فیصد حصہ ان خاندانوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے مقابلے میں سماجی شعبوں پر اخراجات دوسرے ممالک کی نسبت کچھ بھی نہیں تھے۔ جہاں سرمایہ داروں کو بے انتہا مراعات تھیں وہاں عوام کے ہاتھ کچھ نہیں تھا۔ یہ لاوا ایوب خان کے خلاف غم وغصہ کی لہر بن کر اُبھرا جب طالب علم، مزدور، کسان اور معاشرے کے دیگر طبقے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایوب خان کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

طبقاتی تضادات کے علاوہ پاکستان میں صوبائی اور لسانی تضادات بھی شدت اختیار کر چکے تھے۔ مشرقی پاکستان کو خاص طور پر ایک کالونی کی طرح استعمال کیا گیا۔ مشرقی پاکستان سے پٹ سن برآمد کیا جاتا اور اس سے حاصل کردہ زرِمبادلہ مغربی پاکستان کی ترقی پر لگا دیا جاتا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں لوگوں کی فی کس آمدنی میں بے پناہ فرق تھا۔ جس وقت ایوب خان نے مارشل لاء لگایا تو مغربی اور مشرقی پاکستان کی فی کس آمدن میں 30 فیصد کا فرق تھا۔ 1965ء میں دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے اختتام پر یہ فرق بڑھ کر 45 فیصد ہو چکا تھا۔ ایوب خان کے اقتدار سے علیحدہ ہونے تک یہ فرق 61 فیصد تک جا پہنچا تھا۔ بڑھتے ہوئے اس فرق اور محرومیوں کے باعث مشرقی پاکستان میں غم وغصہ تھا اور صوبائی خودمختاری کی تحریک رفتہ رفتہ علیحدگی پسند تحریک بن چکی تھی۔ ایوب خان کے بنگالیوں کے بارے میں خیالات نے ان جذبات کو مزید بھڑکایا تھا۔ مثال کے طور پر یہ ان کا کہنا تھا کہ:

> مشرقی بنگال کے لوگ قدیم ہندوستانی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں..... پاکستان کے قیام سے قبل انہوں نے صحیح معنوں میں آزادی اور خودمختاری نہیں دیکھی تھی۔ مزید ان کے اندر پہلے بھی اور اب بھی ہندوؤں کی ثقافت اور زبان کے بہت اثرات ہیں۔ اسی لیے ان کے اندر دبی اور پسی ہوئی نسلوں کی تمام ترکمیاں ہیں۔ اسی لیے یہ نفسیاتی طور پر اس

نئی آزادی کے عادی نہیں ہو سکے۔

ان الفاظ میں نسل پرستی اور لسانی جذبات کی جھلک نمایاں ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایوب خان ان کو کمتر نسلوں سے منسوب کر رہے ہوں یا جنہیں وہ کمتر قرار دیتے تھے۔ اس قسم کے تضحیک آمیز الفاظ بنگالیوں کے دل میں رنج اور غصہ کی لہر بن گئے اور بالآخر ایوب خان کے اقتدار سے علیحدہ ہو جانے کے صرف تین سال بعد مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور ملک کا اکثریتی صوبہ علیحدہ ہو گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات نہ مان کر مغربی پاکستان کے فوجی آمروں اور سیاستدانوں نے ملک کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔

بطور ایک فوجی آمر ایوب خان کو جنگجوئی میں بھی دلچسپی تھی۔ پاکستانی فوج کو انہوں نے آپریشن جبرالٹر (Operation Gibralter) میں ملوث کر رکھا تھا جس کے تحت ہندوستانی سرزمین کے اندر دراندازی کی جاتی تھی۔ نتیجتاً ستمبر 1965ء میں جنگ چھڑ گئی اور ایوب خان نے دعویٰ کر دیا کہ پاکستان جنگ جیت گیا ہے جبکہ درحقیقت یہ جنگ پاکستان نے نہیں جیتی تھی۔

ایوب خان کے پاس بطور ایک فوجی آمر مکمل طاقت موجود تھی۔ اسی لیے وہ خود کو عقل کُل سمجھتے تھے اور زندگی کے ہر شعبے میں مداخلت کرنا اپنا حق مانتے تھے۔ انہوں نے تعلیم کے شعبے میں بھی دور رس تبدیلیاں کیں اور تاریخ کے مضمون کو جغرافیہ اور شہریت کے ساتھ زم کر کے اس کی اہمیت کو ختم کر دیا۔ تاریخ کے مضمون کا زوال ہوا کیونکہ ایک فوجی آمر ایسے مضمون میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا جو مستقبل میں اس کے تمام اعمال کو اخلاقیات کے ترازو میں ناپے۔

ایوب خان نے دور رس سیاسی، معاشی، ثقافتی، علمی، تعلیمی، نظریاتی، تبدیلیاں کیں۔ زندگی کے کسی بھی شعبے کو نہیں چھوڑا۔ لیکن سب سے خطرناک قدم ان کا یہ تھا کہ انہوں نے آمریت کا دروازہ کھول دیا اور مستقبل کے فوجی رہنماؤں کو ایک راستہ دکھا دیا جس کے ذریعے وہ ملک کے تمام تر وسائل پر قبضہ کر سکیں اور اس قبضے کے نتیجے میں دولت اور عیش و عشرت کی زندگی گزاریں۔ ایوب خان کے بعد تین اور آمروں نے ان کی بتائی ہوئی راہ اختیار کی اور ہر دفعہ پاکستان کے معاشرے اور معیشت کا بے پناہ نقصان ہوا۔ ہر آمرانہ دور میں جرنیلوں نے دولت لوٹی، جنگ کی اور ملک کو شدید نقصان پہنچایا۔ یحییٰ خان کے دور میں مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی ہوئی اور پاکستان کو سقوطِ ڈھاکہ دیکھنا پڑا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں ایک دفعہ پھر تعلیم، عدلیہ اور ذرائع

ابلاغ کے شعبوں میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں کہ آج تک پاکستان ان کے اثرات سے نکل نہیں پایا۔ اس دور میں پاکستان نے سیاچن کھودیا۔ جنرل مشرف کے دور میں ایک دفعہ پھر ''خاموش انقلاب'' کے نام سے انتظامی معاملات میں دوررس تبدیلیاں کی گئیں جس سے ملک کا انتظامی ڈھانچہ تہس نہس ہوگیا اور مشرف ملک کو کارگل کی جنگ میں لے گیا۔ ہر آمرانہ دور میں جنگ اور ہر آمرانہ دور میں ایسی معاشرتی تبدیلیاں جن کی زد سے نکلنا مشکل ہوجاتا ہے۔

اختتامیہ

جب اس مقالے کو لکھنے کی غرض سے سوچا کہ ماضی کی پگڈنڈی پر چلوں گی تو کچھ چھپے ہوئے راز فاش ہوں گے جو شاید وقت کے دھارے کے ساتھ بہہ گئے تھے۔ لیکن جب چلنے لگی تو جلد ہی یہ احساس ہوا کہ یہ پگڈنڈی مجھے ماضی سے حال کی طرف لے آئی ہے۔ یہ تو وہی جگہ ہے..... مانوس جگہ جہاں خود کو بارہا پایا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ تو یہ سفر وہیں آکر تھما جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ ماضی حال میں تھا اور حال ماضی میں۔ میں ان دونوں میں تفریق کرنے سے قاصر تھی۔ مجھے اب خوف تھا تو اس انجانے مستقبل سے کہ کہیں آنے والا کل بھی مجھے گھما پھرا کر اسی پگڈنڈی پر نہ لے آئے جہاں میں ماضی اور حال کے اس طلاطم میں پھنس گئی ہوں۔

ایوب خان کے اکتوبر انقلاب سے لے کر پرویز مشرف کے خاموش انقلاب تک وہی ہم رہے، وہی دنیا، وہی لوگ، وہی روگ۔ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کوئی ٹریڈ مِل (Tread Mill) ہے جس پر آپ خواہ کتنا ہی کیوں نہ چل لیں، آپ وہیں کے وہیں رہتے ہیں۔

میں یہ مقالہ اس شعر سے ختم کرنا چاہوں گی کہ

نہ گئی تیرے غم کی سرداری
دل میں یوں روز انقلاب آئے

یا پھر کچھ اس طرح

نہ گئی اپنی قوم کی سرداری
جگ میں یوں روز انقلاب آئے۔

فوجی اور فلسفی:
پاکستان کی فوجی آمریتیں اور اُن کے نظریہ داں، جنرل ایوب خان اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے خصوصی حوالے سے

نوین جی حیدر

تلخیص

پاکستان کی اب تک کی تاریخ میں تین بڑے مارشل لاء ادوار گزرے ہیں (۱)، ایوب خان، ضیاء الحق، اور پرویز مشرف۔ باقی باتوں کے علاوہ ان ادوار میں یہ ایک قدر بھی مشترک تھی کہ ان تینوں ادوار میں مذہب کا کسی نہ کسی طور سہارا لیا گیا۔ اور اپنے اپنے نمونہ ہائے اسلام کی تشہیر اور توضیح کے لئے ان آمروں نے مفکروں اور دانشوروں کی خدمات حاصل کیں۔ زیرِ مطالعہ مضمون میں ایوب خان کے عہد میں اُن کے نظریہ ساز ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے کردار کا خصوصی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اپنے موضوع کی طرف آنے سے پہلے ہم چند باتوں کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور اپنے موضوع کی حد بندی بھی کر دینا چاہتے ہیں، تاکہ قاری ورق گردانی کرتے ہوئے اس مضمون کی حدود و قیود اور اس کے دائرۂ کار سے آگاہ ہو۔ سب سے اہم وضاحت جو ہم کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ اب یہ بحث کا ایک عام موضوع بنتا جا رہا ہے، خاص طور پر علمی حلقوں میں، کہ اسلامی جدیدیت اول تو اسلامی دنیا میں بالعموم اپنے لیے کوئی خاص جگہ نہیں بنا پائی، اور اگر اس کی کامیابی کی چند مثالیں کہیں مل بھی جائیں تو اس سلسلے میں یہ بات نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے کہ ان کی اس کامیابی کے پیچھے سرکار اور ریاست، خاص طور پر فوجی آمروں کا بڑا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پورا سچ نہیں ہے اور ہمیں اس کی وضاحت کی ضرورت یوں محسوس

ہوئی کہ اندیشہ ہے کہ وہ قارئین جو ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے واقف ہیں وہ شاید مضمون کو پڑھے بغیر ہی یہ نتیجہ اخذ کرلیں کہ یہ تو ایک عام روش ہے اور ایسا تو ہوتا آیا ہے۔ لیکن ہمارا خیال اس سے ذرا مختلف ہے۔ اگرچہ کہ مذہب، چاہے کوئی بھی ہو اور کسی نوعیت کا، اس کا طاقت سے رشتہ پُرانا ہے اور کسی ایک خاص نمونے (brand) کے ساتھ مخصوص نہیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو مذہبی نظریہ کے علاوہ بھی دنیا کا کونسا ایسا نظریہ ہے جس کو اپنی کامیابی کے لیے ریاست اور طاقت کی ضرورت نہیں پڑی؟ کیا ہندوستان میں سیکولر نظریہ کو لاگو کرنے کے لیے اور اس کی بالادستی کو منوانے کے لیے اُن عناصر کے خلاف کاروایاں، اور اکثر انتہائی ظالمانہ کاروایاں، نہیں کرنا پڑیں جو اس کو ناکام بنانا چاہتے تھے۔ اور پھر کیا روس میں اور دیگر ممالک، خاص طور پر اسلامی ممالک اور ہمارے پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے نام نہاد سوشلسٹ نظریہ کو نافذ کرنے کے لیے ریاست کی طاقت استعمال کرنا پڑی یا نہیں؟ ایسی اور بھی کئی مثالیں ہوسکتی ہیں، مثلاً قوم پرستی اور فاشزم وغیرہ۔ ان تمام باتوں سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم مذہب میں طاقت کے استعمال اور اسے عوام کے سروں پر زبردستی تھوپنے کی حمایت کررہے ہیں۔ مگر قارئین کی یاددھانی کے لئے ہم نے ان کا ذکر کرنا مناسب سمجھا۔

دوسری وضاحت یہ کہ اگر ہم پاکستان کے مخصوص حوالے سے بات کریں، جو کہ ہمارے مضمون کا دائرہ ہے، تو ہماری تو بنیادوں ہی میں مذہب شامل ہے۔ پھر چاہے وہ قائدِ اعظم کا دوقومی نظریہ ہو، ایوب خان کا جدید اسلام، بھٹو کا اسلامی سوشلزم، یا ضیاء الحق کا نظامِ مصطفیٰ، یا پھر انتہائی ماضی قریب میں پرویز مشرف کا Enlightened Moderation۔ پاکستان میں کوئی بھی قابلِ ذکر حکومتیں بغیر اسلام کا سہارا لیے اپنا قد اونچا نہیں کر پائیں۔ البتہ یہ ایک اور بحث کا موضوع ہے کہ اس اُنچائی پر پہنچ کر، جو کہ مصنوعی اور وقتی تھی، ان افراد کو کتنا نیچے آنا پڑا، ماسوائے قائدِ اعظم کے، جس کی وجوہات بھی کچھ اور تھیں اور پھر جناح انجام دیکھنے تک حیات بھی تو نہیں رہے۔

اب ہم اپنے موضوع کے دائرۂ کار یا حد بندی کی طرف آتے ہیں۔ چونکہ سہ ماہی تاریخ کا یہ مخصوص شمارہ مارشل لاء ادوار پر ہے، چنانچہ مذہب اور طاقت کو لے کر ہم اپنے آپ کو صرف مارشل لاء ادوار تک ہی محدود کریں گے۔ ان ادوار میں بھی ہمارا نقطۂ ارتکاز ایوب

خان کا عہد ہوگا، جس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی وجہ مضمون کی طوالت سے اجتناب ہے اور دوسری وجہ جو زیادہ اہم ہے اس کا ذکر ہم نیچے تفصیل سے کریں گے۔ ساتھ ہی ہم دو دیگر فوجی آمروں، ضیاء الحق اور مشرف، اور اُن کے نظریہ سازوں کا ذکر بھی سرسری طور پر کریں گے۔

ایوب خان اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کیوں؟

جہاں تک ایوب خان کو بحیثیت فوجی آمر کے موضوعِ بحث بنانے کا تعلق ہے تو سب سے پہلے تو یہی بات اہم ہے کہ وہ پہلے فوجی جنرل تھے جنہوں نے سیاست میں طالع آزمائی کی اور اپنی پوزیشن کے دفاع میں مذہب کا استعمال کیا اور آئندہ آنے والے فوجی جنرلوں کے لیے نظیر فراہم کی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تینوں فوجی آمروں میں یہ ایوب خان ہی ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے اہلِ فکر و دانش نمائندوں کے ذریعے بلکہ بذاتِ خود بھی بڑے عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں اپنے اسلامی نظریئے کی وضاحت کی، جس کی مثال اُن کی خود نوشت (۲) سوانح حیات بعنوان *Friends not Masters* (۳) میں جا بجا ملتی ہے۔ تیسری اہم وجہ یہ کہ ایوب خان کے جانے کے چالیس سال بعد بھی اُن کی پالیسیاں، جن میں اُن کا نظریۂ اسلام اور اس کے تحت کی جانے والی قانون سازیاں، خاص طور پر Muslim Family Law Ordinance (۴)، دو متضاد انتہاؤں کا شکار ہیں۔ کچھ لوگ ان کو ایوب خان کا بڑا کارنامہ قرار دیتے ہیں تو بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ حکومتی سطح پر کسی بھی قانون کو اسلام کے نام کے ساتھ جاری نہیں کرنا چاہیے ورنہ اس کا خاتمہ پھر ''نظامِ عدل'' (۵) یا پتہ نہیں مستقبل میں اور کونسے نظام پر ہو۔ چوتھی بات یہ کہ ایوب خان کا طریقۂ حکمرانی عمومی طور پر بھی بعد میں آنے والے جنرلوں کے لیے جو سیاست میں طالع آزمائی کرنا چاہتے ہیں اب تک ایک نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نکتے کی اچھی وضاحت اسی شمارے میں شامل ڈاکٹر روبینہ سہگل کے مضمون بعنوان 'صبحِ بے نور' (۶) میں دیکھی جا سکتی ہے، جس میں اُن کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ اگر نام مٹا دئے جائیں تو پتہ نہیں چلتا کہ جن تقریروں اور تحریروں کا حوالہ دیا جا رہا ہے وہ ایوب خان، ضیاء الحق یا مشرف میں سے کس کی ہیں۔ کیوں کہ وہ رعونت، خود ستائی، خود نمائی اور طمطراق ہر جگہ ایک ہی جیسا ہے جو عموماً آمروں کا وتیرہ ہوتا ہے۔

اب آتے ہیں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی جانب۔ اگر ہم بات فوجی اور فلسفی کی کریں، جو کہ ہمارا اصل موضوع بحث ہے، تو یقیناً ڈاکٹر فضل الرحمٰن ہی وہ شخص ہیں جن کو ہم ''بادشاہ کا فلسفی رہنما'' کہہ سکتے ہیں، کیونکہ وہی صحیح معنوں میں، اسلامی فلسفے میں اپنی باقاعدہ تربیت کی وجہ سے، فلسفی کہلانے کے مستحق ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ اُن کی تعلیمی بنیادوں میں مشرقی اور مغربی علوم کا ایک بہترین امتزاج اور توازن موجود ہے۔ اور کوئی بھی اُن کی اس بات پر گرفت نہیں کر سکتا کہ اُن کی گرفت دونوں میں سے کسی ایک پر بھی ڈھیلی ہے۔ تیسری بات یہ کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے نہ صرف اپنی تحریروں کی سطح پر ایوب خان کے لیے نظریہ سازی کی بلکہ اُنہوں نے ادارہ سازی بھی کی (۷)، اور باقاعدہ اپنی فکر کو اداروں کے ذریعے عملی طور پر آزمانے کی کوشش کی۔ چوتھی بات یہ کہ اگرچہ سیاسی سطح پر اپنے نظریے کو لاگو کروانے میں وہ ناکام رہے مگر اُس نظریے پر سے اور اُس شخص پر سے جو اُس نظریئے کا محرک تھا (یعنی ایوب خان) ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا بھروسہ کبھی کم نہیں ہوا۔ اس کی مثال اُن کی بعد کی تحریروں میں ایوب خان کی تعریف اور بلا مانگے آئندہ آنے والی پاکستانی حکومتوں کو اُن کے مشورے ہیں (۸)۔ اس سلسلے میں پانچویں اور آخری بات یہ کہ جس طرح اُن کے فوجی آمر سرپرست نے اپنے مفاد کی خاطر اُن کو بھینٹ چڑھایا وہ بھی ایک قابلِ عبرت واقعہ ہے، مگر افسوس ہمارے یہاں تاریخ سے سبق سیکھنے کا کوئی فارمولا لاگو نہیں ہوتا، ورنہ کیوں ہر نئے آنے والے آمر کو ایک فلسفی یا مفکر نظریہ ساز ملتا رہتا ہے؟

مختلف مذہبی نمونے (brands) اور اُن کے فوجی معمار:

اس حصّے میں ہم کوشش کریں گے کہ ایوب خان سے آغاز کرتے ہوئے، ضیاء الحق اور پرویز مشرف کے مذہبی نمونوں کا، جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں، ایک مختصر تعارف پیش کریں۔ جہاں تک ایوب خان کا تعلق ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے، اُن کا اسلام کے بارے میں نظریہ سب سے بہتر طور پر اُن کی خود نوشت میں درج ملتا ہے، جو کہ کئی صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں ہم صرف چند نکات کا حوالہ دے کر اُن کے نمونہ اسلام کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

ایوب خان:

اپنی کتاب *Friends not Masters* کے گیارھویں باب بعنوان ''آئین اور نظریہ'' (The

(Constitution and Ideology کے تیسرے حصے صفحہ نمبر ۱۹۷ پر پاکستان کے موجودہ اور مستقبل کے مسائل کے ذیل میں نظریۂ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

اسلامی نظریہ کی وضاحت اور موجودہ زندگی کی صورتِ حال پر اس کا اطلاق، اور خاص طور پر پاکستانیوں کی زندگی پر اس کا اطلاق کرنے کے لیے مندرجہ ذیل وسیع خدوخال کی وضاحت ضروری ہے۔

۱۔ توحیدِ خداوندی، [یعنی] انسان کی یہ خواہش کہ وہ فکر و عمل کے ذریعے خدا سے محبت کا اظہار کرے۔

۲۔ تمام انسان اللہ کے آگے مساوی ہیں۔ چنانچہ بغیر رنگ، نسل، مقام کے افراد کی بنیادی مساوات کا تسلیم کرنا لازم ہے۔

۳۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسے معاشرے میں قومی سرحد بندی کی کوئی جگہ نہیں ہے، پھر بھی وہ لوگ جو ایک مخصوص علاقے میں رہتے ہیں ان پر اس علاقے کے دفاع اور تحفظ اور ترقی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ملک جس میں ہم رہتے ہیں اور جس پر ہماری بقاء کا دارومدار ہے اس کے ساتھ وابستگی انتہائی اہم ہے۔

۴۔ اگر اُوپر درج تمام باتیں مذہب کے عناصر میں شامل ہیں تو پھر مذہب کا عمل دخل دنیاوی/ زمانی (temporal) اور سیکولر دونوں معاملات میں ہے۔ اس کی وضاحت کیسے کی جائے؟

۵۔ یہ دنیا ہمارے لیے تخلیق کی گئی ہے تاکہ ہم اس میں تعمیری اور باثمر زندگی گزاریں۔ یہ اس لیے نہیں تخلیق کی گئی کہ اس سے فرار حاصل کیا جائے۔ تخلیقی قوتوں کی پیدائش اور نشوونما کے لیے جدید تعلیم قطعی طور پر بنیادی ہے۔

۶۔ ریاست اور فرد کی ذمہ داریوں کا تعین لازمی ہے۔ ایک ''مومن'' کی تعریف کیا ہے؟

۷۔ فرد کے لیے بنیادی حقوق کی ایسی وضاحت جو کہ فرد اور ریاست

دونوں کو مکمل طور پر اپنے دائرے میں لیے ہوئے ہو۔

۸۔ موجودہ اور آنے والی نسلوں کو اس فکر سے آگاہی دلانے کے لیے ہمیں کیا طریقہ ہائے کار اپنانے چاہیں؟

۹۔ اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ پاکستان کے لوگ کئی مختلف نسلوں اور مختلف پس منظروں کا ایک مجموعہ ہیں، ان کو، ان کے قومی تفاخر، ثقافتوں، اور روایتوں کو برقرار رکھتے ہوئے ، ایک مکمل وحدت (unified whole) میں کیسے جوڑا جائے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ مندرجہ بالا کو ایک ایسی زبان میں بیان کیا جائے جو ایک بڑے طبقہ آبادی کے فہم میں آسکے اور جس میں یہ بھی صلاحیت ہو کہ اس پر عمل درآمد بھی ہو سکے۔ اس کام کی ذمہ داری کون لے گا؟ میں اس کام کی کوشش نہ کر سکا، کیونکہ میں اپنی حدود سے واقف تھا۔ میں صرف معاشرے میں اتحاد اور توازن کے پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دے سکتا تھا۔ ہمارے لیے یہ لازم آتا تھا کہ ہم اپنے عقیدے کی ضروریات کو وقت کی ضروریات اور دباؤ سے ہم آہنگ کریں۔ کوئی بھی قوم صرف اپنے شاندار ماضی کی بنیاد پر نہ تو جی سکتی ہے اور نہ زندہ رہ سکتی ہے۔"(۹)

بظاہر سادہ سے نظر آنے والے یہ نکات کسی ایسے دل کی آواز دکھائی دیتے ہیں جو قوم کے لئے گہرا درد رکھتا ہو۔ دل کے درد کی گہرائی اور اس کی صداقت کے لئے ثبوت ڈھونڈنا نہ صرف محال ہے بلکہ غیر ضروری بھی۔ مگر یہ بات واضح ہے کہ یہ نکات، جو بظاہر بہت سادہ دیکھائی دیتے ہیں، دراصل ایوب خان کے پورے نظامِ حکومت کا ایک خاکہ (blueprint) ہے۔ ان میں سے چند نکات کی وضاحت ہم یہاں مثال کے طور پر پیش کریں گے۔

اگر اُوپر درج تیسرے اور آخری نکتے پر غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ ایوب خان مذہب کو قوتِ جامعہ (binding force) قرار دیکر پاکستانی قوم کو ایک مکمّل اِکائی بنانے کی جس خواہش کا اظہار فرما رہے تھے اس سے ایک طرف تو مغربی پاکستان کو One Unit (۱۰)

بنائے جانے کے فیصلے کو اخلاقی جواز فراہم کرنا تھا تو دوسری جانب مشرقی پاکستان (بعد کے بنگلادیش) کو اسلام کے نام پر emotionally blackmail کرنا تھا۔

اگر ان نکات کو دیکھا جائے جن میں ریاست اور فرد کی ذمہ داریوں کے تعین کا ذکر کیا گیا ہے تو ان کے تحت ایک ایسا پورا نظام ملتا ہے جس میں طاقت کا ارتکاز ریاست کے استحکام کے نام پر ایک فردِ واحد کی ذات میں کر دیا گیا۔

چوتھے نکتے کے تحت، جس میں مذہب کے دائرے میں عملاً تمام دنیاوی چیزوں کو شامل کرنا مقصود ہے، ان اداروں کے قیام کا جواز حاصل ہو جاتا ہے جو دنیاوی معاملات میں مذہب کی وضاحت کا حق رکھتے ہوں، یعنی ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اور قومی نظریاتی کونسل۔ اور یہی وہ ادارے تھے جو بعد میں آنے والے آمروں کے لیے اپنے اپنے نمونۂ اسلام کی پیداوار کی کارآمد فیکٹریاں ثابت ہوئے۔

ضیاء الحق:

ضیاء الحق اور اُن کے نمونۂ اسلام پر بات کرنے سے پیشتر یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ ۱۹۷۷ء، ۱۹۵۸ء نہیں تھا، یعنی پاکستان کا سیاسی اور بین الاقوامی منظر نامہ اب کافی کچھ بدل چکا تھا۔ اگر جنرل ضیاء الحق کے مخصوص نمونۂ اسلام کے پس منظر کے حوالے سے بات کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بھٹو نے سوشل ازم کے نعرہ سے اپنے عہد کا آغاز کرتے ہوئے نجی اداروں کو سرکاری تحویل میں لینے کا آغاز کیا۔ ارادہ چاہے جو بھی ہو وہ نظام لوگوں کے لیے کچھ خاص نہ کر پایا۔ جبکہ حکمران طبقے نے جدیدیت کے نام پر اپنی ذاتی زندگیوں کا طور طریق بالکل مغربی انداز کا کر لیا۔ اور یہ ایک فطری بات ہے کہ جب آپ کسی ایسے نظام سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں تو پھر اُس میں ہر وہ چیز جو اُس نظام سے جڑی ہوئی ہو آپ کے لیے کوفت کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ ایک مخصوص اعلیٰ طبقے کے اس اندازِ زندگی سے بھی لوگوں نے بیزاری کا اظہار کیا۔ دوسری جانب اپنے آپ کو حکومت کے ایوان میں مزید بٹھائے رکھنے کی خواہش نے بھٹو سے مذہبی جماعتوں کے ساتھ ایسے ایسے سمجھوتے کروائے کہ جس نے مذہبی جماعتوں کی مستقبل میں bargaining position کو بہت مستحکم کر دیا۔

مندرجہ بالا دو ،اور کئی دیگر، مقامی یا اندرونی سطح کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر بھی کچھ ایسے حالات رونما ہوئے جو براہ راست پاکستان کو متاثر کرنے جا رہے تھے۔ ہمارا اشارہ دسمبر ۱۹۷۹ء میں افغانستان پر روس کے قبضے کی طرف ہے۔ یہاں اس واقعے کا حوالہ اس لیے اہم ہے کہ اب بیرونی دباؤ کے تحت جو نمونۂ اسلام کارآمد ہوتا وہ وہی تھا جو جنرل ضیاء الحق نے متعارف کروایا۔ چنانچہ اس پس منظر کے ساتھ اب ہم کچھ بات ضیاء الحق کے نمونۂ اسلام کی، جیسا کے اُنہوں نے خود بیان کیا، کریں گے۔

ہر فوجی آمر کی طرح ضیاء الحق کے لیے بھی یہ ضروری تھا کہ وہ آغاز گزشتہ حکومت کے خلاف الزام تراشیوں سے کریں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ،

> سابقہ حکومت کے یہ عزائم تھے کہ اس ملک میں خانہ جنگی ہو، بھائی بھائی کا گلا کاٹے، گلیوں میں خون بہے، عورتوں، ماؤں اور بہنوں کی عزت کے ساتھ کھیلا جائے اور اس کے بعد ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جائے جس میں وہ اپنی من مانی کر سکیں۔ یہ وہ حالات تھے جن کے ردّعمل کے طور پر لوگوں نے اسلام کا نعرہ لگایا اور برسر اقتدار حکمرانوں کو یاد دلایا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا، لہٰذا یہاں اسلامی نظام نافذ ہونا چاہیئے۔ ان حالات میں فوج نے اقتدار سنبھالا۔ اس وقت اقتدار عوامی نمائندوں کے سپرد کرنا، اسلامی نظام نافذ کرنا اور اس ملک کو ڈکیتی، رشوت ستانی اور دیگر بدعنوانیوں سے پاک کرنا ہمارے مقصد میں شامل تھا۔ عوامی نمائندوں کو اقتدار سپرد کرنے کے لئے میں نے ایک دو کوششیں کی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کو ایسا منظور نہیں تھا۔ شاید اس میں کچھ بہتری تھی۔(۱۱)

اب وہ اپنے نظریۂ اسلام کی جانب آتے ہیں، جو کہ اُن کے یقین کے مطابق سو فیصدی درست اسلام ہے۔ وہ کہتے ہیں،

> آج سے چار سال پہلے جب مارچ ۱۹۷۷ء میں اس ملک میں تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ چلی تو اس کا مقصد کیا تھا؟ اس کا مقصد اسلامی نظام کا نفاذ تھا۔ یہ تحریک اس زمانے کی چلی ہوئی ہے اور جب تک یہ تحریک اللہ تعالیٰ کے

فضل وکرم سے کامیابی کے مراحل طے کر کے اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ جاتی، یعنی جب تک اس ملک میں مکمل طور پر اسلامی نظام نافذ نہیں ہو جاتا، میرا اور آپ کا فرض پورا نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں آپ نے بہت کچھ سُنا ہوگا، لیکن میں اس کو سیاسی عزائم کے حصول کے لئے استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ میں آپ کو اپنے دِل کی آواز سنا رہا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ اس دل کے ساتھ پاکستان کے آٹھ کروڑ عوام کے دل بھی اُسی طرح دھڑکتے ہیں جس طرح میرا دل دھڑک رہا ہے۔ (۱۲)

ایوب خان کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بھی ہم نے کہا تھا کہ دل کے معاملات سے ہمیں سروکار نہیں مگر ذرا یہ تو دیکھا جائے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے اس ڈھول کو پیٹتے چار سال گزر جانے کے بعد بھی وہ اس پر عمل درآمد کے لئے کتنے مستعد اور کوشاں نظر آتے ہیں۔ مندرجہ بالا ارشادات کے تھوڑا آگے چل کر کہتے ہیں،

اسلامی نظام کو دو طرح سے نافذ کیا جا سکتا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اس کے لئے اپنے پڑوسی ملک (ایران) کی طرح انقلابی اقدام کریں اور کلّی طور پر اسلامی نظام کے نفاذ کا اعلان کر دیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے ایک منصوبے کے تحت بتدریج رائج کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس مقصد کے لئے بتدریج کام کرنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی ان مٹھی بھر عناصر کا قلع قمع کرنے کی ضرورت ہے جو اس نظام کے خلاف کاروائی کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ ہماری منزل نفاذِ اسلام ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے میرے رفقائے کار (۱۳) اور آپ حضرات سب مشترکہ طور پر کام کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میری ملاقات پاکستان کے سینتالیس جیّد علماء کے ساتھ ہوئی۔ یہ ملاقات ساڑھے تین گھنٹے جاری رہی۔ اس میں اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جب تک رضائے الٰہی ہمارے شامل حال نہیں ہوتی، ہم اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ ہم

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے نہایت دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیں کیونکہ انسان سب سے پہلے اسلام کو انفرادی طور پر اپنے اوپر نافذ کرتا ہے، پھر اپنے دائرۂ اختیار میں یعنی اپنے گھر اور اپنے خاندان میں اسے نافذ کرتا ہے۔ لہذا کونسلر صاحبان سے میری درخواست ہے کہ وہ اپنی اپنی کمیٹیوں اور اپنے اپنے علاقوں میں اسے نافذ کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ وفاقی طور پر اسے نافذ کرنے کے لئے حکومت ضروری کاروائی عمل میں لائے گی۔ مجھے اُمید ہے کہ پاکستان کا ہر شہری اور ہر مسلم پاکستانی اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے گا (۱۴)۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں نظر آنے والے دو غلے پن اور تضادات اتنے واضح ہیں کہ ان پر تبصرہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ لیکن ہم نے ان اقتباسات میں اُن مقامات کو italics میں نمایاں کیا ہے، جہاں ضیاء صاحب نے رضائے الٰہی پر اپنے پختہ عقیدہ کا اظہار فرمایا ہے۔ اور پھر یوں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیّت کا اظہار کر ہی دیا اور ضیاء صاحب فضا میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئے۔

پرویز مشرف:

اب تک کی پاکستان کی تاریخ کے آخری فوجی آمر، پرویز مشرف، نے بھی ایوب خان کی طرح اپنی خودنوشت سوانح عمری تحریر کی جس کا عنوان ہے *In the Line of Fire* (۱۵)۔ چونکہ پرویز مشرف کے عہد میں پاکستان عالمی قوتوں کے لئے انتہائی مرکزی حیثیت کا حامل ملک بن چکا تھا اور ہر طرح کی بیرونی مداخلت کا میدان بھی، اور نام نہاد دہشت گردی کے خاتمے اور دنیا کو ان شیطانی قوتوں سے پاک کرنے کے لئے پاک سرزمین استعمال ہو رہی تھی (جو کہ ابھی بھی ہو رہی ہے)، چنانچہ پرویز مشرف کے نمونۂ اسلام کی نوعیت ذرا مختلف اور دائرۂ نظر و اثر بھی ذرا وسیع ہے۔ اپنی سوانح کے ۲۸ ویں باب، بعنوان "International Diplomacy" کے آغاز میں 9/11 کے بعد دنیا پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے اور جس کی وجہ سے دنیا لوگوں کے رہنے کے

لئے اب محفوظ جگہ نہیں رہی، پھر عراق پر امریکی جنگ کے مسلط ہونے کے اس سارے ماحول اور اس کے اثرات پر غور کرنے میں جس طرح اُن کی راتوں کی نیندیں جاتی رہی تھیں، ان کا ذکر کرنے کے بعد انکشاف کرتے ہیں کہ اس کم خوابی (اور شاید کم خورا کی بھی) کے دوران کسی ولی اللہ کی طرح ایک رات ان پر اپنے اس نظریہ Enlightened Moderation کا نزول ہوا۔ چنانچہ کہتے ہیں،

> ایک رات جب میں اپنے کمرۂ مطالعہ میں ان تمام معاملات پر غور وفکر کر رہا تھا تب مجھ پر تصورِ Enlightened Moderation کا وُرود ہوا۔ تشدد کو روکنے کے لئے ہمیں عالمی سطح کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ اسلامی دنیا میں طلاطم بنیادی طور پر اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ وہاں پر طویل المدت غیر حل شدہ تنازعات موجود ہیں جنہوں نے عوام میں ناانصافی، علحدگی، محرومی، بے بسی اور نا اُمیدی کے احساسات کو جنم دیا ہے۔ اس صورتِ حال میں مزید خرابی اس حقیقت سے بھی پیدا ہوئی ہے کہ ہر سطح پر مسلم معاشرہ میں دنیا کی سب سے کمتر صحت مند سماجی صورتِ حال ہے۔ سیاسی محرومی نے، اگر اس کو غربت اور جہالت کے ساتھ جوڑ دیا جائے، ایک دھماکہ خیز انتہا پسندی اور دہشت گردی کا ابال پیدا کیا ہوا ہے۔ مسلم معاشرے اگر آزادی اور اس صورتِ حال سے چھٹکارا چاہتے ہیں تو ان کو لازماً دہشت گردی اور انتہا پسندی کو خیر باد کہنا ہوگا۔ مگر ساتھ ہی بعض سیاسی نزاع، جن کے منصفانہ حل کا مطالبہ کئی ممالک کر رہے ہیں ان کی طرف توجہ دینا بھی لازم آتا ہے۔
>
> Enlightened Moderation ایک دو شاخہ (two prong) حکمتِ عملی ہے، جس پر میرا پورا ایمان ہے کہ یہ ایک کامیاب (win-win) حکمتِ عملی ہے۔ ایک شاخ: مسلم دنیا پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اندرونی سماجی، معاشی ترقی پر بھرپور توجہ کرنے کے لئے دہشت گردی اور انتہا پسندی کا رد کرے۔ دوسری شاخ: عمومی

طور پر مغرب اور خاص طور پر امریکہ، پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا تمام وزن اس طرف ڈال دیں کہ تمام متنازعہ سیاسی معاملات کے، جن کے مسلم معاشرے شکار ہیں، منصفانہ حل تلاش کئے جائیں۔ دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف انصاف کیا جائے بلکہ وہ ہوتا ہوا نظر بھی آئے۔ بین الاقوامی بھونچال کے قلب میں فلسطین کا تنازعہ کھڑا ہوا ہے، جیسا کہ غیر واضح کشمیر کا مسئلہ بھی، ان کا فوری حل لازمی ہے، اگر جنوبی ایشیا میں پائیدار امن کی چاہت ہے تو (۱۶)۔

اس سلسلے میں مسلم دنیا پر اپنے نظریہ کے اثرات کے لئے اپنی کوششوں کا ذکر کرنے اور ان کامیابیوں پر مسرّت اور تفاخر کا اظہار کرنے کے بعد پرویز مشرف اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے ان کے نظریئے کو سمجھنے میں غلطی کی اور اس کا غلط مطلب نکالا۔ وہ کہتے ہیں،

کچھ تخفیفی/ پھرے ہوئے عناصر Enlightened Moderation کا غلط مطلب لیتے ہیں، اور اس کی روح کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں، اور تنقید کرتے ہیں کہ یہ روایتی اسلامی فکر کی ایک بگڑی ہوئی توجیہ ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ مجھے اس بات کا کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ میں ایک اسلامی مفکر ہوں، مگر میں ایک مسلمان ہوں اور میں اپنے اندر اسلام کی حقیقت اور روح کو سمجھتا ہوں، اگر چہ فکری سطح پر میں اس کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوں (مگر پھر کون اس کا دعویٰ کر سکتا ہے؟) (۱۷)۔ بہر حال، Enlightened Moderation کا اسلام اور اس کی تعلیمات سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اس کا زیادہ تعلق مسلمانوں اور ان کی خود مختاری سے ہے (۱۸)۔

ایک اور مقام پر ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

بھٹو نے ایک جمہوریت پسند کی طرح نہیں بلکہ ایک مطلق العنان آمر کی طرح حکومت کی۔ اس نے اپنے کئی مخالفین، جن میں ایڈیٹر، صحافی، یہاں تک کہ کارٹونسٹوں، کو بھی جیل میں پھنکوا دیا۔ وہ حقیقتاً ایک فاشسٹ

تھا---ایک انتہائی ترقی پسند نعرے کو رجعت پسند مقاصد کے لئے استعمال کیا، جس میں سرِ فہرست اُس کا اپنے اقتدار کو طول دینے کی کوشش کرنا تھا۔۔۔۔میں اب بھی اس بات کو مانتا ہوں کہ اُس نے دیگر تمام کے مقابلہ میں ملک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، ایسا نقصان جس سے ہم اب تک پوری طرح باہر نہیں نکل سکے۔ دیگر چیزوں کے علاوہ، یہ پہلا شخص تھا جس نے مذہبی دائیں بازو کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ اس نے شراب اور جوئے پر پابندی عائد کی اور بجائے اتوار کے جمعہ کی ہفتہ وار تعطیل کا اعلان کیا۔ یہ دوغلے پن کی انتہا تھی، کیونکہ ہر کسی کو معلوم تھا کہ ان میں سے کسی پر بھی اُس کا ایمان بالکل نہیں تھا(۱۹)۔

یہاں اس حوالے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی بحث کا رخ بھٹو کی طرف موڑ دیں اور نہ ہی یہ ہمارے پیشِ نظر ہے کہ ہم اُن کا دفاع کریں، ان پر بحث الگ سے ہوسکتی ہے اور کافی حد تک ہوئی بھی ہے۔ مگر جس شخص کے قلم سے یہ جملے نکلے ہیں اُس کے لئے فوری طور پر ذہن میں انگریزی کی یہ کہاوت آتی ہے کہ Look who is talking۔ یہاں ہمارا جی چاہتا ہے کہ روبینہ سہگل سے مستعار لیتے ہوئے کہیں کہ اگر نام ہٹا دیا جائے تو جو کچھ مشرف صاحب نے دوسروں کے لئے فرمایا ہے وہ اُن پر سب سے زیادہ صادق آتا ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ مشرف ہمارے اتنے قریب ماضی کا حصہ ہیں کہ ہمیں اپنے اس دعویٰ کی وضاحت میں کچھ کہنے کی بھی ضرورت نہیں۔

۲

ایوب خانی عہد میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا کردار:

اُوپر کے صفحات میں ہم نے ایوب خان کے نظریۂ اسلام کی مختصر وضاحت کی اور دیکھا کہ وہ ایسے اشخاص کی تلاش اور ایسے اداروں کی تشکیل کا ارادہ رکھتے تھے جو اُن کے لئے اسلام کی جدید تعبیر پیش کریں۔ اب ذرا ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ خود ڈاکٹر فضل الرحمٰن، جو اُس وقت کینیڈا کی میکگل یونیورسٹی میں ایک معلم کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، پاکستان کی اُس

وقت کی صورتِ حال اور ایوب خان کے نظریئے کے بارے میں کیا خیالات رکھتے تھے؟ اپنے بعد کے ایک مضمون میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں،

> جب ایوب خان نے اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ایک فوجی بغاوت کے ذریعے پاکستان کا اقتدار سنبھالا تو موجودہ آئین، جو ۱۹۵۶ء میں جاری ہوا تھا، منسوخ کر دیا گیا۔ ابھی نئے آئین کے بننے کا عمل جاری تھا کہ ایوب خان کی حکومت نے ۱۹۶۰ء میں [دارالحکومت] کراچی میں مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی قائم کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایوب خان عوام کی اُس خواہش سے متاثر ہوئے تھے کہ، اس حقیقت کے باوجود کہ پاکستان کے عوام اسلام سے مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں، اگر اسلام کو اس کی ریاستی۔ بنیاد والے مقام سے ہٹا دیا گیا تو نہ صرف یہ کہ یہ پاکستان کے قیام کے اعلانیہ مقصد کے متضاد ہوگا بلکہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا ساتھ رہنا بھی مشکل ہو جائے گا، کیونکہ اسلام سے وابستگی کے علاوہ، لسانی اور ثقافتی طور پر اُن دو حصّوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ایوب خان پاکستانی قومیت کی بنیاد کے طور پر اسلام کی اہمیت کے زیادہ سے زیادہ قائل ہوتے گئے (۲۰)۔

گویا کہ یہ پاکستان کی وہ صورتِ حال تھی جس میں ایک فوجی آمر اسلام کو پاکستانی قومیت کی بنیاد بنانا چاہتا تھا۔ لیکن بقول ڈاکٹر فضل الرحمٰن،

> بہر حال، یہ بات بھی واضح تھی کہ صرف اسلام کے نام سے ہی ایک مثبت قومیت کا قیام نہیں ہو سکتا تھا، چہ جائیکہ ایک ترقی یافتہ قومیت کا، جب تک اس کو نیا مواد، سماجی پالیسیوں اور قانونی کاروائیوں کے ذریعے، فراہم نہیں کیا جاتا۔ یہ کہنا چاہیئے کہ، یہ بات واضح تھی کہ اس قسم کا مواد کامیابی سے فراہم کر دیا جاتا اور اُس کو قبولیت حاصل ہو جاتی تو نہ صرف اسلام پاکستانیوں کے لئے ایک حقیقی جوڑنے والی قوت بن سکتا تھا، بلکہ اس سے ترقی کے لئے ایک وسیع قوت کے پیدا ہونے کا بھی امکان تھا۔ مگر اگر

کہیں یہ فراہم نہیں کیا جاتا یا اس کو قبولیت حاصل نہ ہو پاتی تو اسلام بحیثیت ریاست کی بنیاد کے ایک مصیبت(disaster) ثابت ہوسکتا تھا۔ مواد کی فراہمی ایک فکری کام تھا، اُس پر کامیابی سے عمل درآمد کروانا ایک نازک اور مصمم پالیسی کا سوال تھا(۲۱)۔

اُوپر درج ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے بیان سے واضح ہے کہ جبکہ مواد کی فراہمی ایک فکری کام تھا، اس پر کامیابی سے عمل درآمد کا تعلق پالیسی سازی سے تھا۔ اُن کو دونوں ہی حیثیتوں میں اپنا کردار ادا کرنا پڑا، وہ کہتے ہیں،

میرے اگست ۱۹۶۲ء میں مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے ڈائریکٹر بننے کے فوراً بعد ہی ایک اور ادارہ قائم کیا گیا، اسلامی نظریاتی مشاورتی کونسل، جس کے ساتھ مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی جزوی طور پر نتھی تھا، کیونکہ کونسل پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی تھی کہ وہ اسلامی پالیسیوں اور قانون سازی کے لئے مخصوص تجاویز پیش کرے جبکہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کا اصل کام اسلام کی عقلی اور سائنسی حوالوں سے توجیہ پیش کرنا تھا، تاکہ جدید ترقی یافتہ معاشرے کی ضروریات کا ساتھ دیا جاسکے(۲۲)۔

ابراہیم موسیٰ ان دونوں حیثیتوں میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے کردار کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں،

اس مرکزی حیثیت میں اُن کو ایک فلسفی - بادشاہ (philosoper-king) کا کردار ادا کرنا تھا۔ اب اُن کو پاکستان میں مذہب اور معاشرہ پر اثر انداز ہونے والے سخت حقائق، گنجلک فکری اور سیاسی مسائل کا سامنا تھا۔ مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی میں فکری کام کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کو مشاورتی کونسل کے لئے پالیسیاں بھی تجویز کرنا تھیں، جس پر کہ عمل درآمد ہوتا۔ بعض حساس قانونی اور مذہبی مسائل جن میں فضل الرحمٰن کو حصّہ دار بننا پڑا وہ تھے، بینک کے سود کی حیثیت، زکوۃ، مشین کے ذریعے جانوروں کا ذبح، عائلی قوانین، اور آبادی منصوبہ

بندی، رسول اللہؐ کی حدیث اور سنت کا مقام اور وحی کی نوعیت وغیرہ (۲۳)۔

ہمارا خیال ہے کہ ان مسائل کی تفصیل میں جانا اس مضمون کے دائرے سے باہر ہوگا، چنانچہ ہم اب صرف ان سیاسی اور مذہبی تنازعات پر بحث کریں گے جن میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن اپنے منصب اور اپنی حیثیت کی وجہ سے گھسیٹے گئے۔

مرکزی ادارہ تحقیاتِ اسلامی سے وابسطہ ہونے کے بعد ڈاکٹر فضل الرحمٰن پابندی سے وہاں سے جاری ہونے والے انگریزی تحقیقی مجلّہ *Islamic Studies* میں پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے حوالے سے معاملات اور مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اُن کے جوشِ اسلام نے اُس وقت کے پاکستانی سیاست اور معاشرت کے تمام مسائل کے حل قرآن میں تلاش کر لئے۔ چنانچہ اُن کے اُس عہد کے چند مضامین کے عنوانات تھے،

"The Qur'anic Solution of Pakistan's Educational Problems", "Implementation of the Islamic Concept of State in the Pakistani Milieu", "Some Reflections on the Reconstruction of Muslilm Society in Pakistan", "Currents of Religious Thoughts in Pakistan", etc.

اُن کے سیاست میں گھسیٹے جانے میں اُن کی اردو تحریروں نے اہم کردار ادا کیا۔ مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی نے ۱۹۶۲ء میں فکر و نظر کے نام سے ایک اردو ماہنامہ کا بھی اجرا کیا۔ نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے انگریزی مضامین کے تراجم اس رسالہ میں پابندی سے شائع ہوئے بلکہ اُنہوں نے خود بھی اردو میں کئی مضامین تحریر کر کے شائع کروائے۔ اور یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ اُن کے یہ اردو مضامین صرف تحقیق کی غرض سے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ ان کے عنوانات اور ان میں اُن کا اندازِ تحریر سرکاری نقطہ نظر کے پروپیگنڈے کے عکّاس تھے۔ اس کی مثال یہاں پر ہم صرف اُن کے ایک مضمون کے حوالے سے پیش کریں گے۔

یہ بات تاریخ کے صفحات میں موجود ہے کہ ایوب خان اپنی فوجی بغاوت کو انقلاب سے تعبیر کرتے تھے اور ہر سال اس کی یاد میں یومِ انقلاب منایا جاتا تھا۔ جب ۱۹۶۴ء میں یہ دن

منایا جارہا تھا تو اُس وقت خاص بات یہ تھی کے ملک بھر میں ۱۹۶۵ء کے انتخابات کی تیاریاں زوروں پر تھیں اور سرکاری طور پر ہر سطح پر کوشش ہو رہی تھی کہ اس انقلاب کے ثمرات کو یاد کروا کر عوام کو اس نظام، یعنی ایوب خان کی حکومت، کو جاری رکھنے پر آمادہ کیا جائے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا پکا عقیدہ تھا کہ اُس وقت ایوب خان کی پالیسیوں کے ثمرات حاصل کرنے کے لئے تسلسل کا جاری رہنا نہایت ضروری تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مضمون بعنوان ''پیامِ انقلاب'' کا آغاز، جو اس انقلاب کی یاد کو منانے کے موقع کی مناسبت سے تھا، لوگوں کو اُس بھیانک صورتِ حال کو یاد دلا کر کرتے ہیں جو اس انقلاب سے پہلے ملک میں تھی۔ وہ کہتے ہیں،

> یہ غیر ضروری بلکہ تکلیف دہ ہوگا کہ اس طویل بے سروپا سیاسی شعبدہ بازی کا جائزہ لیا جائے جو اس دور سے پہلے دنیا کے سامنے پیش کی جاتی رہی ہے۔ اور جس کا نتیجہ اندرون خانہ انتشار اور بدنظمی کی صورت میں برآمد ہوا اور باہر کی دنیا میں ہمارا وقار روز بروز گرتا گیا (۲۴)۔

اب اس انقلاب کے ثمرات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں،

> انقلاب اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ہمارے مخالف ہمسایوں نے بھی ''ایک صحت مند علامت'' تسلیم کیا ہے۔ اور اب تو ایسی باتیں عام سننے میں آرہی ہیں کہ ''باہر کی دنیا میں ہمارا وقار بڑھ گیا ہے''، ''ہم نے ہر شعبۂ حیات میں ترقی کی ہے''، ''ملک اب ترقی کی راہ پر گامزن ہے''، وغیرہ (۲۵)۔

پچھلے نظام کی خرابیاں گنوانے اور نئے نظام کی برکات کا ذکر کرنے کے بعد اب ڈاکٹر فضل الرحمٰن اپنے اصل مدعا پر آتے ہیں، جو کہ استحکام پر زور دینا ہے، وہ کہتے ہیں،

> اس انقلاب اور اس سے پیدا شدہ سیاسی استحکام کے ثمرات حقیقتاً بہت زیادہ ہیں اور توقعات اس سے بھی قوی تر ہیں بشرطیکہ یہ سیاسی استحکام جاری رہے۔ تعمیرِ نو کا جو کام ہمیں درپیش ہے وہ اس قدر وسیع اور عظیم ہے کہ اس کے پیشِ نظر سیاسی استحکام سے کھیلنا خود اپنی زندگی سے کھیلنا ہے۔ سیاسی استحکام اسلامی طور پر ''واجب'' کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ قرآن کریم مضبوط انتظامی مرکز کا حکم یونہی نہیں دیتا اور وہ تفرقہ اور انتشار کے

خفیف سے خطرے کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں (۲۶)۔

قاری اس بات پر حیرت کرنے میں حق بجانب ہونگے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے پائے کا ایک محقق و مفکر ایک فوجی آمر سے وفاداری برتنے میں اتنا آگے بڑھ گیا۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ بات صرف وفاداری کی نہیں تھی، خود ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے اپنے کتنے ارادے اور منصوبے ابھی تکمیل کی منزل تک پہنچنا باقی تھے، جس کا دارومدار استحکامِ حکومت پر تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ مناسب مقام ہے جہاں ہم اُن مذہبی رسالوں اور جریدوں، زیادہ تر ماہواروں، کا ذکر کریں جن کے ساتھ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے مباحث مستقل بنیادوں پر ہوتے رہے اور جنھوں نے مستقل طور پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تحریروں کو تنقید کا نشانہ بنایا، کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ رائے عامہ کو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے خلاف کرنے اور حکومت پر اُن کی برطرفی کے لئے دباؤ ڈالنے میں ان کا نمایاں کردار تھا۔

مگر ان رسالوں اور جریدوں پر بات کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ جب حکومت نے ریاستی سطح پر اسلام کے ایک خاص نمونے کو متعارف کروانے اور فروغ دینے کا آغاز کیا اور اس کے لئے اداروں اور پرنٹ میڈیا کو استعمال کیا تو وہ طبقہ جو مذہبی توجیہہ پر اپنی اجارہ داری سمجھتا تھا اور جس کے دائرۂ اختیار پر ضرب پڑ رہی تھی اب اس نے بھی اس حملے کا جواب اور اپنے مقام و منصب کو مستحکم کرنے کے لئے وہی ذریعے استعمال کئے۔ چنانچہ، ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں کئی نئے مذہبی رسالے اور جریدے جاری ہوئے، سرکاری نقطۂ نظر کی مخالفت کی غرض سے۔

اگرچہ ملک کے چھوٹے بڑے سب ہی مذہبی رسالوں اور جریدوں نے اس کام میں حصّہ لیا مگر ہم یہاں چھ منتخب رسالوں کا ہی ذکر کریں گے اور دورانِ تفصیل ان کے انتخاب کے اسباب پر بھی روشنی ڈالیں گے۔

ان چھ میں سے تین وہ ہیں جن کی اشاعت کافی عرصے سے جاری تھی، گویا کہ یہ پرانے رسالے تھے۔ ترجمان القرآن اور چراغِ راہ، جو پاکستان کی سب سے منظم اور متحرّک مذہبی جماعت، جماعتِ اسلامی کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان میں سے اول کی اشاعت ۱۹۳۲ء میں (۲۷) اور ثانی کی ۱۹۴۸ء سے ہونا شروع ہوئی۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن اپنے عہدِ طالب

علمی ہی میں جماعت کے سربراہ مولانا مودودی سے رابطے میں آئے اور اُنہوں نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو جماعت سے وابستہ ہونے کی پیش کش بھی کی، جو ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے معذرت کے ساتھ مسترد کردی۔ مگر مولانا مودودی اُن چند شخصیات میں سے ایک ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تمام قابلِ ذکر تحریروں میں ہوا ہے۔ اس کی چند وجوہات جو ہمیں سمجھ میں آئی ہیں وہ یہ ہیں، (۱) مولانا مودودی اُس مذہبی۔ سیاسی نظریے کے نمائندہ تھے جس کے پیچھے چلنے والوں کی ایک قابلِ ذکر تعداد، جو زیادہ تر متوسّط شہری خواندہ لوگوں پر مشتمل تھی اور جن کو روایت پرست علماء کے مقابلے میں مولانا مودودی کی توجیہات زیادہ پر اثر محسوس ہوتی تھیں، پاکستان میں موجود تھی، (۲) مولانا مودودی نے اپنی ساکھ دیگر اسلامی ممالک میں بھی منوالی تھی، اس طرح گویا ان کی پہچان اور اثرات پاکستان کی سرحدوں سے ماورا ہو گئے تھے، (۳) مولانا مودودی کے مذہبی اور سیاسی خیالات میں وقت کے ساتھ ساتھ انتہائی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں اور کئی معاملات پر اُنہوں نے قلابازیاں بھی کھائیں تھیں، (۴) مولانا مودودی ایک زود نویس مصنّف تھے اور اُن کی کتابیں، خصوصاً پمفلٹوں کی شکل میں، عام پڑھے لکھے پاکستانی کے زیرِ مطالعہ تھیں، (۵) زیرِ بحث دور میں مولانا مودودی خاص طور پر ایوب خان کی پالیسیوں کے ایک ناقد کی حیثیت سے نمایاں ہوئے تھے اور حکومت کی کھنچائی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، (۶) سب سے بڑھ کر یہ کہ برِصغیر کے مسلمانوں کے ایک بنیاد پرست نمائندے کی حیثیت سے اب مستشرق بھی مولانا مودودی کو سنجیدگی سے لینے لگے تھے۔

مگر جہاں تک مندرجہ بالا دو رسالوں کا تعلق ہے وہ کبھی بھی ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے زیرِ بحث معاملات میں سنجیدہ مباحث میں نہیں شامل ہوئے۔ اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے بقول (۲۸) وہ صرف سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لئے ان مسائل کو سرکار کے خلاف پروپگنڈے کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ اور اس کے باوجود بھی کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے کئی بار مولانا کو دعوت دی کہ وہ ان معاملات میں منطقی استدلال کے ساتھ اپنا موقف پیش کریں، مولانا مودودی صرف وعدے ہی کرتے رہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب اسلام (۲۹) کے حوالے سے تنازعہ وہ واحد موقعہ تھا کہ جب ان رسالوں نے تبصروں اور تجزیوں کی صورت میں اس پر بحث کی، اور وہ بھی ہمارا یقین ہے کہ، سیاسی فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے۔

پاکستان کے مذہبی سیاسی پس منظر میں تیسرا قدیم ترین اور قابلِ ذکر رسالہ غلام احمد پرویز کا طلوعِ اسلام ہے، جس کا اجراء ۱۹۳۸ء سے دھلی سے ہوا۔ ایوب خان کے دورِ اقتدار میں یہ ایک عام تاثر تھا کہ غلام احمد پرویز کو سرکار کی مکمل حمایت حاصل ہے، اور چونکہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن بھی سرکاری فکر کے نمائندے تھے لہٰذا اکثر معاملات میں دونوں کے خیالات میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی، تاہم بعض معاملات، خاص طور پر حدیث اور سنتِ نبویؐ کی حیثیت کے مسئلہ پر دونوں میں شدید اختلافات تھے، جن کا اظہار دونوں کے نمائندہ رسالوں میں ہوتا تھا۔

دیگر تین رسائل و جرائد ذرا بعد کی اشاعتیں ہیں۔ البینات کا اجراء ۱۹۶۲ء میں، الحق کا اکتوبر ۱۹۶۵ء میں، اور البلاغ فروری ۱۹۶۷ء کو ہوا۔

البلاغ کا اجراء اگرچہ کافی دیر میں ہوا اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ساتھ وہ صرف ایک ہی سال بحث میں الجھا رہا مگر اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس کے اجراء کے پیچھے ملک کی ایک نہایت ہی اہم مذہبی شخصیت، مولانا محمد تقی عثمانی کی، موجود تھی، اور اس کے سرپرستِ اعلیٰ اُن کے والد مفتی محمد شفیع تھے۔ مولانا تقی عثمانی سیاسی اور مذہبی معاملات میں اپنے فتوؤں کے لئے مشہور تھے۔ وہ اس رسالے میں مستقل بنیادوں پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تحریروں پر تبصرہ اور تنقید کرتے رہے۔

الحق کی اہمیت ہمارے نزدیک یہ ہے کہ وہ مستقل بنیادوں پر فکر و نظر کے ساتھ بحث و مباحث میں الجھا رہا۔ اپنے اجراء، ۱۹۶۵ء، کے بعد شاید ہی کوئی ایسا شمارہ ہوگا جس میں الحق نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن یا فکر و نظر کی کسی بحث پر اپنی آرا کا اظہار نہ کیا ہو۔

اس سلسلے کا آخری، مگر سب سے اہم، رسالہ البیّنات ہے۔ جہاں تک زیرِ بحث عہد اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا تعلق ہے اس رسالے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ اس رسالے نے مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اور اس کے شائع شدہ مواد کو نہایت سنجیدگی سے لیا۔ یہ بڑے منظم طریقہ سے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تحریروں پر تبصرہ کرتا اور اُس کا جواب دیتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ کہ اس رسالے سے وابستہ افراد روایت پرست گروہ کے نمائندہ خاص تھے، جن کا مرکز مدرسہ بنّوری ٹاؤن، کراچی تھا۔ اس کے دو نمائندوں، علامہ یوسف بنّوری اور علامہ محمد ادریس کی پاکستان بھر میں معتقدین کی ایک بڑی تعداد تھی۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے بھی ان کے ساتھ بحث و مباحثہ کو سنجیدگی

سے لیا اور اُنہوں نے شعوری کوشش کی کہ ان کو اعتماد میں لیں اور اپنے نظریہ کے قریب لائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے علامہ یوسف بنوری سے خود کئی ملاقاتیں کیں اور عین ممکن تھا کہ دونوں اداروں کے درمیان تعاون کا کوئی سمجھوتا طے پا جاتا، مگر مختلف وجوہات کی بنا پر، جس میں نظریات کا فرق اور عدم اعتماد سرِ فہرست تھے، ایسا نہ ہو سکا۔

ان تمام تنقیدوں کے جواب میں مارچ ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے ایک انگریزی مضمون تحریر کیا جس کا عنوان تھا "Currents of Religious Thought in Pakistan" (۳۰)۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا کہنا تھا کہ بنیادی المیہ یہ تھا کہ جدید بین الاقوامی برادری میں شریک ہونے کی وجہ سے حکومت کو اُس کے تقاضے پورا کرنا لازم تھے، مگر دوسری جانب مذہبی گروہ نے ابتدا ہی سے یہ واضح کر دیا تھا کہ ان کا اسلامی ریاست چلانے کا تصور ساتویں صدی کی اسلامی ریاست کے جیسا ہے۔ چنانچہ ان روایت پرستوں پر تنقید کرتے ہوئے فضل الرحمٰن کہتے ہیں،

> روایت پرست نہ صرف جدید دنیا کے تقاضوں سے ناواقف ہے بلکہ وہ اپنے تاریخی ورثے سے بھی غافل ہے، ماسوائے چند کتابوں کے جو وہ پڑھتا ہے۔ چونکہ اس کے اندر تاریخی سوچ پیدا نہیں ہوئی وہ کوئی منظم تحقیق نہیں کرتا اور جب کبھی اسے کسی سوال کا سامنا ہوتا ہے وہ ان معیاری کتابوں سے رجوع کرتا ہے--اور وہ بھی بغیر تاریخی ترتیب کا لحاظ کیے--اور جواب دیتا ہے (۳۱)۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا خیال تھا کہ چونکہ حکومتیں ان منظم مذہبی قوتوں سے مایوس ہو چکی تھیں، اُنہوں نے مشوروں کے لئے دیگر اردگرد موجود مفکرین کا رخ کیا مثلاً خلیفہ عبدالحکیم (م۔۱۹۵۹ء)، جو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور کے ڈائریکٹر تھے، غلام احمد پرویز (م۔۱۹۸۵ء)، جو کہ ایک ریٹائرڈ سول سرونٹ تھے، اور عشروں تک اردو مذہبی ماہنامے طلوعِ اسلام کے ایڈیٹر رہے تھے۔ پاکستان کے معروضی حالات میں مولانا مودودی سے پرویز کے کردار کا موازنہ کرتے ہوئے فضل الرحمٰن کہتے ہیں کہ پرویز نے اپنے اطراف تعلیم یافتہ افراد اور سرکاری ملازمین کا ایک حلقہ اکٹھا کر لیا تھا، جو پرویز کی توجیہِ اسلام کو موجودہ حالات کے تقاضوں

سے زیادہ ہم آہنگ پاتے تھے۔

اسی مضمون میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن تخلیقی صلاحیت رکھنے والے محققین اور مفکرین کے لئے مواقع کی عدم دستیابی کا گلہ بھی کرتے ہیں۔ اور اگر ہم اس مضمون کے لکھنے کے وقت، یعنی مارچ ۱۹۶۸ء، کو مدِ نظر رکھیں تو اس مضمون میں ہمیں اُس صورت حال کا اندازہ کرنے میں وقت نہیں لگے گا جس سے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن دوچار تھے اور جو بالآخر چھ ماہ بعد اُن کے استعفے کی صورت میں منظرِ عام پر آئی۔ وہ کہتے ہیں،

> یہ راستہ آسان نہیں ہوگا۔ طویل المدت روایتیں، خاص طور پر فکری عادات کی شکل میں، آسانی سے فکر کے نئے رجحانات اور نئے رویوں کے حق میں دست بردار نہیں ہوتیں۔ یہ ایک فطری امر ہوگا کہ ہر طرح کی قدامت پسند اور بنیاد پرست قوتیں بنیادی نئی ترقی کے خلاف ایک ہو جائیں، اور اُس پر اسلام سے بے دینی کا الزام عائد کریں۔ تاریخ میں موسسین کے راستے کبھی پھولوں سے سجے نہیں ہوتے، لیکن اصلاح اور ترقی کی قوتوں کی بھی اپنی مساوی منطق اور رفتار ہوتی ہے، جو زندگی کے بنیادی خمیر سے پیدا ہوتی ہے، اور قدامت پسندوں اور احیاء پرستوں کی مخالفت کے ذریعے اس کا گلا نہیں گھونٹا جا سکتا۔ آئندہ کچھ وقت میں ایک امکانی طور پر سخت کشمکش رہے گی، جو کہ فکر میں تبدیلئ کے حوالے سے ہر جگہ ایک ہی کیفیت کی علامت ہے (۳۲)۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا سطور میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن اپنے آپ سے مخاطب ہوں اور اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ تاہم اُن کا یقین تھا کہ حتماً فیصلہ اسلامی جدیدیت کے حق ہی میں ہوگا، چنانچہ وہ مضمون کا اختتام ان لفظوں میں کرتے ہیں،

> اس جدوجہد کا طویل المدت نتیجہ اصلاح اور ترقی کی حمایت ہی میں نکلے گا۔ مگر اس میں عام دانش ور (lay intellectual) کا ایک اہم کردار ہوگا، کیونکہ کوئی بھی ترقی مقصد میں مضبوطی اور ایمانداری کے بغیر ممکن نہیں (۳۳)۔

ابھی دیگر مسائل اور معاملات میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن پر حملوں اور اُن کے جوابی حملوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۶۶ء میں اُن کی کتاب اسلام شائع ہوئی اور اس کے ابواب کے اردو ترجمے فکر و نظر میں شائع ہونا شروع ہوئے، جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ کس طرح ان سب نے ایک تنازعہ کی صورت اختیار کر لی اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے اس سلسلے میں خود ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا کہنا ہے کہ،

> جب کتاب کے دو ابواب فکر و نظر میں شائع ہوئے ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ البیّنات اور دیگر قدامت پسند رسالوں نے مجھے منکرِ قرآن کہا، ویسے ہی جیسے اُنہوں نے پرویز پر منکرِ سنتؐ ہونے کا الزام عائد کیا تھا۔ حکومت مخالف روزنامہ اخبار نوائے وقت لاہور نے، جو کہ اُس وقت نہایت ہی مقبول تھا، اس تنازعہ کو، روزانہ تبصروں اور ''خبروں'' کی صورت میں مزید ہوا دی (۳۴)۔

ہم ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ تنازعہ ابواب کے اردو تراجم کے بعد شروع ہوا، کیونکہ اصل انگریزی کتاب تو ۱۹۶۶ء میں چھپ چکی تھی۔ اُن کا خیال ہے کہ سب سے زیادہ متنازعہ مسئلہ بحیثیت الہامی کتاب کے قرآن کی نوعیت کا تھا۔

صورتِ حال جو بھی ہو، ان کی کتاب اسلام اور اس کی وجہ سے اٹھ کھڑا ہونے والا تنازعہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی زندگی میں ایک موڑ ثابت ہوا۔ واقعات کس طرح آگے بڑھے اس سلسلہ میں خود ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا کہنا ہے کہ،

> مئی ۱۹۶۸ء میں حزبِ اختلاف کے ایک رکن مولوی فرید احمد نے، جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا، قومی اسمبلی میں یہ مسئلہ کھڑا کیا، اور پوری گرمیوں کے دوران یہ مسئلہ زور پکڑتا رہا۔ اپریل ۱۹۶۸ء کو مجھے دل کا دورہ پڑا اور آرام کی خاطر میں جون سے اگست تک ایبٹ آباد میں رہا، جو دارالحکومت سے ۷۰ میل کی دوری پر ہے۔
>
> ۲۵ اگست کو میں نے پریس میں ایک طویل بیان جاری کیا، جس میں میں نے قرآن کے نزول کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور وہ

تقریباً وہی تھے جو پہلے کے مسلمان، اقبال سمیت، کہہ چکے تھے۔ یہ بیان تمام انگریزی اخبارات میں چھپا، واحد اردو اخبار جس نے اس بیان کو چھاپا وہ سرکاری پارٹی کا روزنامہ کوھستان، لاہور، تھا۔ کابینہ نے بگڑتی ہوئی صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا کہ میں وزیرِ قانون ایس۔ایم۔ظفر کے ہمراہ پہلی ستمبر کو ایک مشترکہ پریس کانفرنس کروں، جو کہ ہم نے کی (۳۵)۔

اس پریس کانفرنس کا حال کچھ اس طرح کا ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی وضاحت کے بعد ایس۔ایم۔ظفر نے اعلانیہ کہا کہ بحیثیت ایک مسلمان کے اُن کو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب میں ''کوئی بھی قابلِ اعتراض بات نظر نہیں آئی''۔ مگر وہ اس قدر خوف زدہ تھے کہ کانفرنس کے بعد اُنہوں نے اُس افسر کو جس نے اس پریس کانفرنس کا اہتمام کیا تھا بلا کر کہا کہ وہ اخباری نمائندوں سے جا کر کہیں کہ وہ ''نا قابلِ اعتراض'' (no objection) والے الفاظ حذف کر دیں، اور ایسا ہی ہوا۔ سوائے پاکستان ٹائمز کے کسی اخبار نے ''نا قابلِ اعتراض'' والی بات نہیں چھاپی۔

مشرقی پاکستان اور سرحد میں کئی مقامات پر جلوس نکالے گئے۔ مگر مسئلہ کا دل پنجاب تھا۔ جبکہ سندھ اور کراچی میں مشکل ہی سے کوئی منظم سرگرمی اس سلسلے میں دیکھنے میں آئی۔ لاہور میں دیواروں پر ایسے پوسٹرز آویزاں تھے جن پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے سر کی قیمت لگائی گئی تھی۔

پانچ ستمبر کو پنجاب کے پانچ، چھ شہروں میں مکمل ہڑتال ہوئی، مگر لاہور اس میں شامل نہیں تھا۔ حکومت خاص طور پر اگلے روز کے حوالے سے فکر مند تھی، جو کہ چھ ستمبر کا دن تھا جو کہ جمعہ بھی تھا اور یومِ دفاع بھی۔ اور صدر صاحب کے الفاظ میں ''دونوں صوبوں کے گورنر خوف زدہ ہیں''۔ عقل مند کے لئے اشارہ کافی تھا اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے فوری طور پر اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ استعفیٰ کا متن شاید بعض قارین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو، اس لئے اسے یہاں پورا ہی بیان کیا جاتا ہے۔

میرے عزیز وزیرِ قانون، میں محسوس کرتا ہوں کہ میری کتاب اسلام ایک سنجیدہ تنازعہ کا موضوع بن چکی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، یہ کتاب میں نے ۱۹۵۸ء میں، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے ڈائریکٹر بننے

سے بہت پہلے، تحریر کی تھی، اور اس کتاب میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں وہ میرے ذاتی، آزاد خیالات اور توجیہات ہیں۔ مجھے اس بات سے گہرا دکھ ہوا ہے کہ بعض افراد نے اس کتاب کو حکومت پر تنقید کے لئے ایک بہانہ بنایا ہوا ہے، گویا کہ یہ کتاب حکومت کی ایما پر لکھی گئی ہو۔ میں حکومت کے لئے شرمندگی کا سبب نہیں بننا چاہتا، اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر میں اپنے عہدے پر قائم رہا تو میں اس کو روک نہ پاؤں گا۔ چنانچہ میں آپ کو اپنا استعفیٰ پیش کرتا ہوں، جو مجھے اُمید ہے کہ آپ مہربانی فرما کر فوری طور پر قبول کریں گے۔ میں آپ کا آپ کے خلوص، تعاون اور رہنمائی کے لئے شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔ آپ کے ماتحت کام کرنا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ آپ کا مخلص، ڈاکٹر فضل الرحمٰن (۳۶)۔

مندرجہ بالا واقعات یقیناً تبصرہ طلب ہیں، کیونکہ ایسا نہیں ہے کہ ذرا سا دباؤ پڑا اور ایوب خان نے اپنے فلسفی دانشور سے دامن چھڑا لیا۔ بلکہ خود ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے بقول،

> ۱۹۶۵ء سے بعض سرکاری حلقے محسوس کرتے تھے کہ میں اور ادارے کی پالیسیاں ایک سیاسی بوجھ بنتے جا رہے ہیں۔ اس تمام صورتِ حال کے درمیان ایوب خان ایک چٹان کی مانند ڈٹے رہے اور ادارے کی پالیسیوں کے خلاف تمام درخواستوں کو مسترد کرتے رہے، جو کہ سرکاری حلقوں اور اُن کے اپنے پارٹی کے سیاست دانوں کی جانب سے موصول ہوئیں۔ جبکہ دوسری جانب میں محسوس کرتا تھا کہ میری سرکار کے ساتھ وابستگی میرے لئے ایک بوجھ بن گئی ہے۔ سرکار کے لئے بڑھتی ہوئی تلخی میرے پر نکل رہی تھی، کیونکہ اسلام سب سے زیادہ استحصال اور بھڑکانے والی چیز تھا۔ نوکر شاہی مشکل سے اسلامی جدیدیت کی حمایت اور اس کے مقاصد پر ڈٹے رہنے کو آمادہ تھی۔ مشاورتی کونسل میں ماحول، ماسوائے چند مستثنیات کے، مایوس کن حد تک قدامت پسند تھا۔ مئی ۱۹۶۶ء میں میں نے استعفیٰ دے دیا تھا، جس کو صدر نے مسترد کر دیا۔ اُنہوں نے بلکہ

متعلقہ وزیر سے اس پر وضاحت بھی طلب کی (۳۷)۔

چنانچہ ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن ستمبر ۱۹۶۸ء سے بہت پہلے ہی پاکستان کے ماحول اور سیاست میں اپنے گھسیٹے جانے کی وجہ سے دل برداشتہ ہو گئے تھے اور اُن کو برطانیہ اور کینیڈا کا آسودہ تعلیمی اور تحقیقی ماحول اب یاد آنے لگا تھا۔ اور پاکستان میں موجود دشواریاں، جن کا اُن کو آنے سے قبل کوئی خاص اندازہ نہیں تھا، اب ان کے اپنی جائے پناہ (Ivory Tower) کی جانب دوبارہ لوٹ جانے کا سبب بن رہیں تھیں۔

ایک بار جب وہ اس ماحول سے دور ہوئے اور ان چیزوں کا تجزیہ عقب بینی میں کیا، ایک ایسا غیر جانبدار تجزیہ جو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے کردار کا شخص ہی کر سکتا تھا، تو اُن کو کہنا پڑا کہ،

> کئی عوامل کو یکجا کیا جائے تو عوام کے کتاب [اسلام] پر ردِ عمل کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ اول، پچھلے تنازعات نے بتدریج اثر ڈالا تھا، دوم، قرآن کی الہامی حیثیت ایک انتہائی نازک معاملہ ہے، اور اگرچہ، میرے خیال میں، بجائے قرآن کی الہامی حیثیت سے انکار کے، میں نے قرآن اپنے بارے میں جو کچھ کہتا ہے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی ایک عقلی توجیہہ پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ [مگر] تحریک چلانے والے [مخالفین] نے عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ میں نے کہا ہے کہ قرآن خدا اور رسولؐ کی مشترکہ تخلیق ہے-- ایک ایسی توجیہہ جو کوئی مسلمان نہیں مان سکتا۔ تیسری بات، جو کہ شاید فوری طور پر سب سے اہم تھی وہ یہ کہ حکومت نے غیر جمہوری طریقہ پر عوامی اجتماعات پر پابندی عائد کر دی تھی۔ مسجد واحد جگہ تھی جہاں لوگ اپنی آواز اٹھا سکتے تھے۔ مسجد میں مُلّا کو اچھی طرح پتہ تھا کہ کیا کہنا ہے، کئی ایوب- مخالف سیاست دانوں نے قدامت پسند علماء کے ساتھ مشترکہ محاذ قائم کیا، اس کتاب کو اپنی ناراضگی کی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے (۳۸)۔

اختتامیہ:

اُوپر کے صفحات میں ہم نے فوجیوں کے مفکر/دانشور رفقاء اور حمایتوں کے حوالے سے ڈاکٹر فضل

الرحمٰن کے ۱۹۶۰ء کی دھائی میں پاکستان میں فکری اور سیاسی میدان میں کردار کا جائزہ پیش کیا۔ اور ہم نے دیکھا کہ ایک طرف تو ایوب خان کو ایک ایسے نظریے کی ضرورت تھی جس کے تحت وہ ایک متحد پاکستان پر اپنی شخصی بالادستی قائم رکھ سکیں اور عوام کے اندر اپنی حکومت سے وفاداری کا جذبہ پیدا کر سکیں، تو دوسری جانب کینیڈا میں تدریسی اور تحقیقی فرائض انجام دینے والے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو بھی یہ خواہش تھی کہ اُن کے نظریۂ اسلام کو ایک ریاستی حمایت حاصل ہوتا کہ اُس کا عملی نمونہ آزمایا جا سکے اور جس کی کامیابی کا اُن کو ابتدا میں پورا یقین بھی تھا۔ مگر جلد ہی ایک طرف اگر ایوب خان کو یہ احساس ہوا کہ مذہب کوئی ایسی چیز نہیں جس سے کھیلنے کا حق صرف اُن کو حاصل ہے بلکہ اس کھیل میں اُن سے ماہر کھلاڑی موجود ہیں اور اگر اس کو ایک حد سے زیادہ استعمال کیا گیا تو یہ اُن کے گلے کا پھندا بھی بن سکتا ہے، تو دوسری جانب ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو بھی جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ نظریہ سازی ایک الگ چیز ہے اور زمینی حقائق کے ساتھ ان کو نافذ کرنا ایک بالکل ہی الگ بات۔ عملی سیاست کے تقاضوں اور باریکیوں سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ اور پھر مذہب کو ایک آئیڈیل کے طور پر استعمال کر کے اس سے قوتِ ایمانی اور جوش پیدا کرنا کوئی اتنا سادہ کام نہیں ہوتا اور دیگر کئی زیادہ حقیقی عوامل اور عناصر ہوتے ہیں جو عام زندگی میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

چنانچہ، یہ تجربہ عملاً دونوں جانب سے ناکام ہی رہا، مگر بعد کے آنے والے حکمرانوں، خاص طور پر فوجی جنرلوں، نے ایوب خان کی کامیابی کو صرف اُن کے دورانیہ حکمرانی ہی کے ذریعے جانچا، جو کہ کسی حد تک کامیابی یا ناکامی کا ایک پیمانہ ہے بھی۔ مگر اُنہوں نے یہ نہیں دیکھا یا سیکھا کہ مذہب کو سیاست میں لا کر وہ مستقبل میں پاکستان کی سلامتی کو کس قدر خطرہ میں ڈال رہے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ نظام چاہے جیسا بھی ہو اور جتنی ذہانت سے منصوبہ بندی کی گئی ہو اگر اُس میں عوام کے سماجی، معاشی حالات کو تبدیل کرنے کی، اُس پر مثبت انداز میں اثر انداز ہونے کی صلاحیت نہیں تو اُس کا انجام سوائے ناکامی کے کچھ اور نہیں ہو سکتا، سو وہی کچھ ہوا، ہماری اس کہانی میں بھی۔

حوالہ جات

۱۔ ایک چوتھا مارشل لاء، جو کہ اگر چہ وقت کی طوالت کے اعتبار سے تو مختصر المیاد تھا مگر اہمیت میں کم نہیں، جنرل یحیٰی خان کا۔ یہ مارشل لاء دور پونے تین سال پر محیط تھا، جو مارچ ۱۹۶۹ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کے دو ٹکڑ ہوئے اور اسی دور میں نظریہ پاکستان کی اصطلاح مشہور ہوئی، جس کا سہرا یحیٰی خان کے وزیرِ اطلاعات جنرل شیر علی کے سر ہے، جو ذہنی طور پر جماعت اسلامی سے قریب تھے۔

۲۔ اگر چہ یہ بات کافی عرصہ تک علمی حلقوں میں زیرِ بحث رہی کہ آیا یہ واقعی ایوب خان کی ہی خودنوشت ہے یا اس کے کسی ماتحت نے، جس میں زیادہ نمایاں نام الطاف گوہر کا تھا، اسے ایوب خان کے لئے تحریر کیا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی صورتِ حال میں، جو اکثر تحقیق کے دوران سامنے آتی ہے، ہمیں اس شخص کو ہی اس تحریر کا، کم سے کم اس کے مشمولات وخیالات کا، ذمہ دار سمجھنا چاہیئے جو اپنے نام کے ساتھ اس کی وابستگی کو تسلیم کرتا ہو۔

3 Mohammad Ayub Khan, *Friends Not Masters*, OUP, Pakistan 1967.

۴۔ مسلم فیملی لاء آرڈیننس کا اجرا ایوب خان نے ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی آمد سے قبل کیا تھا۔

۵۔ نظامِ عدل ریگولیشن اپریل ۲۰۰۹ء میں صوبہ سرحد کے صوبائی انتظامی قبائلی علاقوں (Provincially Administered Tribal Area) میں نافذ کیا گیا۔ ازروئے آئینِ پاکستان اس ریزولوشن کا نفاذ صوبائی گورنر نے صدر مملکت کی منظوری کے ساتھ کیا۔ ریزولوشن کے مکمل متن کے لئے دیکھیے: Daily Times، بدھ ۱۵ اپریل ۲۰۰۹۔

۶۔ روبینہ سہگل نے اپنا یہ مضمون سہ ماہی تاریخ کے زیرِ اہتمام ہونے والی کانفرنس

بعنوان ''ہماری تاریخ کے مارشل لاء: استعماری اور مابعد استعماری تجربات''
میں ۸ مئی ۲۰۰۹ء کو کراچی میں پڑھا تھا۔

۷۔ اگر چہ یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے تاسیسی ڈائرکٹر نہیں تھے مگر اس بات سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جو شہرت، یا بدنامی، اس ادارے کو اُن کے عہد میں ملی وہ نہ اس سے پہلے اس کو نصیب ہوئی اور نہ ہی بعد میں اس کا مقدر بن سکی۔ اسی طرح اگر چہ اسلامی نظریاتی کونسل کے وہ صرف ایک رکن تھے، اور اُنہوں نے اس بات کا اقرار بھی اپنی بعد کی تحریروں میں کیا ہے کہ وہ جس قدر اس ادارے پر اثر انداز ہونا چاہتے تھے وہ ممبران میں سے اکثریت کی محدود روایتی سوچ کی وجہ سے ممکن نہ ہوسکا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ ادارہ جتنا فعال اُس عہد میں تھا اتنا بعد میں نہ رہا۔

۸۔ بعد کے مضامین میں ایوب خان کی تعریف کے حوالے سے دیگر کے علاوہ سب سے اہم ان کا مضمون ہے،

"Islam in Pakistan" in *Journal of South Asian and Middle Eastern Studies*, vol. 8. No. 4 (1985): 34-61

اس کے علاوہ اُن کے وہ مضامین جن میں بعد کی پاکستانی صورتِ حال پر تبصرہ اور حکومتوں کو مشورہ دیا گیا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں،

"The Ideological Experience of Pakistan," in *Islam andthe Modern Age*, 2,4 (1971): 1-20., "Islam and the New Constitution of Pakistan" in *Journal of Asian and African Studies*, 8 (1973): 190-204. "A Note on the Task Before the Ministry of Religious Affairs" an unpublished work, Pakistan, 23 August 1975, 4 pages. "Some Islmic Issues in the Ayyub Khan Era," in *Essays On Islamic Civilization: Presented to Niyazi Berkes*, edited by Donald P Little, Leiden, E.J. Brill, 1976, etc.

9. Ayub Khan, *op cit.*, p. 197.

۱۰۔ ون یونٹ کا نفاذ وزیرِ اعظم چودھری محمد علی نے ۱۹۵۵ء کو مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کی نسلی عددی برتری کو ختم کرنے کے لئے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں تمام دیگر انتظامی یونیٹوں، اور فاٹا کو ون یونٹ بنا کر کیا۔ اس نظام کا خاتمہ یحییٰ خان نے جولائی ۱۹۷۰ء میں کیا۔

۱۱۔ محمد ضیاء الحق، تقاریر، پندرھواں حصہ: یکم اپریل--۳۰ جون ۱۹۸۱ء، محکمۂ فلم و مطبوعات وزارتِ اطلاعات ونشریات حکومتِ پاکستان، صفحات ۱۷-۲۷۔

۱۲۔ ایضاً، ۶۶۔

۱۳۔ جیوتی آریا (Jyoti Arya) نے اپنے انٹرنیٹ کے ایک مضمون "Leaders of Major Islamist Groups in Pakistan" میں بجا طور پر تحریر کیا ہے کہ ''ان [علماء] میں سے اکثر جنرل ضیاء الحق کے عہد کے ابتدائی سالوں میں منظرِ عام پر آئے جب ان کو ریاستی حمایت دی گئی۔ آج ان کا دعویٰ ہے کہ وہ پاکستان میں مذہبی ذہنی رجحان کے حامل لوگوں کے ایک قابلِ ذکر حصے کی نمائندگی کرتے ہیں''۔ اس فہرست میں اوروں کے علاوہ اُنہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد کو بھی شامل کیا ہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ دیگر کے علاوہ اسرار احمد کو بھی ضیاء الحق کے رفیقِ خاص ہونے کا شرف حاصل تھا۔ جیوتی اریا کا مضمون ویب سایٹ پر موجود ہے

،http://www.bharat-rakshak.com/MONITOR/ISSUE5-6/arya.html

۱۴۔ محمد ضیاء الحق، حوالہ بالا، صفحہ ۶۷۔

15. Pervez Musharraf, *In the Line of Fire: AMemoir*, Simon and Schuster, London, 2006, pp.295-96.

16. *Ibid*.,pp.296-97.

۱۷۔ دیگر آمروں کی طرح مشرف نے بھی اپنے نمونۂ اسلام کو آگے بڑھانے کے لئے مختلف دانشوروں کا سہارا لیا جن میں اسلامی نظریاتی کونسل میں بحیثیت چیرمین ڈاکٹر محمد خالد مسعود کا تقرر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں بحیثیت ریکٹر ڈاکٹر منظور احمد کا تقرر اور پھر علامہ جاوید احمد غامدی کا تمام ٹی وی چینلوں پر چھا جانا، یہ تمام Enlightened Moderation کی جانب کاوشیں ہیں۔

18. Pervez Musharraf, *op cit*, p.297.
19. *Ibid.*, p.58.
20. Fazlur Rahman, "Some Islamic Issues in the Ayyub Khah Era," in *Essays On Islamic Civilization: Presented to Niyazi Berkes*, edited by Donald P Little, Leiden, E.J. Brill, 1976, pp. 284-85.
21. *Ibid.*, p.258.
22. *Ibid.*
23. Fazlur Rahman, *A Study of Islamic Fundamentalism: Revival and Reform in Islam*, edited with an Introduction by Ebrahim Moosa,Oneworld Publication, England, 2000, p.2.

۲۴۔ فضل الرحمٰن، ''پیامِ انقلاب،'' فکر و نظر، جلد۲، شمارہ۴، (اکتوبر۱۹۶۴ء)، صفحہ۲۶۳۔

۲۵۔ ایضاً۔

۲۶۔ ایضاً۔

۲۷۔ جناب آبادشاہ پوری تاریخ جماعتِ اسلامی (حصہ اوّل)، ادارۂ معارفِ اسلامی، لاہور، ۱۹۸۹ء، کے صفحہ نمبر۲۱۲ پر لکھتے ہیں کہ مارچ ۱۹۳۳ء کو ترجمان القرآن کی اشاعت زیرِ ادارت سید مودودی حیدر آباد دکن سے ہوئی۔ مگر اگلے ہی صفحے پر وضاحت کرتے ہیں کہ 'ترجمان القرآن نیا پرچہ نہ تھا وہ چھ مہینے پہلے ستمبر۱۹۳۲ء سے ابو محمد مصلح کی ادارت میں عالمگیر تحریک قرآن کے زیرِ انتظام شائع ہو رہا تھا'۔

28. "Some Islamic Issues in Ayyub Khan Era," *op cit.* p.288.
29. Fazlur Rahman, *Islam*, London and New York, 1966.
30. Fazlur Rahman, "Currents of Religious Thoughtsin Pakistan," in *Islamic Studies*, 7. No. 1, (March 1968): 1-7.
31. *Ibid.*, p.4.
32. *Ibid.*, p.7.

33. *Ibid.*, p.7.
34. "Some Islamic Issues in Ayyub Khan Era," *op cit.* pp. 299-300.
35. *Ibid.*
36. *Daily Dawn*, Karachi, 6 September 1968, p.8.
37. "Some Islamic Issues in Ayyub Khan Era," *op cit.* pp. 297-98.
38. *Ibid.*, pp.300-301.

پاکستان میں مارشل لاء حکومتوں کا سِویلین بہروپ: ایک تقابلی جائزہ

محمد عابد عباسی*

موضوع کا تعارف:

زیرِ نظر مضمون کا موضوع پاکستان میں قائم ہونے والی مارشل لائی حکومتوں کا وہ حصہ ہے جس میں برسرِ اقتدار فوجی حکمرانوں نے اپنی بعض خارجی یا داخلی مجبوریوں کے تحت یا تو اپنے مارشل لا ہی کو سول رنگ دینے کی کوشش کی یا پھر مارشل لا کی چھتری تلے ایک متوازی مگر مکمل طور پر ماتحت جمہوری سیاسی نظام قائم کیا۔ اس مقصد کے لئے ان فوجی حکمرانوں نے اپنی سیاسی جماعتیں بنائیں، ان جماعتوں کی کامیابی کے لئے خود ساختہ جمہوری نظام مرتب کئے، انتخابات منعقد کرائے، ان انتخابات میں انتہائی منصوبہ بند کامیابیاں بھی حاصل کیں اور دلچسپ بات یہ کہ ان کامیابیوں کی حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود اپنی حکومت، اپنے قائم کردہ نظام اور اپنی کھڑی کی گئی سیاسی جماعت کو عوام کی طرف سے قانونی و اخلاقی جواز کی سند بھی تصور کیا۔ بلاشبہ یہ خود فریبی ہی تھی۔

پاکستان کے چار فوجی حکمرانوں میں سے تین یعنی جنرل ایوب خان، جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کے ادوار میں ہمیں عملی طور پر اس قسم کے تجربات نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ان ادوار کی اس قدرِ مشترک کا مطالعہ ہی اس تحریر کا مقصد ہے۔ ان صفحات میں ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ ان مارشل لائی حکومتوں میں قائم کئے گئے سیاسی نظاموں کی حقیقت کیا تھی؟ اور خصوصاً فوجی جرنیلوں کی بنائی ہوئی سیاسی جماعتوں (King's parties) کے کردار کیا رہے تھے۔ چونکہ یہ وہ پارٹیاں تھیں جن میں بڑے بڑے نامور سیاستدان شامل ہوئے اور یہ طویل عرصوں تک اقتدار کے ایوانوں میں براجمان بھی رہیں لیکن باوجود اس کے یہ جماعتیں عوام میں

* لیکچرار، لیاقت گورنمنٹ کالج، کراچی۔

اپنی جڑیں بنانے میں ناکام رہیں اور اپنے بانی یا سرپرست فوجی جرنیل کے زوال کے بعد اپنا وجود بھی برقرار نہ رکھ پائیں۔ مضمون میں ان ادوار کے موضوع سے جُڑے اہم سیاسی واقعات کو ناگزیر ضرورت کے تحت ہی بیان کیا گیا ہے۔

مضمون کا آخری حصہ ہمارے خیال میں اس لئے زیادہ توجہ طلب ہے کہ اس حصہ میں اس تمام بحث کا خلاصہ بعض نتائج اخذ کر کے کیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ نتائج ہماری سیاسی تاریخ کی اُن خرابیوں کی نشاندہی کر پائیں جو پاکستان کے موجودہ تباہ کُن اور غیر یقینی حالات کے ذمہ دار ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ مرض کی درست تشخیص بھی ہو۔

جنرل ایوب خان کی سیاسی حکومت اور کنونشن مسلم لیگ:

اکتوبر ۱۹۵۸ میں مارشل لا نافذ کر کے جنرل ایوب ملک کے پہلے فوجی حکمران بنے۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف آئندہ فوجی حکمرانوں کے لئے اقتدار پر قبضہ کا ایک مستقل اور غیر جمہوری راستہ مہیا کیا بلکہ حکومت پر قبضہ کے طریقہ کار، حکمرانی کے انداز، اداروں پر کنٹرول، عوامی ردعمل کی بیخ کنی، سیاستدانوں کی زباں بندی اور آئین کی چیرہ دستی جیسے کئی غیر قانونی اور غیر آئینی اقدامات کی مثالیں بھی قائم کیں اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے فوجی حکومت کو سول رنگ دینے کی ایک انوکھی مثال بھی قائم کی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ اپنی حکومت کے قیام یعنی ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک ایوب نے مارشل لا کے ذریعے ہی حکومت کی اور اس دوران انہوں نے خود حاصل کردہ اختیارات کا بے دریغ استعمال بھی کیا اور عملاً آئینی ضرورتوں، جمہوری اداروں اور عوام کی خواہشات کو پس پشت ڈالے رکھا، تاہم اپنے دورِ حکومت کے اس پہلے حصے میں بھی اُن کے بعض اقدامات سے اُن کی اس شدید خواہش کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ پاکستانی قوم کے لئے ناگزیر حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور اسی لئے وہ بحیثیت سول حکمران بھی عوام کے لئے اُتنے ہی قابل قبول ہونگے جتنے فوجی حکمران کی حیثیت سے ہیں۔ اپنے مارشل لا کو انقلاب اور خود کو قوم کا نجات دہندہ سمجھنے والے حکمران کی یہ خواہش غیر معمولی یا حیران کُن نہیں تھی۔ لہذا ایوب نے اپنی اس خواہش کے تحت سول حکمران کے مرتبے کے حصول کے لئے کوششوں کا آغاز اپنے دورِ اقتدار کے پہلے حصے ہی میں کر دیا تھا۔ اس سلسلے کا پہلا قدم ۱۵ فروری ۱۹۶۰ء کو اُٹھایا گیا جب اُنہوں نے

خود کو ایک منتخب صدر کہلوانے کے لئے ریفرنڈم کے ذریعے منتخب ہونے کا فیصلہ کیا اور ظاہر ہے منتخب بھی ہو گئے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ریفرنڈم میں ووٹ ڈالنے کا حق عام لوگوں کو نہیں بلکہ ایوب کے قائم کردہ بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے ۸۰ ہزار اراکین کو تھا جو اپنی ان حیثیتوں کے لئے مکمل طور پر ایوب ہی کے مرہون منت تھے لہذا کُل ۸۰ ہزار اراکین میں سے ۷۵،۲۸۳/ اراکین کے ووٹ ایوب کو با آسانی حاصل ہو گئے تھے جو بُنیادی جمہوریتوں کے اراکین کی کُل تعداد کا ۹۵ فیصد تھا۔[1]

۱۹۶۲ء میں آئین کے نفاذ کے بعد ملک سے مارشل لا اُٹھا لیا گیا اور سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی بھی ہٹا دی گئی۔ چونکہ ایوب بنیادی جمہوریتوں کے اراکین کو اسمبلیوں اور صدر کے انتخابات کے لئے انتخابی ادارے کا درجہ دے چکے تھے اور اسی ادارے نے اگلی مدت کے لئے صدر کا انتخاب بھی کرنا تھا لہذا اس ادارے میں اپنے حامی اراکین کی تعداد برقرار رکھنے کے لئے ایوب کو اپنی حمایت یافتہ ایک سیاسی پارٹی کی ضرورت تھی۔ سو اس مقصد کے حصول کے لئے اُنہوں نے بعض دوستوں کے مشورے سے مسلم لیگ کا کنونشن اجلاس بُلوایا اور اس طرح کنونشن مسلم لیگ کی بُنیاد رکھی گئی۔ جس کی سربراہی کی ذمہ داری بھی خود جنرل ایوب نے اُٹھائی۔ کنونشن مسلم لیگ میں شامل ہو کر جن مسلم لیگی رہنماؤں نے ایوب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اُن میں چوہدری خلیق الزماں، منظور قادر ایڈووکیٹ، شیخ خورشید احمد ایڈووکیٹ، فضل القادر چودھری، محمد علی بوگرا، عبدالمنعم خان، جناب عبدالصبور خان اور مسعود صادق جیسے سرکردہ مسلم لیگی شامل تھے۔

چونکہ بنیادی جمہوریتوں کے ادارے کو انتخابی کالج کا درجہ دے دیا گیا تھا لہذا ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخابات میں اس ادارے کے اراکین نے ہی صدر کا انتخاب کرنا تھا۔ اور چونکہ اس ادارے پر افسر شاہی کے زبردست کنٹرول کے ذریعے ایوب خان کی مکمل گرفت تھی لہذا صاف ظاہر تھا کہ ایوب نے یہ انتخاب بھی با آسانی جیت جانا تھے۔ تاہم حزب اختلاف کی سیاسی پارٹیوں نے انتخابات سے قبل C.O.P یعنی Combined Opposition Parties کے نام سے ایک انتخابی اتحاد تشکیل دیا اور ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کو COP کا مشترکہ اُمیدوار نامزد کر کے کسی حد تک ایوب کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ بلاشبہ محترمہ فاطمہ جناح تحریک پاکستان میں ایک نمایاں کردار ادا کرنے اور قائد اعظم کی بہن ہونے کے ناطے عوام میں انتہائی

عزت و احترام رکھتی تھیں۔ لیکن اس منفرد مقام کے باوجود ایوب نے بنیادی جمہوریتوں کے اراکین پر اپنے کنٹرول اور ریاستی ہتھکنڈوں کے استعمال سے محترمہ فاطمہ جناح کو شکست دے دی۔ لوگوں نے ایوب کے مقابلے میں فاطمہ جناح کی شکست کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خصوصاً کراچی اور ڈھاکہ میں جہاں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ایوب محترمہ کو شکست دینے میں ناکام رہے تھے۔ یہی وہ علاقے تھے جہاں ایوب کے خلاف زیادہ شدید جذبات پائے جاتے تھے۔ لیکن ان جذبات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایوب کے حامیوں نے کراچی ہی میں اس کامیابی پر جشن فتح منانے کا انتہائی عاقبت نا اندیشانہ فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں کراچی میں پُرتشدد لسانی فسادات برپا ہوئے جو ایوب کے چاہنے والوں اور فاطمہ جناح کے چاہنے والوں کے درمیان شروع ہو کر بالآخر مہاجر پٹھان جھگڑے میں تبدیل ہو گئے۔ اگرچہ ان فسادات پر جلد قابو پالیا گیا لیکن لوگوں کے دلوں میں ایوب کے خلاف جو جذبات پیدا ہوئے وہ پھر کبھی ختم نہ ہو سکے اور یہیں سے ایوب کے زوال کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ ان انتخابات کے بعد بھی ایوب کی حکومت مزید چار برس برقرار رہی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد ایوب کبھی سکون سے حکومت نہ کر سکے۔

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد تاشقند معاہدوں جیسے مسلسل ہوتے غلط فیصلوں، معاشی ناہمواریوں، مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان بڑھتی غلط فہمیوں اور ایوب مخالف سیاسی جماعتوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور سرگرمیوں کے سبب ایوب کا زوال روز بہ روز تیز ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں ایوب کے اقتدار کو چیلنج کر رہی تھی اور دوسری طرف مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان کی قیادت میں عوامی لیگ فوجی حکمران اور پنجاب سے مخاصمت کے تحت ایوب حکومت کے لئے دردسر بنی ہوئی تھی۔ اس زبردست عوامی تحریک کے سامنے ایوب کی عوامی حمایت سے محروم مرکز مائل انتظامی حکومت ریت کی دیوار ثابت ہوئی۔ ایوب نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ کو اقتدار فوج کے نئے کمانڈر انچیف جنرل یحیٰی خان کے حوالے کر دیا اور خود مستعفی ہو کر گھر چلے گئے۔ اس طرح اُن کا قائم کردہ سیاسی نظام اور ۱۹۶۲ء کا آئین خود اُن ہی کے ہاتھوں اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔

کنونشن مسلم لیگ ایوب کے بعد:

کنونشن مسلم لیگ کی بنیاد جنرل ایوب نے رکھی تھی اور ۱۹۶۲ء میں اس کے قیام سے دسمبر ۱۹۶۹ تک ایوب خود ہی اس جماعت کے سربراہ بھی رہے تھے تاہم دسمبر ۱۹۶۹ء میں پارٹی کے رہنماؤں میں اختلافات کے سبب ایوب نے خود کو پارٹی کی صدارت سے الگ کرلیا اور مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک سنئیر رہنما سابق اسپیکر فضل القادر چودھری کو اس کا قائم مقام صدر نامزد کردیا۔ کنونشن مسلم لیگ ایوب کے انتظامی احکامات کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی ظاہر ہے اُس کی جڑیں عوام میں نہیں تھیں۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد نے اپنے ایک مضمون The Martial Law and The Administrative State of General Ayub Khan میں ایوب خان کی حکومت کی ناکامی کی جن وجوہات کا ذکر کیا ہے اُن میں ان کے قائم کردہ سیاسی نظام کو بھی موردالزام ٹھہرایا ہے۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد لکھتے ہیں:

> The political institutions introduced by Ayub through his constitution too did not provide a viable alternative to genuine democratic process.
>
> ایوب کے اپنے دستور کے ذریعے متعارف کردہ سیاسی ادارے بھی ایک حقیقی جمہوری نظام کا کوئی قابلِ عمل متبادل پیش کرنے میں ناکام ہوگئے تھے۔[۲]

ایوب کی تشکیل دی ہوئی سیاسی جماعت کنونشن مسلم لیگ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> This organisation also succumbed to bureaucracy's control as Ayub prefered to operate through civil servants while the ministers and other partymen were not there to determine, and to dilate upon, the policies but to provide the system a political gloss. At least the Muslim League of Ayub Khan was a useful channel for the landlords, industrialists and other privileged interrest groups to get

proximity to the power structure, and to court official patronage.But this aspect of the system too did not ensure sustenance to Ayub as with the beginning of mass agitations the political cohorts of Ayub Khan started deserting his. Not only this but some of the beneficiaries of his autocratic rule joined the oppsition forces.

یہ ادارہ بھی افسر شاہی کے کنٹرول میں تھا جیسا کہ ایوب کی ترجیح تھی کہ اسے سول ملازمین کے ذریعے چلایا جائے، جبکہ وزرا اور دوسرے پارٹی رہنما پالیسیوں کو آگے بڑھانے یا فیصلے کرنے کیلئے نہیں بلکہ محض نظام کو سطحی اعتبار سے سیاسی دکھانے کے لئے رکھے گئے تھے۔ کم از کم ایوب خان کی مسلم لیگ زمینداروں، صنعت کاروں اور مراعات یافتہ طبقہ جیسے مفاد پرست گروپوں کے لئے اختیارات کی مالک حکومتی مشنری کے ساتھ قریبی تعلق جوڑے رکھنے اور سرکاری سرپرستی حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ضرور تھی۔ لیکن اس نظام کا یہ رُخ بھی ایوب کو سہارا نہیں دے سکا اور عوامی احتجاج کے شروع ہی میں ایوب کے بھرتی کئے ہوئے سیاسی کارندے اُنہیں چھوڑ کر جانے لگے، یہی نہیں بلکہ ایوب کی اس انتظامی حکومت سے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھانے والے لوگ بھی حزب اختلاف کے ساتھ مل رہے تھے۔[۳]

لیکن باوجود اس مایوس کُن صورتحال کے جس میں ایوب بھی سیاست سے علیٰحدہ ہو چکے تھے کنونشن مسلم لیگ کو اس کے نئے صدر سمیت مختلف سیاسی لوگوں نے زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اس جماعت نے بھرپور انداز میں شرکت کی اور قومی اسمبلی کے انتخاب کے لئے پورے ملک سے ۱۲۴ رنمائندے کھڑے کئے۔ جن میں مشرقی پاکستان سے ۹۳، پنجاب سے ۲۴، سندھ سے ۶ راور صوبہ سرحد سے صرف ایک نمائندہ کھڑا کیا گیا تھا۔ حیران کُن بات یہ ہے کہ کنونشن مسلم لیگ کے ۱۲۴ رمیں سے محض ۲ رُامیدوار ہی کامیاب ہو سکے تھے۔ اور اس سے زیادہ عبرت ناک بات یہ تھی کہ اُس کے ۱۲۴ رمیں سے ۱۰۲ رُامیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہوگئی

تھیں۔ جبکہ دوسری طرف صوبائی اسمبلیوں کے نتائج بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھے۔ صوبائی اسمبلیوں میں کنونشن مسلم لیگ نے مشرقی اور مغربی پاکستان سے کُل ۲۷۴ اُمیدوار کھڑے کئے تھے جن میں کامیاب ہونے والے اُمیدواروں کی تعداد صرف ۷ تھی جبکہ ۲۲۴ اُمیدوار اپنی ضمانتیں ضبط کرا چکے تھے۔[۴]

بلاشبہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتائج کنونشن مسلم لیگ کے لئے تباہ کُن ثابت ہوئے تھے۔ درج بالا اعداد و شمار سے واضح ہے کہ کنونشن مسلم لیگ نام کی جماعت ملک کی سیاست سے تقریباً مٹ چکی تھی۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک مسلسل مرکز اور صوبوں میں اکثریت اور اقتدار میں رہنے والی جماعت ایوب کے ساتھ ہی گمنامیوں کے اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ واضح رہے صرف یہ جماعت ہی نہیں بلکہ اس جماعت میں شامل بہت سے سیاستدان اور سیاسی لوگ بھی ایک فوجی آمر کا ساتھ دینے کے جرم کی پاداش میں عوام کے غضب کا شکار ہو کر بساط سیاست سے ہمیشہ کے لئے باہر ہو چکے تھے۔ البتہ ان میں سے چند ایسے سیاستدان جو بڑے بڑے زمیندار اور جاگیر دار بھی تھے یا معروف سیاسی خانوادوں سے تعلق رکھتے تھے، وہ سیاسی منظر سے کچھ عرصے اوجھل رہنے کے بعد پھر نمودار ہو گئے آئندہ کی کنونشن لیگوں کو اپنے کندھے فراہم کرنے کے لئے۔

جنرل ضیاء الحق کا سیاسی تجربہ اور پاکستان مسلم لیگ:

جنرل ضیا نے جب جولائی ۱۹۷۷ء میں اقتدار سنبھالا تو اُن کے سامنے اُن کے دو فوجی پیشروؤں یعنی جنرل ایوب اور جنرل یحییٰ کی مثالیں موجود تھیں۔ جنرل ضیاء الحق، ایوب اور یحییٰ کے بعض اقدامات کو اُن کی غلطی اور اُن کے زوال کا سبب سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر جنرل ضیاء سمجھتے تھے کہ جنرل ایوب کا خود کسی جماعت کا سربراہ بننا اور سیاست میں آنا ایک غلط قدم تھا جس کا نقصان اُنہیں اُٹھانا پڑا تھا۔ ضیاء کے خیال میں یہ کام وہ چند موقع پرست سیاستدانوں سے با آسانی لے سکتے تھے۔ اسی طرح ضیاء سمجھتے تھے کہ جنرل ایوب نے آرمی چیف کا عہدہ چھوڑ کر سب سے غلط فیصلہ کیا تھا جس سے اُن کی گرفت اُن کے اصل طاقت کے سرچشمہ یعنی فوج اور انتظامیہ پر کمزور پڑ گئی تھی۔ جبکہ دوسری طرف جنرل یحییٰ کے بارے میں ضیاء کا خیال تھا کہ یحییٰ کی سب سے بڑی غلطی اُن کا جلد اور وہ بھی بالغ رائے دہی کے تحت آزاد، شفاف اور منصفانہ انتخابات کرانے کا

فیصلہ تھا۔ جبکہ اُن کے نزدیک یحییٰ خان کی دوسری غلطی کئی اہم معاملات کو سیاستدانوں پر بھروسہ کرتے ہوئے انتخابات کے بعد پر چھوڑ دینا بھی تھا۔ لہذا اُنہوں نے ان تمام باتوں اور غلطیوں سے اجتناب برتا۔ ایوب خان کی کی گئی غلطیوں سے بچتے ہوئے ضیا نے کبھی آرمی چیف کا عہدہ نہیں چھوڑا، اُنہوں نے اپنی سیاسی پارٹی بنائی تو ضرور لیکن اُس کی سربراہی سے خود کو دور رکھ کر بحیثیت صدر مملکت پارٹی سیاست سے بالاتر رہنے کا تاثر دینے کی کوشش کی، اسی طرح انتخابات کے حوالے سے اُنہیں جو تحفظات تھے اُن کا سدباب اُنہوں نے اس طرح کیا کہ پہلے تو اُنہوں نے حتیٰ الامکان کوشش کر کے انتخابات کو ٹالا اور آٹھ سال کا عرصہ گزارنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور جب اُنہوں نے آٹھ سال بعد انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا تو اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کے لئے زبردست منصوبہ بندی کی اور اپنی ذات کے حوالے سے ہر قسم کی ضمانتیں پیشگی حاصل کیں۔

پاکستان مسلم لیگ کا قیام:

۱۹۸۳ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے حتمی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ ملک میں عام انتخابات فروری ۱۹۸۵ء میں کرائیں گے تو اُن کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ کس طرح بھٹو کی پیپلز پارٹی اور بعض مخالف سیاستدانوں کو ان انتخابات سے دور رکھیں؟ لہذا اس مقصد کے لئے اُنہوں نے ایک بھرپور حکمت عملی طے کی اور مکمل طور پر اُس پر عمل بھی کیا۔ اپنی طے شدہ حکمت عملی کے تحت ضیا نے انتخابات سے قبل ہی حالات کو سو فیصد اپنے حق میں کرنے کے لئے کچھ اقدامات اُٹھائے۔ مثال کے طور پر فروری ۱۹۸۴ء میں پیپلز پارٹی کی سب سے موثر آواز اور ضیاء الحق کی سب سے بڑی حریف بے نظیر بھٹو کو ملک بدر کر دیا گیا جو پہلے ہی مارشل لاء کے تحت نظر بندی کی زندگی گزار رہی تھیں، طلبا تنظیموں پر پابندیاں عائد کر دی گئیں، انتخابات میں مخالف جماعتوں کو اسمبلی میں پہنچنے سے روکنے کے لئے غیر جماعتی انتخابات کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا، انتخابات سے قبل ریفرنڈم کے ذریعے خود کو آئندہ مدت کے لئے صدر منتخب کروایا، بہت سے سیاستدانوں پر پابندیوں کو برقرار رکھا گیا، صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں توازن پیدا کرنے کے بہانے آئین میں ترامیم کر کے تقریباً تمام اہم اختیارات صدر کی طرف منتقل کر دیئے گئے، اور یہاں تک

کے وزیر اعظم کو نامزد کرنے کا اختیار بھی جنرل ضیاء نے بحیثیت صدر پاکستان خود حاصل کرلیا۔ اگر چہ ان انتخابات میں تقریباً تمام ہی سیاسی جماعتوں نے اپنے ایسے رہنماؤں کو جو مارشل لاء کی پابندیوں سے محفوظ رہے تھے بطور اُمیدوار اسمبلی میں پہنچانے کی کوشش کی تھی اور کسی حد تک پارٹیوں سے وابستہ لوگ اسمبلی میں پہنچ بھی گئے تھے لیکن مجموعی اعتبار سے انتخابات کی غیر جماعتی حیثیت کے سبب ۱۹۸۵ء میں بننے والی قومی اسمبلی کے زیادہ تر اراکین اپنی اپنی آزاد حیثیتوں میں اسمبلی میں پہنچے تھے اور اس طرح جماعتی وابستگیوں سے محروم ایک اسمبلی وجود میں آچکی تھی۔ اب اسپیکر، ڈپٹی اسپیکر اور قائد ایوان کے انتخاب کا مرحلہ تھا۔ جماعتی انتخابات کے نتیجے میں بننے والی اسمبلی میں یہ مراحل بہ حسن وخوبی اس طرح انجام پاتے ہیں کہ اسمبلی میں جس جماعت کے اراکین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے صدر مملکت اُسی جماعت کو حکومت بنانے کی دعوت دیتے ہیں اور واضح اکثریت رکھنے والی جماعت ہی حکومت سازی کرتی ہے۔ اگر اسمبلی میں کسی بھی جماعت کو واضح اکثریت حاصل نہ ہو تو نسبتاً زیادہ تعداد رکھنے والی جماعت دیگر ہم خیال جماعتوں یا جماعت کے ساتھ ملکر مخلوط حکومت تشکیل دیتی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔ یہاں پورے ایوان کا ہر رکن ایک اکائی تھا اور اتنی اکائیوں کا کسی بھی رکن پارلیمنٹ کو قائد ایوان منتخب کرنے کے لئے متفق یا یکجا ہو جانا اپنی جگہ خود ایک اہم مسئلہ تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تمام مراحل اراکین اسمبلی پر جنرل ضیاء کے زبردست اثر کے تحت انجام پاتے چلے گئے۔ محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم نامزد کرنے کے بعد اُنہیں اعتماد کا ووٹ دلانے کے لئے اسمبلی میں کسی نہ کسی فارمولے کے تحت لوگوں کو متحد کرنے کی ضرورت تھی لہذا اسمبلی کے اراکین کو جونیجو کی حمایت پر راضی کیا گیا۔ جو لوگ اس حمایت پر راضی ہوتے گئے وہ ایک گروپ کی شکل اختیار کرتے چلے گئے اور یہی گروپ سرکاری گروپ کہلایا اور اس طرح حکومت سازی کا کام تکمیل کو پہنچا لیکن جوں جوں اسمبلی کے معاملات آگے بڑھتے گئے ضیاء اور جونیجو کو یہ احساس ہونے لگا کہ اراکین پارلیمنٹ کو قابو میں رکھنے اور قانون سازی سے لے کر حکومت کے دیگر معاملات کو چلانے تک کے لئے اراکین پارلیمنٹ کو کسی نہ کسی پارٹی ڈسپلن میں لانا ضروری اور ناگزیر ہے۔ لہذا اس ضرورت کے پیش نظر اُسی سرکاری گروپ کو پاکستان مسلم لیگ قرار دے دیا گیا۔ اگر چہ کہ یہ بات انتخابات ۱۹۸۵ء کی روح کے خلاف تھی کیونکہ وہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہوئے تھے لیکن تمام اخلاقی اور قانونی پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر یہ پارٹی

تشکیل دے دی گئی جس کی سرپرستی بلاشبہ جنرل ضیاء کر رہے تھے۔

حالانکہ یہ اسمبلی، اس کا قائد ایوان اور تشکیل دی جانے والی پاکستان مسلم لیگ سب کے سب جنرل ضیاء کے ذہن کی اختراع تھے لیکن باوجود اس کے جنرل ضیاء نے اس اسمبلی پر کبھی بھی مکمل اعتماد نہیں کیا اور اُنہوں نے اُس وقت تک ملک سے مارشل لاء نہیں اُٹھایا جب تک اسمبلی نے اُن کی پیش کردہ آئینی ترامیم کو منظور کر کے ۱۹۷۷ء سے فروری ۱۹۸۸ء تک کے اُن کے تمام اقدامات کو انڈیمنٹی نہیں دے دی۔

جنرل ضیاء کے محتاط رویہ اور اسمبلی پر عدم اعتماد کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے آٹھویں ترمیم کو اسمبلی سے منظور کرانے کے لئے وقت کا تعین بھی بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ضیاء نے اپنی تجویز کردہ ترامیم کا اعلان ۳ مارچ ۱۹۸۵ء کو کیا جب کہ ۲۵ اور ۲۸ فروری کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہو چکے تھے اور حلف برداری کی تقریب ۲۳ مارچ کو ہونا تھی لہذا یہ درمیانی وقفہ ضیاء کے لئے کافی تھا کچھ لو اور کچھ دو کے فارمولے کے تحت اراکین اسمبلی سے بارگیننگ کرنے کا۔ اب جو ضیاء کے طے شدہ پروگرام کو مانتے ہوئے آٹھویں آئینی ترمیم کی منظوری کی حامی بھرے گا وہی نوازا جائے گا۔ لہذا آٹھویں آئینی ترمیم کے مسودہ کی حتمی منظوری اور ۱۱ نومبر ۱۹۸۵ء کو اس کے نافذ العمل ہونے کے بعد ۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کو جنرل ضیاء نے ملک سے مارشل لاء اُٹھا لیا اور اس طرح مارشل لاء سے جمہوری حکومت کی طرف پہلا قدم کامیابی سے رکھ دیا گیا اور جونیجو کی سول حکومت نے اپنی ذمہ داریاں انجام دینا شروع کر دیں۔ لیکن جلد ہی اس دُہرے نظام کی خرابیاں ظاہر ہونا شروع ہو گئیں جس میں پارلیمانی نظام جمہوریت کے نام پر صدارتی نظام نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جنرل ضیاء کے اس سیاسی تجربہ پر ایک معروف کالم نویس نے لکھا تھا:

> پاکستان ایک نئے سفر کی دہلیز پر کھڑا ہے آپ اسے ایک نیا سیاسی اور جمہوری تجربہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ہم اسے ایک نیم سیاسی اور نیم جمہوری تجربہ کہنا زیادہ قرین حقیقت سمجھتے ہیں۔ نیم سیاسی اور نیم جمہوری اس لئے کہ اس میں ایک معروف و مکمل جمہوری عمل کے تمام اجزاء بہم نہیں ہیں۔ [۵]

جنرل ضیاء کے قائم کردہ اس سیاسی نظام پر ایک دوسرے کالم نویس نے بھی ایک خوبصورت تبصرہ کیا تھا جو کچھ اس طرح تھا:

> دُنیا میں یونان کی جمہوریتوں سے لیکر امریکہ کی جمہوریہ تک اتنے تجربات کے نتائج ہمارے سامنے ہیں کہ ہمیں مزید کسی تجربہ کی ضرورت نہیں ہے جمہوریت میں یا تو پارلیمانی نظام ہوتا ہے یا صدارتی۔ دونوں کا ملغوبہ نہیں ہوتا۔[۶]

صاف ظاہر تھا کہ اس قسم کے دوغلے یا دُہرے نظام کا کامیابی سے چلتے رہنا ناممکن تھا لہذا جلد ہی صدر مملکت جنرل ضیاء الحق اور وزیراعظم محمد خان جونیجو کے درمیان اداروں پر کنٹرول، سرکاری افسروں کے تبادلوں، ملک کی خارجہ و معاشی پالیسیاں مرتب کرنے کے اختیار اور افغان مسئلہ جیسے اہم معاملات میں اختلافات پیدا ہوتے گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مئی ۱۹۸۸ء میں جنرل ضیاء نے جونیجو اور اُن کی اسمبلی کو برطرف کر دیا۔ اور اس طرح اپنے ہاتھوں سے لگائے اس نظام کو ضیاء نے خود ہی اُکھاڑ پھینکا۔

پاکستان مسلم لیگ جنرل ضیاء الحق کے بعد:

بعد کے حالات سے ہم واقف ہیں کہ اگست ۱۹۸۸ء میں ضیاء کی حادثاتی موت کے بعد اُس وقت کے سینیٹ کے چیئرمین غلام اسحاق خان ملک کے قائم مقام صدر بنے اور اُنہوں نے نومبر ۱۹۸۸ء میں ملک میں عام انتخابات جماعتی بنیادوں پر منعقد کرائے جس میں ملک کی تمام چھوٹی بڑی سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا۔ پاکستان مسلم لیگ ضیاء کی زندگی میں ہی اختلافات کا شکار ہو کر دو حصوں یعنی مسلم لیگ جونیجو گروپ اور مسلم لیگ فدا محمد گروپ میں تقسیم ہو چکی تھی۔ تاہم انتخابات سے ذرا پہلے مسلم لیگ کے ان دونوں دھڑوں میں اتفاق ہو گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ مسلم لیگ نے تنہا انتخابات میں جانے کے بجائے پاکستان پیپلز پارٹی سے مقابلے کے لئے ایک انتخابی اتحاد (IJI) یعنی اسلامی جمہوری اتحاد کے نام سے تشکیل دے کر انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس اتحاد میں مسلم لیگ، جماعت اسلامی، نیشنل پیپلز پارٹی اور دیگر جماعتیں شامل تھیں۔ لیکن باوجود اس کئی جماعتی اتحاد کے قیام کے اسلامی جمہوری اتحاد ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں کوئی خاص کارکردگی کا مظاہرہ نہ

دکھا سکا اور انتخابات میں اس کی پوزیشن دوسرے نمبر پر رہی تھی۔ پورے ملک سے اس کے ۱۵۵ رُامیدواروں نے انتخابات میں حصہ لیا تھا جبکہ کامیاب ہونے والے اُمیدواروں کی تعداد ۵۲ر تھی۔ جبکہ پیپلز پارٹی ۱۶۷ رُامیدواروں کو میدان میں لائی تھی جبکہ اُس کے کامیاب اُمیدواروں کی تعداد ۹۲ر تھی۔ ؎

گو کہ پیپلز پارٹی ان انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیاب نہیں ہوسکی تھی تاہم اسلامی جمہوری اتحاد کی نسبت اس کی کامیابی نمایاں تھی اور یہ جماعت ایک بار پھر اکثریتی جماعت بن کر اُبھری تھی۔ لہذا صدر اسحاق خان نے پیپلز پارٹی کو حکومت سازی کی دعوت دی اور اس طرح گیارہ برس بعد ایک بار پھر ملک میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔

اگر ہم ایوب کی کنونشن مسلم لیگ اور ضیاء کی پاکستان مسلم لیگ کا موازنہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان مسلم لیگ کنونشن مسلم لیگ کی طرح فوجی حکمران کا ساتھ دینے کی پاداش میں عوام کی نفرت کا شکار ہو کر سرے ہی سے ختم نہیں ہوئی بلکہ اُس نے کسی نہ کسی حد تک اپنا وجود برقرار رکھا۔ آیئے اس کی وجوہات جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

پاکستان مسلم لیگ کے عوامی غضب سے محفوظ رہنے کی کئی وجوہات تھیں۔ مثال کے طور پر اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ چونکہ مسلم لیگی رہنماؤں کو ایوب کے منظر سے ہٹنے کے بعد ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کنونشن مسلم لیگ کی عبرت ناک شکست یاد تھی لہذا اُنہوں نے پیپلز پارٹی کے مقابلے کے لئے اکیلے انتخابات لڑنے کے بجائے ایک انتخابی اتحاد تشکیل دے دیا تھا جس میں مسلم لیگ کے ساتھ کئی ایسی جماعتیں اکھٹا ہوگئی تھیں جو کسی نہ کسی طرح پیپلز پارٹی اور اُس کی طرز سیاست سے خائف تھیں اور اس طرح ان سب کا ووٹ بینک اکٹھا ہو جانے سے نتائج حوصلہ شکن حد تک خراب ہونے سے دور رہے۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ باوجود اس کے کہ اس مسلم لیگ کو جنرل ضیاء نے بنایا تھا لیکن جونیجو کی قیادت میں اس نے اپنے دورِ اقتدار میں کئی ایسے کام کئے جو ضیاء کی مرضی کے برخلاف تھے اور جس سے نہ صرف خود جونیجو بلکہ اُن کے بعض ساتھیوں اور اُن کی جماعت کو جنرل ضیاء کی ناراضگی بھی مول لینا پڑی۔ ایسے بہت سے فیصلوں اور اقدامات میں جونیجو حکومت کا افغان مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جنیوا معاہدہ پر جنرل ضیاء کے ٹائم فریم سے انحراف کر کے دستخط کرنا بھی شامل تھا۔ اور اسی جرأتِ اختلاف کے سبب عوام جونیجو کی مسلم لیگ کو ایوب کی کنونشن مسلم لیگ

سے قدرے جدا کر کے دیکھ رہے تھے۔ جبکہ اس کی تیسری اہم وجہ جنرل ضیاء کا خود مسلم لیگ کی حکومت کو برطرف کرنا بھی عوام میں مسلم لیگ کے لئے نفرت کو کم کرنے کا باعث بنا تھا۔ جبکہ چوتھی اہم وجہ جو پنجاب میں کسی حد تک مسلم لیگ یا آئی جے آئی کی کامیابی کا سبب بنی وہ تھی میاں نواز شریف کی بطور سابق وزیراعلیٰ پنجاب اچھی کارکردگی جو کہ ان انتخابات میں اسلامی جمہوری اتحاد کے سربراہ بن کر سامنے آئے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ ۱۹۸۸ء میں قومی اسمبلی کے انتخابات ۱۶ نومبر کو جبکہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات ۱۹ نومبر کو منعقد ہوئے تھے اس طرح قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں تین روز کا وقفہ تھا لہذا قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی نسبتاً کامیابی واضح ہونے کے بعد نواز شریف پنجاب میں پیپلز پارٹی مخالف ووٹرز کے عدم تحفظ کے احساس کو بڑھا کر صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں اُن کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اس طرح اسلامی جمہوری اتحاد نے صوبائی انتخابات میں پنجاب سے نمایاں کامیابی حاصل کر کے نہ صرف پنجاب کی وزراتِ اعلیٰ حاصل کی بلکہ مسلم لیگ کو بھی مکمل تباہی سے بچا لیا تھا۔ صوبائی اسمبلیوں میں جماعتوں کی پوزیشن کچھ اس طرح تھی۔ چاروں صوبائی اسمبلیوں میں نشستوں کی کُل تعداد ۴۵۱ تھی پاکستان پیپلز پارٹی نے پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان سے بالترتیب ۹۴، ۶۷، ۲۰، ۳ نشستیں حاصل کی تھیں جن کی کُل تعداد ۱۸۴ تھی۔ اسی طرح اسلامی جمہوری اتحاد نے اسی ترتیب کے ساتھ ۱۰۸، ۱، ۲۸، ۸ نشستیں حاصل کی تھیں اور اس کی حاصل کردہ نشستوں کی کُل تعداد ۱۴۵ تھی۔ ان دونوں جماعتوں کے علاوہ قابل ذکر تعداد آزاد اراکین اسمبلی کی تھی جن کی حاصل کی گئی نشستیں بالترتیب ۳۲، ۳۱، ۵۱، ۶ تھی جن کا ٹوٹل ۸۴ تھا۔ ان کے علاوہ ۳۸ نشستیں دیگر چھوٹی جماعتوں نے حاصل کی تھیں۔[۵] ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مسلم لیگ کی کارکردگی قومی اسمبلی کے مقابلے میں صوبائی اسمبلیوں میں بہت بہتر تھی خصوصاً پنجاب میں یہ کامیابی حیران کُن تھی جس سے ہمارے اختیار کئے گئے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

تاہم انتخابات ۱۹۸۸ء کے نتائج کے بعض حیران کُن پہلو بھی تھے مثال کے طور پر ان انتخابات میں بعض بڑے بڑے نامور سیاستدان شکست سے دوچار ہو گئے تھے اور ان میں سابق وزیراعظم اور مسلم لیگ کے صدر محمد خان جونیجو بھی شامل تھے جو میر پور خاص (سندھ) میں اپنے حلقہ سے شکست کھا کر اسمبلی سے باہر ہو گئے تھے۔ یوں لگتا ہے کہ عوام نے جونیجو کی تمام تر ذاتی

اچھائیوں کے باوجود اُنہیں جنرل ضیاء کی حمایت اور آٹھویں ترمیم کی منظوری جیسے جرم کی سزا دی تھی۔ اور پھر بعد ازاں شائد اُنہیں معاف بھی کر دیا تھا کیونکہ ۱۹۹۰ کے انتخابات میں جونیجو ایک بار پھر انتخاب جیت کر اسمبلی کے ممبر بن گئے تھے۔

جنرل پرویز مشرف کا 'جمہوری' تجربہ اور مسلم لیگ (ق) کا قیام:

جنرل مشرف نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ کو میاں نواز شریف کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار پر قبضہ کیا۔ لیکن اُنہوں نے اپنے پیشروؤں کے سابقہ تجربات کی روشنی میں اپنے اقتدار پر قبضہ کو مارشل لاء کہنے سے گریز کیا اور ساتھ ہی اُنہوں نے خود کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کہلوانے کے بجائے چیف ایگزیکیٹو کا ایک نیا منصب تخلیق کیا۔ ملک کی اعلیٰ عدالت نے ملک کے حالات سدھارنے اور ملک کو دوبارہ جمہوریت کی پٹڑی پر ڈالنے کے لئے انہیں تین سال کی مدت دی۔ اس دوران اُنہو ں نے ملک کے صدر رفیق احمد تارڑ کو فارغ کر کے صدر مملکت کا عہدہ بھی حاصل کر لیا۔ چونکہ جنرل مشرف نے بظاہر جنرل ضیاء کیس دور کی پالیسیوں سے صریحاً اختلاف کرتے ہوئے ملکی پالیسی کی ایک نئی سمت طے کرنے کا دعویٰ کیا تھا اور وہ اپنے تئیں ایک نئے اور روشن خیال پاکستان کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جس کے لئے اُنہیں وقت اور اقتدار دونوں کی ضرورت تھی۔ لہذا اُنہوں نے بھی طویل عرصہ تک اقتدار میں رہنے کے لئے ایک سیاسی پارٹی مسلم لیگ قائداعظم کے نام سے تشکیل دی۔ اس جماعت کے بیشتر اراکین نواز شریف کی مسلم لیگ چھوڑ کر آئے تھے جو جنرل مشرف کے اقتدار میں آنے کے بعد مسلم لیگ نواز پر آنے والے عتاب سے بچنے اور فوجی حکمران کا ساتھ دیکر حاصل ہونے والے ثمرات کے حصول کے خواہ تھے۔ جنرل مشرف کی سرپرستی میں اس جماعت نے ۲۰۰۲ کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی اور اکثریتی پارٹی بن کر سامنے آئی۔ میر ظفر اللہ خان جمالی کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ اس جماعت پر جنرل مشرف کے اثر اور کنٹرول کا اندازہ صرف ایک مثال سے با آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۰۰۲ کے الیکشن کے نتیجے میں ملنے والی پانچ برس کی آئینی مدت کے دوران محض مشرف کی مرضی پر تین وزرائے اعظم پارلیمنٹ کے اندر ہی تبدیل کر دیئے گئے اور اراکین اسمبلی نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ ان وزرائے اعظم میں میر ظفر اللہ خان جمالی، چوہدری شجاعت حسین اور شوکت عزیز شامل تھے۔ یہی نہیں بلکہ شوکت عزیز کو وزیر

اعظم بناتے وقت کچھ نئی اور مضحکہ خیز مثالیں بھی قائم کی گئیں۔ وہ اس طرح کے جب پرویز مشرف نے میر ظفر اللہ جمالی کی جگہ اپنے دوست شوکت عزیز کو وزیر اعظم بنانے کا فیصلہ کیا تو مسئلہ یہ درپیش تھا کہ شوکت عزیز اُس وقت اسمبلی کے ممبر نہیں تھے۔ لہذا اُن کے اسمبلی کے ممبر بننے تک چوہدری شجاعت کو تین ماہ کے لئے وزیر اعظم بنادیا گیا اور اس دوران تھرپارکر (سندھ) اور اٹک (پنجاب) کی دو نشستوں سے شوکت عزیز کو انتخاب لڑا کر اسمبلی کا ممبر بنوایا گیا جس کے لئے سندھ تھرپارکر سے کامیابی کی ضمانت سندھ کے وزیر اعلیٰ ارباب غلام رحیم نے دی تھی۔

مسلم لیگ (ق)، جنرل مشرف کے بعد:

۲۰۰۲ء کے انتخابات کے نتیجے میں بننے والی اسمبلی کی آئینی مدت ۲۰۰۷ میں ختم ہونا تھی جس کے بعد نئے انتخابات منعقد ہونے تھے۔ لیکن ۲۰۰۷ کے انتخابات سے پہلے جنرل مشرف کے بعض غلط فیصلوں کے سبب عوام کی اکثریت جنرل مشرف کی پالیسیوں کے خلاف ہو چکی تھی۔ بلا چون و چرا امریکہ کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کرنے، صوبہ سرحد میں امریکہ کی ایما پر فوجی آپریشن، لال مسجد اسلام آباد میں فوجی آپریشن، بلوچستان میں نواب اکبر بگٹی کا قتل اور ملک کی اعلیٰ عدلیہ کو دیوار سے لگانے کی کوشش جیسے اقدامات نے مشرف کو خطرناک حد تک غیر مقبول کر دیا تھا۔ دوسری طرف مشرف کے کمزور ہوتے اقتدار اور اُن پر پڑنے والے بیرونی اور اندرونی دباؤ نے اُنہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنے ابتدائی دور میں ملک سے بیدخل کی گئی دونوں بڑی جماعتوں کی مرکزی قیادت یعنی محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کو الیکشن ۲۰۰۷ء سے پہلے ہی ملک میں واپس بلائیں۔ چاروناچار مشرف کو ایسا کرنا پڑا۔ حالانکہ یہ دونوں رہنما الیکشن سے کچھ ہی پہلے ملک میں آئے تھے لیکن ان کی عوامی مقبولیت کے سبب صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہ الیکشن مسلم لیگ (ق) کے لئے کچھ اچھے ثابت نہیں ہوں گے۔ ایک فوجی حکمران کا مسلسل ساتھ دینے، جنرل مشرف کو باوردی صدر منتخب کرانے، اسمبلی سے سترھویں آئینی ترمیم منظور کرا کے آئین کے بدنام زمانہ آرٹیکل ۵۸ (۲) بی کو بحال کرنے اور مشرف کی ہر غلط بات پر آمنا وصدقنا حمایت کرنے کے جرم کی پاداش میں ۲۰۰۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ (ق) ووٹ کے ذریعے عوامی غضب کا شکار ہونے جارہی تھی۔ لہذا جب انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو مسلم لیگ (ق) قومی اسمبلی میں پورے

ملک سے محض ۵۴ نشستیں حاصل کر کے اور عددی اعتبار سے تیسرے نمبر کی جماعت بن چکی تھی۔ اس جماعت کے بڑے بڑے رہنما جن میں سابقہ وفاقی کابینہ کے ۲۲ وزرا بھی شامل تھے بُری طرح ناکام ہو چکے تھے۔ خاص طور پر وہ لوگ عوامی انتقام کا نشانہ بنے تھے جو ٹیلیویژن چینلز پر آ کر مشرف کی حمایت میں قلابیں ملایا کرتے تھے۔ خود مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چوہدری شجاعت بھی گجرات کے اپنے آبائی حلقہ سے ناکام ہو گئے تھے۔ ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں مختلف جماعتوں کی پوزیشن قومی اسمبلی میں کچھ اس طرح تھیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی قومی اسمبلی میں ۱۲۴ نشستیں حاصل کر کے پہلے نمبر پر تھی، مسلم لیگ نواز گروپ ۹۱ نشستیں حاصل کر کے دوسری بڑی جماعت بن کر سامنے آئی تھی جبکہ مسلم لیگ (ق) نے ۵۴ نشستیں حاصل کی تھیں۔[9]

بظاہر مسلم لیگ (ق) کے یہ الیکشن نتائج اتنے زیادہ خراب نظر نہیں آتے لیکن ان نتائج میں ایک بات کا مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ مسلم لیگ (ق) کا انجام ایوب کی کنونشن مسلم لیگ اور ضیاء کی جونیجو مسلم لیگ سے اس لحاظ سے مختلف تھا کہ دونوں سابقہ جماعتیں اپنے بانی جرنیلوں کے منظر سے ہٹنے کے بعد شکست و ریخت کا شکار ہوئیں تھیں لیکن مسلم لیگ (ق) جنرل مشرف کے اقتدار میں ہوتے ہوئے اور پورے ملک میں اپنی جماعت سے تعلق رکھنے والے ناظمین کی موجودگی اور غیر قانونی معاونت کے باوجود انتخابات میں بُری طرح ہار گئی تھی۔ تاہم مشرف کی اقتدار کی مسند پر موجودگی ہی وہ واحد وجہ بھی تھی جس کے سبب مسلم لیگ (ق) ان انتخابات میں پنجاب اور بلوچستان کی صوبائی اسمبلیوں اور قومی اسمبلی میں کچھ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب بھی رہی۔ لیکن الیکشن کے بعد اس جماعت کو باہم جوڑے رکھنے والی واحد قوت جنرل مشرف کے اقتدار سے علیحدگی کے بعد سے اب تک ایک سال کے عرصہ میں یہ جماعت اندر ہی سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ فارورڈ بلاک بن رہے ہیں اور وفاداریاں تبدیل ہو رہی ہیں۔ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے آئندہ آنے والے انتخابات میں مسلم لیگ (ق) کہاں کھڑی ہو گی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نام کی کوئی جماعت انتخابات میں حصہ ہی نہ لے۔ ایک جنرل کی خواہش پر انتظامی طریقوں اور مفاد کی بُنیاد پر اُستوار کی گئی عوامی حمایت سے محروم جماعت کا انجام کچھ اس سے مختلف ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس جماعت کی اعلیٰ ترین قیادت کی سیاسی بصیرت کا اندازہ اس ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۷ء کے انتخابات سے قبل جب جنرل مشرف کے باوردی صدر منتخب ہونے یا

نہ ہونے کی بحث چل رہی تھی تو مسلم لیگ (ق) کے ایک مرکزی رہنما چوہدری پرویز الٰہی نے کہا تھا کہ ''ہم پرویز مشرف کو ایک بار نہیں بلکہ دس بار باوردی ہی صدر منتخب کریں گے'' ظاہر ہے جمہوری حلقوں نے اس بیان کو انتہائی ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ چوہدری پرویز الٰہی نے یہ بیان تاریخ سے ناواقفیت کے سبب دیا ہے اور اُنہیں ماضی میں فوجی جرنیلوں کی بنائی ہوئی سیاسی جماعتوں کے انجام کا علم نہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں پرویز الٰہی نے یہ بیان تاریخ سے مکمل واقفیت کی بنا پر دیا تھا اس لئے کہ مشرف کے اقتدار میں آنے کے بعد سے پرویز الٰہی اور اُن کی جماعت نے جس طرح اقتدار میں رہنے کے لئے پرویز مشرف کی اندھی تقلید کی تھی اُس کے بعد وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پرویز مشرف کے بغیر اُن کا سیاسی مستقبل کیا ہوگا لہذا اُن کے اقتدار میں رہنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ باوردی مشرف ہی ملک کا صدر رہے۔

خلاصہ:

پاکستان میں اقتدار پر قبضہ کرنے والے چاروں فوجی حکمرانوں کے ادوار کو بغور دیکھا جائے تو ان میں سے ہر ایک دور واضح طور پر دو حصوں میں منقسم دکھائی دیتا ہے۔ پہلا حصہ ان کے اقتدار پر قبضہ سے شروع ہوتا ہے جس میں یہ حکمران تمام تر اختیارات تن تنہا استعمال کرتے نظر آتے ہیں اور ان کے اقتدار میں بظاہر کوئی دوسرا فریق نہیں ہوتا۔ جبکہ دوسرے حصے کا آغاز اُس وقت سے ہوتا ہے جب یہ حکمران اپنی بعض مجبوریوں کے تحت اپنے مارشل لاء کو سول رنگ دینے یا متوازی سیاسی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جنرل ایوب سے جنرل مشرف تک سب کے یہاں یہ دونوں ادوار بڑے واضح طور پر الگ الگ دیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم مزید غور کریں تو ان حکمرانوں میں سے ہر ایک کے یہاں ان کے دورِ اقتدار میں ہونے والی کلیدی تبدیلیوں کے اعتبار سے ایک تیسرا دور بھی Exist کرتا ہے۔ یہ تیسرا دور ان حکمرانوں کے کسی ایسے غلط قدم سے شروع ہوتا ہے جس نے رائے عامہ کو ان کے خلاف کیا اور وہی قدم ان کے زوال اور پھر اقتدار سے علیحدگی کا باعث بنا۔ کم از کم جنرل یحیٰی اور جنرل مشرف کے یہاں یہ تیسرا دور بہت واضح ہے۔ جنرل یحیٰی کا یہ دور شروع ہوتا ہے جب اُنہوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے انعقاد کے بعد اپنی توقع کے برخلاف نتائج آنے پر اُنہیں ماننے میں حیل و حجت کا مظاہرہ کیا اور

نتیجہ کے طور پر نہ صرف پاکستان دولخت ہوا بلکہ خود یحییٰ خان کو بھی رسوائی کے ساتھ اقتدار سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اسی طرح جنرل مشرف کا یہ تیسرا دور شروع ہوتا ہے جب اُنہوں نے ملک کی اعلیٰ عدلیہ سے اختلافات کے سبب چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار محمد چودھری سے استعفیٰ طلب کیا اور اُن کے انکار پر اُنہیں غیر فعال کر کے کام کرنے سے روک دیا۔ مشرف کے اس اقدام کو وکلا برادری، سول سوسائٹی، میڈیا اور عوام کی اکثریت نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، رائے عامہ مشرف کے خلاف ہوگئی اور ایک ایسی پُرامن اور طویل تحریک نے جنم لیا جس میں معاشرے کے ہر طبقہ فکر کے لوگوں نے شرکت کر کے مشرف کے اقتدار کو زوال کی طرف دھکیل دیا اور بالآخر اُنہیں بھی اقتدار سے غیر آبرومندانہ انداز میں الگ ہونا پڑا۔ اگر آپ غور کریں تو ان تمام فوجی جرنیلوں کے اقتدار کا یہ تیسرا دور ان کے طرز عمل کے اعتبار سے ایک طرح سے ان کے پہلے دور سے مماثلت رکھتا ہے اور وہ اس طرح کہ جنرل یحییٰ ہوں یا جنرل مشرف اپنے اقتدار کے اس تیسرے حصے میں وہ معاملات کو اپنے پہلے دور کی طرح پوری قوت کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اختیارات کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں لیکن کر نہیں پاتے کیونکہ اس حصے تک پہنچتے پہنچتے حالات مکمل طور پر بدل چکے ہوتے ہیں۔ بات بالکل واضح ہے کہ پاکستان کا ہر فوجی حکمران خواہ اُس نے حکمرانی کا کوئی بھی انداز اختیار کیا ہو اقتدار پر قبضہ کے بعد سے رفتہ رفتہ کمزور ہوتا گیا اور عوام میں اُس کی مقبولیت گزرتے وقت کے ساتھ کم ہوتی گئی۔

لیکن جہاں تک فوجی آمریتوں کے نفاذ پر بحیثیت قوم پاکستانیوں کے ردعمل کا تعلق ہے تو اس معاملے میں قومی کردار کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہا۔ جس کی تصدیق بعض غیر خوش آئند مشاہدات سے بھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ پاکستان میں ہر مارشل لاء کے اختتام پر ایسا لگتا ہے کہ پاکستانی سیاستدانوں، اداروں، فوج اور عوام سب ہی کو مارشل لاء کے مضمرات کا اندازہ ہو چلا ہے اور پاکستانی معاشرہ شعور کی اُن منزلوں کو پہنچ چکا ہے کہ اب کسی اور فوجی جرنیل کو جمہوریت پر شب خون مارنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ایک نئے فوجی جنرل کو تقریباً ہر طبقہ فکر سے مختصر ہی سہی لیکن ایک نئی پود اپنی حکومت کی حمایت میں حاصل ہو جاتی ہے۔ ماضی قریب کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ ۲۱ ویں صدی میں داخل ہونے کے بعد بھی جنرل مشرف کو اپنی جبری حکومت کی حمایت کے لئے تقریباً ہر طبقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے

کچھ نہ کچھ لوگوں کی حمایت مل ہی گئی تھی۔ اور اس کے بعد اُنہوں نے جس طرح معاملات ریاست کو چلایا اُس نے سامراجی دور کی یاد ہی تازہ نہیں کی بلکہ بہت سے معاملات میں اُسے مات بھی دے دی۔ ملک کی اعلیٰ عدلیہ کے بہ یک وقت ساٹھ سے زائد ججز کی برطرفی اس کی بدترین مثال تھی۔

اسی طرح یہ تجربہ بھی ہماری تاریخ کا خاصہ رہا ہے کہ جس طرح پاکستان کی سیاست ابتدا ہی سے شخصیات کے گرد گھومتی رہی ہے بالکل اُسی طرح فوجی جرنیلوں کی جبری حکومتوں کے خلاف چلائی جانے والی قومی تحاریک بھی اپنے جوہر میں آمریت کے خلاف نہیں بلکہ دراصل کسی فرد واحد کے خلاف چلائی جاتی رہی ہیں۔ ایوب خان کے خلاف چلائی جانے والی تحریک اگر اپنی روح میں فوجی آمریت کے خلاف ہوتی تو ایوب کے بعد ایک دوسرے فوجی حکمران کو اقتدار پر قبضہ کی جرأت نہ ہوتی۔ ماضی قریب میں 'گو مشرف گو' کا نعرہ بھی اسی بات کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ اس بار سیاستدانوں، وکلا برادری، سول سوسائٹی اور عوام کے نظریات کسی بھی طرح کسی نئی فوجی آمریت کو جاری رکھنے کے حق میں نہ تھے اور اسی سبب نئی فوجی قیادت نے خود کو اس قسم کی کسی بھی مہم جوئی سے باز بھی رکھا، لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ نعرہ 'گو مشرف گو' کے بجائے گو آمریت گو ہوتا۔

لیکن باوجود ان تلخ تجربات، غیر جمہوری رویوں اور منتشر عوامی کردار کے آخر پاکستان میں فوجی حکمران اور اُن کے قائم کردہ جمہوری یا سیاسی تجربات کامیابی سے ہمکنار کیوں نہیں ہو سکے؟ یہی وہ سوال ہے جس کے متوقع مثبت جواب کا حصول مکمل مایوسی سے بچا سکتا ہے لیکن اس کے لئے ہمیں مارشل لاء حکومتوں کے دوران قائم کی جانے والی سول حکومتوں کے حوالے سے بعض اہم حقائق کو سمجھنا ہوگا۔

* اول تو یہ کہ پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی قائم کردہ سیاسی حکومتوں کا مقصد قطعاً شراکت اقتدار یا جمہوری طرز حکمرانی کی بحالی نہیں تھا بلکہ ان کے اس اقدام کو ہم اکثر ان کی بعض داخلی و خارجی مجبوریوں کا شاخسانہ قرار دے سکتے ہیں۔ یہاں خارجی مجبوری سے مراد بین الاقوامی برادری کی طرف سے جمہوریت کی بحالی کے لئے دباؤ ہو سکتا ہے جبکہ داخلی طور پر ان کا یہ قدم دراصل اس حکمت عملی کا حصہ ہوتا ہے کہ یہ حکمران اپنے کئے گئے متعدد غلط

فیصلوں اور اقدامات کے نتیجے میں لگنے والے الزامات کو اقتدار میں شرکت کا جھانسہ دیکر سیاسی لوگوں کے کاندھوں پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جنرل ضیاء نے محمد خان جونیجو کو برطرف کرتے وقت جو الزامات لگائے تھے اُن میں اسلامی نظام کے نفاذ میں مناسب پیش رفت نہ کرنے کا الزام بھی شامل تھا حالانکہ یہ وعدہ خالصتاً جنرل ضیاءء نے ۱۹۸۴ء میں ریفرنڈم کے ذریعے صدر منتخب ہوتے وقت قوم سے کیا تھا۔ محمد خان جونیجو یا اُن کی حکومت نے نہ تو یہ وعدہ کیا تھا اور نہ ہی وہ اس کے لئے ذمہ دار تھے۔

دوسری اہم بات یہ کہ پاکستان کی چاروں مارشل لاء حکومتوں کے نتیجے میں سامنے آنے والے مسائل کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ جبر کے ذریعے قائم ہونے والی حکومتیں بظاہر بہت طاقتور ہوتی ہیں لیکن درحقیقت اپنی مجبوریوں کے اعتبار سے، اور قانونی اور اخلاقی جواز کی عدم دستیابی کے سبب ایک منتخب عوامی حکومت کے مقابلے میں بہت کمزور ہوتی ہیں اور ان کی یہی کمزوریاں انہیں سمجھوتے کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ہر سطح پر کئے گئے یہ سمجھوتے ایسی خرابیوں کو جنم دیتے ہیں جن کے نقصانات طویل عرصہ تک نہ صرف ملک وقوم کو بھگتنا پڑتے ہیں بلکہ ان حکمرانوں اور ان کی حکومت کو بھی اس کے مضمرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ اگر ہم فوجی حکمرانوں کے طرز عمل پر غور کریں تو یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ آخر فوجی حکمرانوں نے اپنے جبری اقتدار کے جواز کے لئے نت نئے انداز کیوں اختیار کئے۔ ایوب خان نے اپنے مارشل لاء کو ملک میں تیز ترین معاشی، سماجی اور زرعی ترقی کے لئے ایک انقلاب گردانا، جنرل یحیٰی نے اپنے مارشل لاء کو لوگوں کی خواہش کے مطابق ملک میں انتخابات کے انعقاد اور جمہوریت کی بحالی سے جوڑا، جنرل ضیاء نے پاکستان میں مذہب سے لوگوں کی مضبوط اور جذباتی وابستگی کو اپنے طویل اقتدار کی سیڑھی بنایا جبکہ جنرل مشرف نے نام نہاد روشن خیالی کا سہارا لیا۔ سوال یہ ہے کہ جب ان حکمرانوں نے طاقت کے ذریعے ہی اقتدار پر قبضہ کیا تھا تو پھر انہیں اپنی حکومت کو جاری رکھنے کے لئے مختلف حیلوں اور بہانوں کی کیا ضرورت تھی۔ آخر کیوں اُنہوں نے طاقت کے ذریعے ہی اپنے اقتدار کو جاری رکھنے کی کوشش نہیں کی؟

* اسی طرح اگر نتائج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو باوجود اس کے کہ فوجی حکمرانوں نے ایک دوسرے کی غلطیوں سے بہت کچھ سیکھا اور ہر نئے آنے والے نے دانستہ ایسے اقدامات سے بچنے کی کوشش کی جو اُن کے نزدیک اُن کے پیشروؤں کی ناکامی اور زوال کا سبب بنے تھے لیکن انجام کے اعتبار سے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بالآخر ان سب ہی کو بہت سی رسوائیاں سمیٹ کر اقتدار سے الگ ہونا پڑا۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟ درحقیقت یہی وہ سچائیاں ہیں جو اس خطہ کو ایشیا اور افریقہ کی بہت سی ایسی ریاستوں سے جدا کرتی ہیں جہاں طویل عرصوں سے فرد واحد کی حکمرانیاں قائم رہی تھیں یا قائم ہیں۔ یہ زمین اور یہاں کے لوگ فطرتاً آزاد اور جمہوریت پسند ہیں اور کوئی بھی طول پکڑتی آمریت انہیں بے چین کر دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے تمام فوجی حکمرانوں کا طرز حکومت اپنے پیشروؤں کی سطحی غلطیوں سے اجتناب برتنے، قدرے مختلف طرز حکمرانی اختیار کرنے اور اپنے مارشل لاء کو سویلین حکومت کا بہروپ دینے کے باوجود اپنے جوہر میں آمرانہ تھا جن کا پاکستان میں کامیاب ہونا اس لئے بھی مشکل تھا کہ اس قسم کی جبری اور غیر جمہوری طرز حکمرانی پاکستان کے قیام کی جمہوری اساس سے متصادم تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ہر مارشل لاء کے قیام پر عوامی ردعمل نہ ہونے کے برابر تھا ایسا عوام میں جرأت کی کمی کے سبب تھا یا کسی اور بنا پر، یہ بھی درست ہے کہ بعض دفعہ عوام کے کسی حصہ یا طبقہ کی طرف سے مارشل لاء کے نفاذ پر خوشیاں بھی منائی گئیں لیکن بحیثیت مجموعی پاکستانی قوم نے طول پکڑتی کسی بھی آمریت کی پذیرائی نہیں کی اور کبھی کسی فوجی حکمران کو خوشی سے تسلیم نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے تمام ہی فوجی حکمران ہمیشہ اس یقین سے محروم رہے کہ اُنہیں عوامی حمایت حاصل ہے۔ لہذا اُنہوں نے اپنے اقتدار کی سند کے حصول کے لئے کبھی معروف جمہوری طریقے اختیار کرتے ہوئے عوامی عدالت میں آنے کی جرأت نہیں کی اور ہمیشہ ہی اس مقصد کے لئے غیر مقبول اور غیر جمہوری طریقے اختیار کئے۔ لہذا ایسے اقدامات کے نتیجے میں ہر گزرتے دن کے ساتھ رائے عامہ ان کے خلاف ہوتی گئی اور بڑھتا ہوا عوامی ردعمل نہ صرف ان فوجی حکمرانوں کے اقتدار کو بہا کر لے گیا بلکہ ساتھ ہی اُن سیاسی جماعتوں اور سیاسی لوگوں کا مستقبل بھی تاریک کر گیا جنہوں نے فوجی حکمرانوں کے اقتدار کی سیڑھی بن کر خود بھی کچھ عرصہ

اقتدار کے مزے لوٹنے کے غیر دانشمندانہ فیصلے کئے تھے۔

ایک سوال جو آج غالباً ہر ذی شعور پاکستانی کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس کی کمی نے بحیثیت قوم پاکستان کے تشخص کو اُجاگر ہونے سے روکا ہوا ہے؟ آخر کیوں پاکستان اہم ترین قومی معاملات پر بھی فکر و شعور کی ہم آہنگی سے محروم ہے؟ ہمارے خیال میں وہ چیز یا نعمت ہے ایک متفقہ قومی ایجنڈے کا نا ہونا ہے۔ ایک ایسا قومی ایجنڈا جو مذہب، فرقوں، نظام حکومت اور اختیارات کی رسہ کشی کی بحث میں پڑے بغیر ہر قسم کی آمریت کی نفی، بنیادی حقوق کی ضمانت، اہلیت کی قدر و احترام اور انصاف جیسی چند بنیادی باتوں پر مشتمل ہو اور قوم کے عمل اور رویوں میں سرایت کیا ہوا ہو۔ تاہم پاکستانی قوم کی ہیئت ترکیبی، فوج، عدلیہ، سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں کے سابقہ کردار کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ سوال ہنوز اپنے جواب کا طالب ہے کہ ایسے قومی ایجنڈے کی تشکیل کیونکر ممکن ہو سکے گی۔

حوالہ جات

1- Ataf Gauhar, *Ayub Khan Pakistan's First Military Ruler* (Lahore: Sang-e-Meel Publications,1998), p.169.

2- Syed Jaffar Ahmed, 'The Martial Law and the Administrative State of General Muhammad Ayub Khan', *Pakistan Perspective* vol.5, No.1, January-June 2000, p.85.

3- *Ibid*, p.86.

۴۔ ڈاکٹر صفدر محمود، 'پاکستان کی اہم سیاسی جماعتیں' (لاہور مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء)، انتخابی نتائج صفحہ۔۲۳۔

۵۔ ارشاد احمد حقانی، 'انتخاب کا موسم' جنگ، ۲۱ فروری، ۱۹۸۵ء۔

۶۔ پروفیسر ظفر عمر زبیری، 'اندیشہ وخدشات'، جنگ، ۱۹ مارچ، ۱۹۸۵ء۔

۷۔ الیکشن ۸۸، مرتبہ قاسم محمود اور سلیم محمود، (کراچی: مطبوعات محمود، ۱۹۸۹ء)، انتخابی نتائج صفحہ۔۱۵۶۔۲۱۵۔

۸۔ ایضاً، انتخابی نتائج صفحہ۔۲۵۵۔

9- http://en.wikipedia.org/wiki/Pakistan.general election,2008.

مارشل لاء کے سماج پر اثرات

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ میں فوج کی مدد سے مہم جو اقتدار پر قبضہ کرتے چلے آئے ہیں۔ جب وہ ایک مرتبہ ریاست پر قابض ہو جاتے ہیں تو اپنے اقتدار کو بھی جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ فوج کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہونے کے دو نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک میں فوج حکومت پر قبضہ کرتی ہے تو وہ برسر اقتدار حکمران کو برطرف کر کے تمام اختیارات خود سنبھال لیتی ہے اور اس کا سربراہ نیا حکمران بن جاتا ہے۔ اس صورت میں سابق حکمران اور اس کی تمام علامتوں کو مٹا دیا جاتا ہے اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اب ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے جو سابق کے مقابلہ میں انصاف و عدل پر مبنی ہوگا۔ اس نئی صورت میں اسے اپنی حکومت کے لیے قانونی جواز کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسرے نمونے میں فوجی مہم جو حکمران کو برائے نام باقی رکھتا ہے مگر حکومت و انتظامیہ کے تمام اختیارات خود سنبھال لیتا ہے۔ اس صورت میں ایسا نظر آتا ہے کہ تسلسل کی پالیسی جاری ہے اور فوجی مہم جو وقتی طور پر برسرِ اقتدار آیا ہے۔ اس صورت میں فوجی مہم جو کے لیے اپنے اختیارات اور حکومت کے لیے کسی قانونی جواز کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ برائے نام حکمران کی وفاداری کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ لیکن ریاستی اختیارات کو خود سنبھال لیتا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں ہمیں دونوں نمونے مل جاتے ہیں۔ مثلاً جب عباس خاندان زوال پذیر ہوتا ہے تو آل بویہ (.....) اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں مگر خلافت کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے اس صورت حال کو سلجوقیوں نے بھی جاری رکھا۔

دوسری صورت میں عباس خاندان کے زوال کے دوران جب صوبوں کے گورنر خود مختار ہونا شروع ہوئے اور اپنی فوجی طاقت و قوت کی بنیاد پر اپنے خاندانوں کی حکومتیں قائم کیں تو قانون کی

نظر میں یہ غاصب ٹھہرے۔ مگر چونکہ عباس خلافت اس قدر کمزور تھی کہ ان کے خلاف کچھ کارروائی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے انہیں حکمران تسلیم کر لیا۔ اس صورت حال میں مشہور فقیہہ ابوالحسن الماوردی (وفات 1158) نے اپنی کتاب ''الاحکامات السلطانیہ'' میں ان فوجی مہم جوؤں کو جنہوں نے غاصبانہ طریقہ پر اقتدار پر قبضہ کیا انہیں جائز حکمران تسلیم کر لیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ عام لوگوں کے پاس کوئی ایسی قوت اور طاقت نہیں تھی کہ وہ ان کا مقابلہ کر سکتے۔ اس لیے فتنہ وفساد سے بچنے کے لیے انہیں جائز حکمران تسلیم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہٰذا فوج کی مدد سے حکومت پر قبضہ کرنا، قانونی طور پر جائز قرار پایا۔

ہندوستان کی تاریخ میں عہد سلاطین (1526 - 1205) میں فوجی مہم جو تخت وتاج پر قبضہ کرتے رہے۔ جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، غیاث الدین تغلق اور بہلول لودھی ان سب نے فوج کی مدد سے اقتدار حاصل کیا۔

عہد مغلیہ میں جب مغل خاندان زوال پذیر تھا تو اس وقت مراھٹہ سردار فوجی قوت کے سہارے بااختیار ہوئے مگر انہوں نے مغل بادشاہ کو برقرار رکھا اور اس کے ذریعہ اپنے اقتدار کو جاری رکھا۔ اس پالیسی پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے عمل کیا اور 1857ء میں جا کر مغل خاندان کا خاتمہ کر کے انگریز برسر اقتدار آئے۔

کولونیل حکومت ہندوستان میں مارشل لاء کے نظریہ کو لے کر آئے۔ یورپ میں عہد وسطیٰ میں جو عدالتیں کانسٹبل اور مارشل لاء کے تحت کام کرتی تھیں ان عدالتوں سے مارشل لاء کا تصور اور اس کے قوانین پیدا ہوئے انگلستان میں بادشاہ کو یہ حق تھا کہ وہ بغاوت کی صورت میں مارشل لاء کا نفاذ کر دے تاکہ دوسرے قوانین اور عدالتیں اس کی موجودگی میں کام نہ کر سکیں۔

مارشل لاء کے نفاذ کے بارے میں جو وجوہات دی جاتی ہیں وہ یہ ہیں اگر ریاست بحران میں ہو، فسادات ہوں، بغاوتوں میں گھری ہوئی ہو، حالت جنگ میں ہو، ملک میں امن وامان کی صورت حال بگڑ چکی ہو اور سویلین حکومت کے لیے حالات پر قابو پانا ممکن نہ رہے تو اس صورت میں مارشل لاء لگایا جا سکتا ہے۔

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد فیصلے فوجی ٹریبونلز کے تحت ہوتے ہیں۔ یہ ملک کے دستور اور قوانین کو معطل کر دیتا ہے۔ اکثر حالات میں یہ سویلین حکومت کی مدد کے لیے ہوتا ہے اور اسے

ایک محدود مدت کے لیے نافذ کیا جاتا ہے۔ اس لیے مارشل لاء اتھارٹیز کا دعویٰ ہوتا ہے کہ جیسے ہی امن وامان قائم ہوگا اور ملک بحران سے نکلے گا وہ مارشل لاء کو ختم کر کے اختیارات سویلین حکومت کے حوالے کر دیں گے۔

کولونیل دور میں برطانوی حکومت نے ہندوستان میں کئی بار مارشل لاء کا نفاذ کیا۔ مگر یہ نفاذ ہمیشہ کسی ایک محدود علاقے میں ہوتا تھا اور اس کی دیگر وجہ بغاوت، شورش، ہنگامہ، اور امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورت حال ہوتی تھی لیکن یہ نہیں ہوا کہ پورے ملک میں مارشل لاء لگا ہو اور فوجی مہم جو نے سویلین حکومت کو ختم کر کے اختیارات سنبھال لیے ہوں۔

1919ء جلیانوالہ باغ کے حادثہ کے بعد پنجاب میں پہلا مارشل لاء لگایا گیا تھا۔ دوسرا اہم مارشل لاء 1930ء میں سرحد میں اور تیسرا 1942ء میں سندھ میں حرتحریک کے خلاف تھا۔ یہ تینوں مارشل لاز محدود رہے اور جیسے حالات پر قابو پایا گیا انہیں اٹھالیا گیا۔

آزادی کے بعد پاکستان میں پہلے مارشل لاء کا تجربہ 1953ء میں ہوا جب پنجاب میں احمدیوں کے خلاف مجلس احرار نے تحریک چلائی۔ یہ مارشل لاء پنجاب تک محدود رہا اس کی جو وجوہات بتائی گئیں وہ یہ کہ عوام کا ہنگامہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا اس لیے امن وامان کی صورتحال کو قابو میں لانے کے لیے فوج کی ضرورت پڑی۔ جبکہ جنرل اعظم خاں جو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے ان کا کہنا تھا کہ اگر بروقت کارروائی کی جاتی تو فوج کا بلانا بالکل غیر ضروری تھا۔ کچھ تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ حکومت پنجاب نے جان بوجھ کر صورت حال کو خراب ہونے دیا تا کہ فوج کے ذریعے حالات پر قابو پایا جائے اور یہ تاثر دیا جائے کہ حکومت پاکستان حالات کو بہتر بنانے کی اہل نہیں ہے۔

اس مارشل لاء نے فوج کے جنرلوں میں یہ تاثر ضرور دیا کہ سول انتظامیہ اس قابل نہیں کہ فسادات پر قابو پاسکیں۔ اس لیے صرف فوج وہ ادارہ ہے جو ملک کے حالات کو بہتر بنا سکتا ہے۔

1958ء میں ایوب خان کا مارشل لاء اس لحاظ سے مختلف تھا کہ انہوں نے جلد ہی سویلین حکومت کو ختم کر دیا اور تمام اختیارات خود سنبھال لیے۔ ساتھ ہی 1956ء کے دستور کا خاتمہ کر کے ماضی کے تمام نشانات مٹا دیئے۔ اگرچہ مارشل لاء کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا گیا جو ''دوسو مقدمہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں جسٹس منیر نے مارشل لاء کو قانونی جواز دیتے

ہوئے یہ فیصلہ دیا کہ کامیاب انقلاب یا کودتا (Camp dietat) بین الاقوامی قانون کی نظر میں جائز سمجھا جاتا ہے اس میں دستور کو تبدیل کیا جا سکتا ہے اور نئے دستور کے تحت اسے قانونی تحفظ مل جاتا ہے۔

جسٹس کارنیلیس نے اکثریت کے فیصلہ سے اتفاق نہیں کیا اور دلیل دی کہ شہریوں کے بنیادی حقوق کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ حقوق ایک مہذب معاشرے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

یحییٰ خان کے مارشل لاء 1969ء پر عاصمہ جیلانی کیس میں اس مارشل لاء کو غیر قانونی قرار دیا گیا مگر یہ فیصلہ اس وقت آیا جب یحییٰ خان کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لیکن ملک میں اس فیصلہ پر خوشی کا اظہار کیا گیا اور امید کی گئی کہ اس کی روشنی میں آئندہ کوئی فوجی مہم جو آئینی حکومت کو ختم کر کے فوجی آمریت قائم نہیں کر سکے گا۔

مگر ابھی تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ جب ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو وہ سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے۔ اس نے مارشل لاء حکومت اور آنے والی جمہوری حکومت کے درمیان تسلسل کو باقی رکھا۔

جب 1977ء میں ضیاء الحق نے مارشل لاء کا نفاذ کیا اور نصرت بھٹو نے اسے عدالت میں چیلنج کرتے ہوئے 1973ء کے دستور کی خلاف ورزی قرار دیا کہ جو آئین کے تحت ملک سے غداری ہے۔

اس مقدمہ میں مارشل لاء کے حق میں جو دلائل دیئے گئے ان میں پیرزادہ شریف الدین کے دلائل قابل غور ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ 1977ء کا مارشل لاء غاصبانہ نہیں۔ بلکہ ایک غاصب کی حکومت کے خلاف اقدام ہے کہ جس نے الیکشن میں دھاندلی کرا کے حکومت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر نظریہ ضرورت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ یہ قانون کا حصہ ہے اور دنیا کے بہت سے ملکوں میں، برطانیہ سمیت اس کو تسلیم کیا گیا ہے۔ انہوں نے نظریہ ضرورت کو قران وسنت کی آیتوں سے بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔

انہوں نے مارشل لاء کو وقتی بتایا اور کہا کہ الیکشن کے بعد فوراً جمہوریت بحال کر دی جائے گی عدالت نے مارشل لاء کو ملک کے حالات کے تحت اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے جائز قرار دیا۔

1999ء کے مارشل لاء کو بھی ظفر علی شاہ مقدمہ میں چیلنج کیا۔ مگر اسے بھی عدالت نے جائز قرار دے دیا اور ساتھ ہی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو اختیار بھی دیا کہ وہ دستور میں ترامیم کر سکتا ہے۔

پاکستان میں مارشل لاء کی اس مختصر تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں اعادروں نے جب غاصب کی حکمرانی کو جائز قرار دیا تو یہ روایت ایک تسلسل کے ساتھ موجودہ دور میں پاکستان میں برقرار رہی۔ 1954ء میں جسٹس منیر نے نظریہ ضرورت کو استعمال کیا تھا جس میں انہوں نے گورنر جنرل غلام محمد کی اس اقدام کو قانونی جواز دیا تھا کہ جو انہوں نے دستور ساز اسمبلی کو توڑ کر کیا تھا۔

عہدِ وسطیٰ میں جمہوریت نہیں تھی۔ بلکہ شخصی حکومت تھی۔ اس وجہ سے فوجی مہم جو طاقت کے زور پر اقتدار پر قابض ہو جاتے تھے۔ عوام کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہر با اقتدار حکمران کی اطاعت کریں۔ اس لیے ان کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہر حکمران کو چاہے وہ طاقت کے ذریعہ اقتدار میں آیا ہو یا اپنے خاندانی حق کی بنیاد پر اسے حکمران تسلیم کرتے ہوئے اس کے فرماں بردار رہیں۔

مگر جمہوریت کے بعد صورت حال بدل گئی ہے۔ اب ریاست دستور کے تحت ہوتی ہے۔ اقتدار کی تبدیلی جمہوری طریقے سے ہوتی ہے اگر اس اصول سے سے روگردانی کی جائے تو یہ دستور اور جمہوریت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس لیے محض فوجی طاقت صاحب اقتدار ہونے کا جواز نہیں ہے۔

پاکستان میں بار بار مارشل لاء کے نفاذ اور جمہوری حکومتوں کے خاتمہ کے نتیجہ میں ریاستی، سماجی اور معاشی طور پر معاشرہ بری طرح متاثر ہوا ہے۔ مارشل لاء کی حکومتوں کا سب سے زیادہ نقصان یہ ہوا کہ ریاستی اداروں کی ساخت بدل کر رہ گئی۔ جمہوریت میں ریاستی ادارے عوامی نمائندوں کے سامنے اسمبلی میں جوابدہ ہوتے ہیں لیکن مارشل لاء کی صورت میں ان اداروں کی وفاداریاں فوجی حکومت اور فوجی ڈکٹیٹر سے ہو جاتی ہیں اب فیصلہ کا اختیار فوجی آمر کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا ہے۔

ہر آمر اپنے سیاسی استحکام کے لیے ایک نیا سیاسی نظام تشکیل دیتا ہے جیسے ایوب خان نے بنیادی جمہوریتوں کو متعارف کرایا تا کہ اس کے ذریعہ وہ اپنی قانونی حیثیت کو حاصل کر سکے۔

ضیاء الحق نے معاشرے کو اسلامی بنانے کی کوشش کی تو پرویز مشرف نے اعتدال پسندی اور روشن خیالی کا نعرہ لگایا۔

لیکن آمرانہ حکومتوں میں تبدیلی کا عمل اوپر سے ہوتا ہے، جس میں لوگوں کی شمولیت نہیں ہوتی ہے اور نہ لوگوں کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آمر کے ساتھ ہی اس کا وژن بھی رخصت ہو جاتا ہے اور اس کو بروئے کار لانے میں جو وسائل خرچ ہوتے ہیں وہ سب ضائع ہو جاتے ہیں۔

آمرانہ حکومت کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس میں ریاست اور اس کے ادارے عوام کی فلاح و بہبود کے بجائے آمر کی شخصیت کو اُبھارنے اور اس کی حفاظت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چونکہ آمر کی ذات میں تمام اختیارات جمع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے لوگوں کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہی ملک کے حالات کو سنبھال سکتا ہے اور اسے بحرانوں سے نکال سکتا ہے۔ اس کا اثر لوگوں کی نفسیات پر یہ ہوتا ہے کہ وہ جمہوری اداروں اور ان کی کارکردگی سے مایوس ہو جاتے ہیں اور آمر کی شخصیت میں انہیں مسیحا نظر آنے لگتا ہے۔

آمر کی ذات اور شخصیت سے وفاداری کا اظہار خوشامد کے ذریعہ کیا جاتا ہے جو ایک آرٹ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ خوشامد ترقی کے لیے ضروری ہو جاتی ہے اس لیے افراد سے لے کر جماعتیں اس میں شریک ہوتی ہیں آمر کے کارناموں کو اجاگر کیا جاتا ہے اسے شاندار خطابات دیئے جاتے ہیں اور اس کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔

آمرانہ حکومتوں میں اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا جاتا ہے۔ اس لیے سیاسی مخالفین کو ریاستی تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قید و بند، اذیت اور جلاوطنی وہ طریقے ہوتے ہیں کہ جن کے ذریعہ سیاسی مخالفین کو خاموش کرایا جاتا ہے۔

مارشل لاء کے دور میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں سیاسی جماعتیں یا تو خاموشی اختیار کر لیتی ہیں یا خفیہ طور پر کام کرتی ہیں۔ اس کا اثر لوگوں پر یہ ہوتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ غیر سیاسی ہوتے جاتے ہیں۔ اور ملکی معاملات سے لاتعلق ہو کر محض بحث و مباحثہ تک رہ جاتے ہیں۔ دوسری جانب سیاسی جماعتیں، پابندیوں کی وجہ سے عوام سے کٹ جاتی ہیں۔ سیاسی عمل ایک جگہ ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سیاست میں نئے لوگوں کے لیے

مواقع ختم ہو جاتے ہیں۔ پرانی قیادت ہی اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔

سیاسی پابندیوں کا شکار طلباء، مزدور یونینز، اقلیتیں اور عورتوں کی تنظیمیں زیادہ ہوتی ہیں ہر مارشل لاء میں تعلیمی اداروں میں طلباء یونین پر پابندی لگائی گئی۔ یہی حال ٹریڈ یونینز کا ہوا کہ جو پابندیوں کی وجہ سے مزدوروں کے حقوق کے لیے مؤثر کام نہیں کر سکیں۔ معاشرے میں طلباء، مزدور، عورتیں، اور اقلیتیں تبدیلی کا ایجنٹ ہوتی ہیں۔ جب انہیں غیر مؤثر کر دیا جائے تو اس صورت میں اس عمل کو چلانے والا کوئی نہیں رہتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مارشل لاء میں خاص طور سے ان مزاحمتی تحریکوں کو ختم کیا، جو ان کے لیے چیلنج تھیں۔ مثلاً ایوب خان کے خلاف طلباء نے تحریک چلائی، تو ضیاء الحق کو عورتوں کی تحریک نے چیلنج کیا اور مشرف کی حکومت کو وکیلوں نے۔ اس وقت طلباء اور عورتوں کی تحریکیں تو بہت مدھم ہیں دیکھتے ہیں کہ وکیلوں کی تحریک آگے بڑھے گی یا وہ بھی یہاں پہنچ کر رک جائے گی۔

فوجی آمروں کو ایک مرحلہ پر آ کر اپنے سیاسی جواز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت یہ سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں سے مدد طلب کرتے ہیں۔ ایوب خان نے کنونشن مسلم لیگ کے ذریعہ اپنی حکومت کو جائز قرار دینے کی کوشش کی تو ضیاء الحق نے غیر جماعتی سیاست کے تحت سیاستدانوں کو اپنی حکومت میں شامل کر کے، اپنی حکومت کو سہارا دیا۔ پرویز مشرف نے قائداعظم مسلم لیگ کے ذریعے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے راستہ تلاش کیا۔

مارشل لاء اور سیاست کے اس ملاپ کی وجہ سے جمہوری دور میں بھی اس کے اثرات رہتے ہیں اکثر سیاستدان مارشل لاء کی فضاء میں پروان چڑھے اور کسی نہ کسی شکل میں اس کے اثرات کو جاری رکھا۔ ذوالفقار علی بھٹو دس سال مارشل لاء کی چھاؤں میں رہے۔ نواز شریف ضیاء الحق کی شخصیت کے اسیر رہے۔ جب مارشل لاء اور سیاست کا باہم گٹھ جوڑ ہو جائے تو اس صورت میں جمہوریت کے راستے بند ہو جاتے ہیں اور ہم جمہوریت میں بھی فوجی آمرانہ ہتھکنڈوں کو دیکھتے ہیں۔

مارشل لاء اور فوجی حکومتوں کے اثرات ہم سیاسی تنظیموں اور طلباء کی جماعتوں میں بھی دیکھتے ہیں کہ جن میں سیاسی رواداری اور قوت برداشت کا فقدان ہو گیا ہے۔ سیاسی مخالفوں کو ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کے علاوہ ان کو اذیت کے ذریعہ خاموش کرایا جاتا ہے، خاص طور سے مختلف طلباء

تنظیموں نے ہاسٹلوں میں ٹارچر چیمبرز بنا رکھے ہیں جہاں مخالف طلباء کو اذیت دی جاتی ہے۔ بحث ومباحثہ اور مکالمہ کے کلچر کے بجائے تعلیمی اداروں میں کسی نہ کسی نہ شکل میں فاشسٹ نظریات جڑ پکڑ چکے ہیں جس کی وجہ سے سماج میں نئے خیالات وافکار کے لیے کوئی جگہ نہیں رہتی ہے۔

مارشل لاء کے اثرات معاشرے کے کلچر اور ادب وآرٹ کی سرگرمیوں پر بھی ہوتے ہیں۔ پابندیوں اور سنسر شپ کی وجہ سے دانشوروں کے لیے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ اس وجہ سے پاکستان میں موسیقی، آرٹ، فلم اور ادب میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ مارشل لاء دور میں ماسوائے چند افراد کے اکثریت نے سمجھوتہ کرتے ہوئے، مارشل لاء کے لیے اپنی صلاحیتیں وقف کر دیں۔ شاعر حب الوطنی اور قوم پرستی کے فروغ کے لیے ترانے لکھتے رہے جب کہ آرٹسٹ چاغی کی پہاڑیاں یا اسلحہ کو بطور زینت شہروں چوراہوں پر نصب کرتے رہے۔

دانشوروں کی وفاداری خریدنے کے لیے مارشل لاء حکومتوں نے کبھی رائٹرز گلڈز بنایا تو کبھی اکیڈمی آف لیٹرز، ان ادیبوں اور فنکاروں کو خطابات سے نوازا گیا کہ جنہوں نے خاموشی سے سمجھوتے کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔

مارشل لاء نے مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ ایوب خان نے اسلامی انتہا پسندی کے خلاف اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جس کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن تھے۔ جنہوں نے ترقی پسند اسلام کے فروغ کے لیے کام کیا۔ غلام احمد پرویز کو بھی حکومت نے سہارا دیا کہ وہ راسخ العقیدگی کے خلاف میدانِ عمل میں آئیں۔ ایوب خان کے ساتھ ہی یہ تحریک ختم ہو گئی۔ ضیاء الحق نے مذہبی انتہا پسندی کو ریاستی سرپرستی میں پھیلایا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اس سرپرستی میں اپنے خیالات کا پروپیگنڈہ کیا۔ جنرل مشرف نے ایک بار پھر ترقی اسلام کا سہارا لیا۔ اس طرح اسلام مارشل لاء کے درمیان کبھی ترقی پسند اور کبھی انتہا پسند، لبادوں میں پیش ہوتا رہا۔

مارشل لاء سے متاثر ہونے میں تاریخ نویسی سرفہرست ہے۔ ایوب خان کے دور میں تعلیمی پالیسی کے تحت تاریخ کے مضمون کو اسکول کے نصاب سے نکال دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ سے دلچسپی کم سے کم ہوتی چلی گئی لہٰذا اس عرصہ میں نہ تو پاکستان کی تاریخ لکھی گئی اور نہ ہی تاریخ کے دوسرے ادوار پر کوئی تحقیق ہوئی۔ اس کی جگہ بیوروکریٹس اور فوجی جنرلز اپنی یادداشتیں لکھ

کرتاریخ کومسخ کررہے ہیں کیونکہ ان کا مقصد اپنی بدعنوانیوں کو چھپانا ہے۔

چونکہ مارشل لاء کے دور میں جنگیں ہوئی ہیں اس لیے ہمارے نصاب اور تاریخ کا اہم موضوع یہ جنگیں اوران کے فوجی ہیروز ہیں۔اس کے علاوہ ہر مارشل لاء میں سابق فوجی آمروں اوران کے اقدامات کی تعریف کی گئی جب کہ سیاستدانوں کو بدعنوان اور سازشی بنا کر پیش کیا گیا ہے۔لہٰذا اس تاریخ نویسی نے جو تاریخی شعور دیا ہے، وہ حالات کو سمجھنے کے بجائے ذہن کو الجھنوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

مارشل لاء کے اثرات نے جس طرح سے سماج کو بے حس اور مفلوج بنا دیا ہے اس میں وقتی جمہوریت اپنا کردار ادا نہیں کر سکتی۔اس کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں جمہوری نظام کو استحکام ہو اور جمہوری ادارے پوری قوت سے اپنا کردار ادا کر سکیں۔

فوجی آمریتوں کے مقابل، خواتین کی تحریک

آنچل سے پرچم تک

انیس ہارون

میں ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر سیّد جعفر احمد اور ان کے رفقائے کار کی شکر گزار ہوں کہ آج کی محفل میں مجھے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا موقع دیا۔ یوں تو ایک مقالے میں خواتین کی تحریک کا احاطہ کرنا مشکل ہے لیکن چونکہ آمرانہ ادوار میں اس تحریک کا جائزہ لینا مقصود ہے اس لیے میں کوشش کروں گی کہ مختصر سے پس منظر کے ساتھ اصل موضوع پر جاؤں۔

تقسیمِ ہند سے قبل مسلمان عورتوں کی تعلیم اور معاشرتی اصلاحات کے حوالے سے کچھ حوالے ضرور ملتے ہیں لیکن منظّم سیاسی سرگرمی جس میں خواتین بی اماں کی قیادت میں متحرک ہوئیں وہ تحریکِ خلافت ہی میں نظر آتی ہے۔ دوسری بار وہ مسلم لیگ کے پرچم تلے تحریکِ پاکستان میں بڑے پیمانے پر شامل ہوئیں اور اپنے روایتی کردار سے ہٹ کر جلسے، جلوس یہاں تک کہ گرفتاریاں بھی پیش کیں۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے لیکن میں پشاور کے اس جلوس کا ذکر کرنا چاہوں گی جو ۳؍اپریل ۱۹۴۷ء کو نکالا گیا۔ ۱۵۰۰؍خواتین پہلی بار بغیر پردے کے نہ صرف سڑکوں پر نکلیں بلکہ انہوں نے سیڑھیوں پر چڑھ کر جیل پر مسلم لیگ کے جھنڈے لہرائے، لاٹھی چارج، آنسو گیس، فائرنگ کا مقابلہ کیا اور دفعہ ۱۴۴ کی مکمل خلاف ورزی کی، واضح رہے کہ جنوری ۱۹۴۷ء سے سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ کراچی اور لاہور میں تو بہت کچھ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ لاہور کے بعد ہی شروع ہو چکا تھا مگر پشاور کا واقعہ ایک بہت ہی قدامت پرست شہر میں پیش آنے کی وجہ سے اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ پشاور کی خواتین نے ایک خفیہ، جنگ کونسل بھی بنائی جس کے تحت ۱۹۴۷ء کے اوائل میں زیرِ زمین ریڈیو اسٹیشن، پاکستان براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کے نام

سے قائم کیا گیا جو آزادی تک کامیابی سے کام کرتا رہا۔ جہاں مزاحمت کی بات ہوتی ہے وہاں ۱۱رسالہ سعیدہ بانو اور ۱۳رسالہ فاطمہ صغریٰ کا نام ضرور آتا ہے۔

خواتین کے متحرک ہونے میں قائداعظم کی سوچ اور ان کی پالیسیوں کا بہت عمل دخل رہا۔ ۱۹۴۱ء میں بیگم عبدالقادر کی سرپرستی میں مسلم گرلز اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۴۲ء سے محمد علی جناح نے براہِ راست خواتین کو متحرک کرنے میں دلچسپی لینی شروع کی۔ وہ خود دورے کرنے اور خواتین کے اجتماعات سے خطاب کر کے انہیں تحریکِ پاکستان میں سرگرم ہونے کا پیغام دیتے رہے۔ ۱۹۴۳ء میں کراچی میں ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں خواتین بڑی تعداد میں شریک تھیں۔ اس موقع پر خواتین نیشنل گارڈ کا دستہ یونیفارم میں موجود تھا۔ ہر موقع پر قائداعظم اپنی بہن محترمہ فاطمہ جناح کو ساتھ رکھتے تھے تاکہ پبلک لائف میں خواتین کی شمولیت کا راستہ ہموار ہو سکے۔ ۱۹۴۴ء میں قائداعظم نے علی گڑھ میں جو تقریر کی تھی وہ بہت مشہور ہوئی اور خواتین کے کردار کو سیاست میں 'تحکم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

> 'یہ انسانیت کے خلاف جرم ہے کہ ہماری خواتین کو چار دیواری میں قیدیوں کی طرح بند کر دیا۔ دنیا میں کہیں بھی حالات اتنے برے نہیں ہیں جس طرح ہماری عورتیں رہتی ہیں۔ آپ جہاں بھی جائیں خواتین کو ایک کامریڈ کی طرح شانہ بشانہ لے کر چلنا چاہیے۔'
>
> (قائداعظم محمد علی جناح ۱۹۴۴ء)

۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں دو مسلمان خواتین بیگم سلمیٰ تصدق حسین اور بیگم شاہنواز بھی شامل تھیں جو کامیاب ہوئیں۔ اس طرح مسلمان خواتین کے پارلیمنٹ میں آنے کا راستہ کھلا۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم ایک تاریخی المیہ تھی جو خونریز فسادات دس لاکھ جانوں کے زیاں اور دونو زائیدہ ملکوں میں ازلی دشمنی کی شکل میں رونما ہوئی۔ دونوں طرف کی خواتین کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ہماری تاریخ اور ادب کا حصہ ہیں۔ انہیں دہرائے بغیر میں یہ کہنا چاہوں گی کہ مذہبی اور لسانی منافرتیں انسان کو وحشی درندہ بنا دیتی ہیں۔ سارے اقدار اور رشتے ناطے ختم ہو جاتے ہیں۔ عورت صرف ایک جسم کا نام ہوتا ہے جسے بھنبھوڑ کر اپنے دشمن کی بے عزتی کی جاتی ہے۔ وہ افسوسناک انتقامی کارروائیاں جس کا نشانہ مسلمان، سکھ اور ہندو عورتیں بنیں ایک عرصے تک اس کے اثرات

ہندو پاک کے معاشروں میں رہے۔ متاثرہ خاندان اب بھی کوئی بہانہ ملنے پر اپنے زخموں کو تازہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ قیامِ پاکستان کی تحریک نے عورتوں کے کردار کو خاموشی کے کلچر اور پردے سے نکال کر قومی کینوس پر منتقل کر دیا۔ گو کہ اس تحریک میں خواتین نے اپنے حقوق کی مہم فیمینزم کے حوالے سے نہیں چلائی، پدرشاہی (patriarchy) کو چیلنج نہیں کیا لیکن اپنی اہمیت قومی دھارے میں ضرور منوالی، یہ اور بات ہے کہ قومی آزادی کی تحریکوں میں خواتین کو آزادی کے بڑے مقصد کے حصول کے لیے سیاسی زندگی میں شامل کیا جاتا ہے مگر کامیابی کے بعد اقتدار میں ان کا کوئی حصہ نہیں رکھا جاتا۔ پاکستان میں بھی یہی ہوا کہ تقسیم کے بعد سیاسی طور پر متحرک خواتین سماجی کاموں میں جت گئیں جس کو بہت سراہا گیا۔ خواتین مہاجروں کے لٹے پٹے قافلوں کی دیکھ بھال میں لگ گئیں۔ بیگم رعنا لیاقت علی نے ویمنز والنٹیری سروس کی بنیاد رکھی اور قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۹ء میں اپواء کے قیام اور اس کی خدمات سے تو لوگ واقف ہیں لیکن ویمنز نیشنل گارڈز کے بارے میں کم جانتے ہیں جو سرکاری سرپرستی میں بیگم رعنا نے ہی بنائی تھی۔ چونکہ پاکستان کے حصے میں کم وسائل آئے تھے۔ انتظامی ڈھانچے اور فوجی قوت بھی کمزور تھی۔ عورتوں کو دفاعِ وطن کے لیے تیار کرنا ایک مستحسن اقدام تصور کیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں کشمیر میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور دفاعی ٹریننگ خواتین، ریزروز تیار کر رہی تھیں، لڑکیاں ویمن نیشنل گارڈ میں بھرتی ہوئیں۔ انہیں فوجی تربیت دی گئی اور ان کے چاق و چوبند دستے پریڈ بھی کرتے تھے۔ جنگ کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو ویمن نیشنل گارڈز کی بھرپور مخالفت شروع ہوگئی۔ یہاں تک اسے ختم کر دیا گیا وہ تمام مذہبی عناصر اور جماعتیں جو قیامِ پاکستان کے مخالف رہے تھے پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کے لیے پہنچ گئے۔ جہادِ کشمیر کے ذریعے لال قلعہ پر پاکستان کا پرچم لہرانے کے خواب دیکھے جانے لگے۔

۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد منظور ہوئی جس پر پاکستان کے ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دساتیر کی بنیاد رکھی گئی، جس میں قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہ بنانے کا اصول طے کیا گیا تھا۔ ہر چند کہ سیاسی تجزیہ نگار قراردادِ مقاصد کو پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کی بنیاد قرار دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ریاست جب تک کمزور نہیں ہوئی اس وقت تک مذہب کا استعمال نہیں کیا گیا۔ گو کہ ۱۹۵۶ء میں بننے والے پہلے دستور ہی میں ملک کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام

دیا گیا مگر ساتھ ہی خواتین کے دہرے ووٹ کو بھی تسلیم کیا گیا۔ ایک طرف تو وہ مردوں کے شانہ بشانہ عام ووٹرز کی فہرست میں شامل تھیں، دوسری طرف انہیں اپنے لیے مخصوص کردہ نشستوں پر اپنی نمائندہ چننے کا اختیار دیا گیا جو اسمبلیوں میں ان کی نمائندگی کرتیں، گو کہ وہ صرف تین فیصد تھیں۔

خواتین کی تحریک کو ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشی ارتقا سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کوئی بھی تحریک خلاء میں جنم نہیں لیتی بلکہ معروضی حقائق اور نظریات اس کی بنیاد بنتے ہیں۔ پاکستان سیاسی اعتبار سے ایک کمزور ریاست ثابت ہوئی۔ پہلا دستور ۱۹۵۶ء میں بنا جو قابلِ عمل نہ بن سکا اور پہلے عام انتخابات ۱۹۷۰ء میں ہوئے۔ پے در پے فوجی مداخلت اور آمریت نے جمہوریت کو قدم جمانے سے پہلے ہی اکھیڑ دیا۔ مسلم لیگ کی قیادت جو نوابوں اور زمینداروں پر مشتمل تھی ملک کو ایک سیاسی اور جمہوری نظام دینے میں ناکام رہی اور ۱۹۵۸ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے پہلا مارشل لاء لگا کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء کے درمیان تک عورتوں نے اپنی کئی تنظیمیں بنائیں جن میں سماجی کاموں میں مصروف تنظیموں سے لے کر انٹرنیشنل کلب اور سیاسی تنظیمیں بھی شامل تھیں جن میں لاہور میں قائم ہونے والی انجمن جمہوریت پسند خواتین قابلِ ذکر ہے جس میں بائیں بازو کے نظریات رکھنے والی خواتین سرگرم تھیں۔

۱۹۵۵ء میں بیگم نسیم جہاں نے یونائیٹڈ فرنٹ قائم کیا جو عورتوں کے قانونی حقوق اور سماجی حیثیت کو مستحکم کرنے کی پہلی تنظیم تھی۔ گو کہ اپوا نے زیادہ توجہ تعلیم، صحت اور عورتوں کو ہنرمندی سکھانے پر مرکوز کی لیکن ساتھ ہی خواتین کے لیے قانونی اصلاحات کا ایجنڈا بھی سامنے رکھا اور دونوں تنظیموں نے اپنی کاوشیں جاری رکھیں۔ خصوصاً عائلی قانون میں اصلاحات کا مطالبہ اپوا کی طرف سے آیا اور ۱۹۵۳ء میں اپوا نے ہی قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں خواتین کی دس فیصد نمائندگی کا مطالبہ بھی کیا۔

اس ملک کی بدقسمتی یہ رہی کہ سیاسی نظام تو قائم نہ کیا جا سکا اور ایوب خان کی فوجی آمریت نے رشید کمیشن کی سفارشات پر خواتین کے لیے پہلا اصلاحی قانون نافذ کیا جو خواتین کی جدوجہد میں ایک سنگِ میل ثابت ہوا۔ دوسری طرف سیاسی اکھاڑ پچھاڑ اور سیاسی جماعتوں پر پابندی نے سیاسی

عمل میں عورتوں کی شرکت کے راستے مسدود کر دیئے۔

جنرل ایوب کا دور سینڈھرسٹ کے تربیت یافتہ جنرلوں اور انگریز کی پیدا کردہ نوکر شاہی کے عروج کا زمانہ تھا۔ ریاست کی طاقت فوج بن گئی تھی اور ایوب خان کو مولویوں سے سخت چڑ تھی۔ انہوں نے مذہب کا سہارا لینے کے بجائے مولوی اور اسلامی جماعتوں کو نشانہ بنایا۔ جماعتِ اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی نے جیل میں کچھ عرصہ گزارا اور ملک کا دوسرا دستور ایوب خان نے ۱۹۶۲ء میں بنایا جس میں بنیادی جمہوریت اور صدارتی نظام کا نفاذ کیا۔ سارے اختیارات صدر کی ذات میں مرکوز کر دیئے گئے۔ کنونشن مسلم لیگ سرکاری سیاسی جماعت بنی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ ایوب خان نے دستور سے 'اسلامی' کا لفظ نکال کر پاکستان کو جمہوریہ قرار دے دیا۔ اگر یہ قدم جمہوری حکومت نے اٹھایا ہوتا تو اس کے نتائج یقیناً دوررس ہوتے۔ لیکن آمریت کے سائے میں تو صرف مفاد پرست پروان چڑھتے ہیں۔ کنونشن لیگیوں نے پہلا موقع ملتے ہی پھر جمہوری پاکستان میں 'اسلامی' کا حصہ شامل کر دیا۔

ایوب خان کی پالیسیوں میں 'ون یونٹ اور یونیورسٹی آرڈی نینس' جیسے کالے قوانین شامل تھے۔ ایوب خان نے ۱۹۶۵ء کے اوائل میں الیکشن کا اعلان کیا تو محترمہ فاطمہ جناح ان کی مخالف امیدوار بن کر ابھریں۔ یہ ایک عورت کا مزاحمتی سیاسی کردار تھا جس نے ایوب خان جیسے آمر کو چیلنج کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایوب خان جو مذہب کے استعمال اور ملاؤں کے خلاف تھے اس بار انہوں نے کمزور حکومت کو سنبھالا دینے کے لیے اسلام کا سہارا لیا۔ پیر صاحب دیول شریف نے محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف فتویٰ دیا کہ عورت اسلامی ملک کی سربراہ نہیں بن سکتی جس کو خوب اچھالا گیا۔ جب کہ جماعتِ اسلامی جو اسی نظریے پر یقین رکھتی تھی سیاسی مصلحت کے تحت فاطمہ جناح کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

وہ انتخابات تو ایوب خان کو جیتنا ہی تھے۔ وہ جیت گئے مگر فاطمہ جناح کا تاریخی کردار خواتین کے مزاحمتی تاریخ کا ایک اہم باب بن گیا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ نے بھی اسلامی جذبہ حب الوطنی اور فوج کے کردار کو بہت بڑھایا۔ مگر ایوب خان کی مخالفت بھی شروع ہو چکی تھی۔ وقت کے ساتھ یہ مخالفت بڑھتی گئی اور ملک میں ایوب مخالف تحریک شروع ہو گئی۔

ایوب خان کے کالے قوانین کی وجہ سے طلبا اور ملک کے مشرقی حصے سے لے کر تمام چھوٹے صوبوں میں بے اطمینانی کی لہر دوڑ گئی۔ بائیں بازو اور سیاسی مخالفین کو کچلنے کے لیے بدترین حربے استعمال کیے گئے۔ زرعی اصلاحات اور سبز انقلاب سبز باغ ثابت ہوئے۔ نئے بورژوا طبقے نے فوج اور نوکر شاہی کے کندھوں پر چڑھ کر ملک کے تمام وسائل پر قبضہ جما لیا۔

جیسے ہی ایوب آمریت نے اپنے دس سال پورے کیے سارے ملک میں شورش بپا ہو گئی۔ ایوب مخالف تحریک کا آغاز طالب علموں نے کیا جو یونیورسٹی آرڈی نینس سے تنگ تھے جس کے تحت کسی بھی طالب علم کو سیاسی سرگرمی میں حصہ لینے کے 'جرم' میں تین سال کے لیے نکالا جا سکتا تھا اور پاکستان کی ہر یونیورسٹی پر اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ طالبات کی بڑی تعداد اس تحریک میں شریک تھی۔ کراچی میں خصوصاً این۔ایس۔ایف اور گرلز اسٹوڈنٹس بہت سرگرم تھی۔ انہوں نے جلسے جلوسوں میں آنسو گیس، لاٹھیاں کھائیں گرفتاریاں پیش کیں۔ ایوب دورِ آمریت میں خواتین کا بڑا اہم مزاحمتی کردار تھا۔ بائیں بازو کی جماعتوں میں بھی خواتین منظم ہو رہی تھیں۔

ایوب خان زمامِ اقتدار یحییٰ خان کو سونپ کر چلے گئے۔ ۱۹۶۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد ڈالی اور سوشلزم کو اپنی معیشت قرار دیا۔ روٹی، کپڑا، مکان کا نعرہ بہت جلد مقبول ہوا اور بائیں بازو کی جماعتوں نے بھی پاکستان پیپلز پارٹی سے اپنے رشتے جوڑ لیے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کا اعلان ہوا تو یہ ملک کے پہلے عام انتخابات تھے۔ ملک کے مشرقی و مغربی حصوں میں انتخابات کی گہما گہمی شروع ہوئی تو خواتین بھی متحرک نظر آنے لگیں۔ تحریکِ پاکستان کے بعد ملک کے پہلے عام انتخابات میں بڑے پیمانے پر عورتیں سیاسی طور پر منظم اور متحرک نظر آئیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ، مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن اور علیحدگی گو کہ میرے اس مقالے کا موضوع نہیں ہیں لیکن میں اتنا ضرور کہوں گی کہ اس دوران سیاسی شعور اور سمجھ بوجھ رکھنے والی خواتین بڑے کرب سے گزر رہی تھیں۔ پیپلز پارٹی مغربی پاکستان میں کامیاب ہوئی تھی اور شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ مشرقی پاکستان میں۔ مجموعی طور پر عوامی لیگ ملک کی اکثریتی پارٹی بن کر ابھری تھی۔ لیکن اقتدار اکثریتی پارٹی کو منتقل کرنے کے بجائے وہاں کارروائی کے لیے فوج بھیج دی گئی اور پاکستان ٹوٹ گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ایک لبرل سوچ رکھنے والی جماعت بنائی تھی جس میں خواتین بڑی تعداد

میں شامل تھیں۔ جب ملک کا پہلا دستور ۱۹۷۳ء میں بنا اور یہ تمام سیاسی جماعتوں کی مشترکہ و متفقہ دستاویز تھی تو خواتین کو بھی مساوی حقوق دیئے گئے۔ (آرٹیکل ۲۵، ۲۷، ۳۰) اور جن کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق نہ کرنے کا عہد کیا گیا۔

یہ درست ہے کہ بڑی حد تک خواتین کو برابری کی سطح پر لانے کے لیے بھٹو کے دور میں کچھ اقدامات کیے گئے۔ مثلاً ڈی۔ایم۔جی سروسز اور فارن سروس میں خواتین کی شمولیت۔ حکومتی اداروں میں پانچ فیصد کوٹہ، بیگم رعنا لیاقت علی کو گورنری پھر سفارت کا عہدہ دینا۔ کنیز یوسف پہلی وائس چانسلر بنیں (قائداعظم، یونیورسٹی)، بیگم اشرف عباسی ڈپٹی اسپیکر بنیں (۱۹۷۵ء میں)، میکسیکو کی عالمی خواتین کانفرنس میں بیگم بھٹو نے خواتین کے وفد کی قیادت کی۔ عملی سیاست میں خواتین کی شمولیت بڑھانے کے لیے پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ میں ترامیم اور وراثتی حق کو مستحکم کرنے جیسی سفارشات پیش کی تھیں۔

بھٹو کی جمہوریت کا خاتمہ پہلے ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء لگائے جانے اور ۱۹۷۹ء میں ملک کے منتخب وزیراعظم کو پھانسی چڑھا کر کیا گیا۔ ضیاء الحق کا دور ایک پُرتشدد آمرانہ دور تھا جس میں پھانسیاں، کوڑے، ہاتھ کاٹنے، پیر کاٹنے کی سزائیں اسلام کے نام پر معاشرے میں خوف و ہراس پھیلانے کے لیے استعمال کی گئیں۔

جنرل ضیاء الحق نے پی۔این۔اے کی تحریک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلامی نظام نافذ کرنے کا نعرہ لگایا اور ملک کی دائیں بازو کی اسلامی پارٹی جماعت اسلامی کو اپنے ساتھ حکومت میں شریک کیا۔ جماعت اسلامی کو ضیاء الحق کی آمریت کے سہارے اپنے نظریات کو آگے بڑھانے کا سنہری موقع ہاتھ آیا۔ اسلام اور شریعہ کے نفاذ کی ابتدا تو یہ جماعتیں عورتوں ہی سے کرتی ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں بنائے جانے والے حدود آرڈی نینس کس طرح خواتین اور غیر مسلموں کو متاثر کریں گے۔ اسلام کے نام پر دستور کی شکل مسخ کر کے ملاؤں اور رجعت پسند ذہنیت کو کس قدر پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے گا۔ اس کا اندازہ لگانے میں کچھ عرصہ لگا۔ لیکن ایک بات تو شروع دن سے عیاں تھی کہ مذہب اور آمریت کا امتزاج پاکستانی معاشرے کے لیے زہرِ قاتل ثابت ہوگا۔

ضیاء الحق نے جماعت اسلامی کے نظریاتی سانچے میں نظامِ مصطفیٰ کے نعرے کو ڈھال کر اسلام کے نام پر نت نئے قوانین بنانے شروع کر دیئے۔ ۱۹۷۹ء میں نافذ ہونے والے حدود آرڈی

نینس نے ہاتھ کاٹنے، پاؤں کاٹنے اور کوڑوں کی سزائیں لاگو کر دیں۔ اس غیر منصفانہ قانون سے خواتین اور غیر مسلم براہِ راست متاثر ہوئے۔ انہیں دوسرے درجے کا شہری قرار دے دیا گیا۔ کوئی خاتون یا غیر مسلم جج نہیں بن سکتا تھا۔ قانون شہادت میں ترامیم کے ذریعے عورت کی گواہی آدھی کر دی گئی۔ یعنی دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر تھی۔ قصاص و دیت کے نفاذ نے قتل کی ذمے داری ریاست سے ہٹا کر فریقین کے خاندان تک محدود کر دیا اور عورت کی دیت بھی مرد سے نصف ٹھہری۔ حدود کی سزاؤں کے لیے غیر مسلم مردوں کی گواہی قابلِ قبول نہ تھی اور نہ ہی عورت کی۔ اگر خواتین یا غیر مسلموں کی موجودگی میں کوئی قتل یا 'زنا بالجبر' کا واقعہ پیش آیا تو قاتل کو حد کی سزا بلکہ تعذیر دی جائے گی۔ حد کی سزا صرف چار بالغ مسلم مردوں کی شہادت پر ہی دی جا سکتی تھی۔ اپنے سیاسی مخالفین کے لیے کوڑوں کی سزاؤں کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ یہاں تک کہ صحافیوں نے بھی کوڑے کھائے۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ آزادئ صحافت جیسی کوئی چیز نہ تھی۔

۱۹۷۹ء میں ملک کے منتخب وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔ طاقت کے استعمال نے خوف و ہراس کا ماحول پورے ملک پر طاری کر دیا۔ خواتین کے لیے 'چادر اور چار دیواری' کا نعرہ دیا گیا سرکاری اسکولوں میں اور دفاتر میں ایک مخصوص ڈریس کوڈ لازمی کر دیا گیا۔ کراچی میں کئی جگہ بڑے سائن بورڈ لگائے گئے جس میں عورتوں کی بے پردگی کو تمام معاشرتی برائیوں حتیٰ کہ قتل و غارت گری کا ذمے دار قرار دیا گیا۔ ان کے لباس پر روک ٹوک ہونے لگی (جیسا ایک بار پھر طالبان کے ساتھ حکومتی معاہدے کے بعد نہ صرف سوات، مالاکنڈ بلکہ ملک کے دوسرے علاقوں بشمول بڑے شہروں کے ہونے لگا ہے۔ اس کی ابتدا ضیاء الحق کے زمانے سے ہوئی تھی)۔

کراچی یونیورسٹی میں لڑکیوں کے کپڑوں پر تیزاب پھینکنے کے واقعات ہوئے۔ لاہور میں بیکری میں ایک خاتون کو سر نہ ڈھانکنے پر تھپڑ مار دیا گیا۔ لڑکیوں کو تمام مخلوط تعلیمی اداروں سے نکال کر ان کے الگ ادارے بنانے کی بات ہونے لگی۔ کھیلوں میں حصہ لینے پر پابندی لگا دی گئی اور یہ خبر گرم تھی کہ خواتین کی ڈرائیونگ بھی ممنوع ہو جائے گی اور پاکستان کو سعودی عرب بنا دیا جائے گا۔ ٹیلی ویژن ڈراموں میں خواتین کی شمولیت پر کی پابندیاں سخت ہو گئیں اور تمام اینکر زخواتین کو سروں پر دوپٹے ڈالنے کی ہدایت کی گئی۔

غرض یہ کہ عجیب وغریب ماحول بنادیا گیا جس میں عورت کی ذاتی زندگی اور شخصی آزادی کے بارے میں ہر چیز چیلنج کی جارہی تھی۔ ۱۹۷۹ء میں حدود آرڈی نینس میں شامل زنا آرڈی نینس، عورتوں کے لیے کتنا مہلک تھا اس کا اندازہ پہلی بار ۱۹۸۱ء میں کراچی میں ہونے والے فہمیدہ اللہ بخش کیس، میں شریعت کورٹ کے فیصلے سے ہوا جس میں پہلی مرتبہ سو کوڑوں کی سزا سنائی گئی تھی۔ فہمیدہ اور اللہ بخش نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی مگر فہمیدہ کے والدین کو یہ رشتہ پسند نہیں تھا۔ انہوں نے اللہ بخش کے خلاف اپنی بیٹی کو اغوا کرنے کا الزام لگا کر تھانے میں رپورٹ درج کروائی تھی۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ زنا آرڈ ننس کے نفاذ کے بعد یہ مقدمہ دونوں کے خلاف درج ہو جائے گا اور وہ ناجائز تعلقات اور زنا کے الزام میں پکڑ جائیں گے۔ یہی ہوا کہ پولیس نے انہیں شریعت کورٹ کے سامنے پیش کر دیا جو ضیاء الحق کے زمانے میں ہی قائم کی گئی تھی۔ گو کہ وہ میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے تھے اور فہمیدہ حاملہ بھی تھی مگر چونکہ نکاح نامہ رجسٹر نہیں تھا انہیں زنا کے الزام میں سو سو کوڑوں کی سزا سنا کر جیل بھیج دیا گیا۔

یہ چونکا دینے والا فیصلہ سامنے آیا تو سارے پاکستان میں کھلبلی مچ گئی خواتین جو کسی نہ کسی طرح اپنے حقوق کی جدوجہد کر رہی تھیں، انہوں نے سوچا کہ اب اگر نہیں بولے تو پھر یہ موقع نہیں ملے گا۔

شرکت گاہ نے ۱۶ ستمبر ۱۹۸۱ء کو کراچی میں ایک میٹنگ بلائی جس میں ایک پلیٹ فارم بنایا گیا جس کا نام خواتین محاذ عمل Women Action Forum رکھا گیا۔ اس میں تنظیموں کے علاوہ انفرادی طور پر متحرک سیاسی خواتین بھی شامل تھیں۔ خواتین نے یہ عہد کیا کہ وہ اپنے دفاع کے لیے لڑیں گی۔ یہ درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والی پروفیشنل خواتین تھیں جو اعلیٰ تعلیم، شخصی آزادی اور ملا ستوں کے دروازے بھی عورتوں پر بند ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ خوف و ہراس کے سناٹے میں نواتین نے جو ہراول دستہ بنایا وہ آج بھی اس ملک کی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ جو آگے چل کر فوجی آمریت کے خلاف بھی ایک تحریک بنی اور پدرشاہی کے حوالے سے عورتوں کے ایک انقلابی ایجنڈے کو آگے بڑھایا۔ مشہور اسکالر حمزہ علوی نے بھی ویف کے جھنڈے تلے خواتین کی تحریک کو ضیاء کی آمریت کے خلاف مزاحمت قرار دیا اور تاحیات عورتوں کی اس جدوجہد کی حمایت کرتے رہے۔

ویف نے ایک دستخطی مہم چلائی اور شریعت کورٹ کے فیصلے کے خلاف ہزاروں لوگوں کے دستخط جمع کیے۔ خالد اسحاق صاحب جو مشہور قانون دان تھے ان سے درخواست کی کہ وہ ہائی کورٹ میں اس فیصلے کے خلاف مقدمہ لڑیں۔ خالد اسحاق اسلامی فقہ کے ماہر تھے اور 'زنا آرڈی نینس' کو سخت غیر منصفانہ قانون سمجھتے تھے۔ ان کے دلائل پر ہائی کورٹ نے شریعت کورٹ کا فیصلہ منسوخ کر دیا۔ اس پہلی کامیابی نے عورتوں کے حوصلے بلند کر دیئے۔ لاہور اور پھر اسلام آباد میں بھی ویف کے چیپٹر قائم ہو گئے۔ اس مسئلے سے دوسرا مسئلہ جڑتا چلا گیا اور تحریک میں مختلف طبقوں کی آوازیں شامل ہوتی گئیں۔ عورتوں اور غیر مسلموں نے جو اسلامائزیشن کا خاص نشانہ تھے، ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ کوڑوں اور ہاتھ پیر کاٹنے کی سزاؤں کے خلاف آواز اٹھائی گئی جسے باشعور مردوں کی حمایت حاصل تھی۔

ڈریس کوڈ، کی پابندی، کھیلوں میں حصہ لینے پر پابندی اور قانون شہادت جیسے مسائل بھی اٹھائے گئے۔ یہاں تک کہ آمریت کے خلاف جمہوریت کی بحالی بھی ویف کے مطالبات میں شامل ہو گئی۔

۱۹۸۳ء میں ویف نے خواتین وکیلوں کی جماعت کے ساتھ ۱۲ فروری کو جلوس نکالا۔ خواتین ہائی کورٹ جا کر مجوزہ قانون شہادت کے خلاف اپنی قرارداد پیش کرنا چاہتی تھیں۔ مشہور انقلابی شاعر حبیب جالب بھی ان کے ساتھ تھے۔ ضیاء الحق کے زمانے میں کوئی جلوس نکالنا ریاست کے خلاف بغاوت کے زمرے میں آتا تھا۔ مارشل لاء ریگولیشن ۵۳ کے تحت کم از کم تین ماہ کی جیل تھی۔ ریاست نے اپنی پوری قوت جلوس کو منتشر کرنے پر لگا دی۔ آنسو گیس اور لاٹھیاں استعمال کی گئیں۔ حبیب جالب کا سر پھٹ گیا اور کئی خواتین گاڑیوں میں بھر کو کوٹ لکھپت جیل پہنچا دی گئی۔ یہ خبر نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں پھیل گئی۔ ضیاء الحق کو بین الاقوامی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ گرفتار خواتین چھوڑ دی گئیں مگر ویف نے ایک سیاسی تحریک کے طور پر اپنی اہمیت منوالی تھی۔

۱۹۸۳ء میں ہی ایم۔ آر۔ ڈی نے بحالیٔ جمہوریت کی تحریک شروع کر دی تھی جس میں سندھ میں عوامی تحریک نے گرفتاریاں اور قربانیاں دے کر اپنا مزاحمتی کردار نبھایا تھا۔ پیپلز پارٹی کے سینکڑوں کارکنان جیل میں تھے۔ انہیں عقوبت خانوں میں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ ان میں خواتین بھی شامل تھی۔

ویف نے بحالی جمہوریت کی تحریک کا کھل کر ساتھ دیا۔ عوامی تحریک کی خواتین کی ہر طرح سے مدد کی۔ جب سندھیانی تحریک شروع ہوئی جس میں سینکڑوں کسان خواتین شامل تھیں، تو ویف نے ان سے رابطے بڑھائے اور ۱۹۸۴ء میں سندھیانی تحریک بھی ویف میں شامل ہوگئی۔ جو اس وقت تک ایک تنظیم نہیں بلکہ پلیٹ فارم تھا جس میں سات تنظیمیں اور سیاسی خواتین شامل ہوئیں۔

ویف کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے تحریکِ نسواں کی بنیاد ڈالی گئی جس کی روحِ رواں، شیما کرمانی تھیں۔ یہ تنظیم فیمنسٹ نظریات پر مبنی خواتین کے حقوق کا شعور، ڈانس اور ڈراموں کے ذریعے عام کرتی تھیں۔ ابھی تک تحریکِ نسواں خواتین کی شخصی آزادی کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔

ویف نے ایک 'خودمختار' خواتین کی تحریک کی بنیاد ڈالی اس نے شعوری طور پر یہ فیصلہ کیا کہ کسی ملکی یا غیر ملکی ادارے سے کوئی فنڈنگ نہیں لی جائے گی۔ یہ ایک سیکولر اور فیمنسٹ نظریات رکھنے والی تنظیم ہے جس کا مقصد خواتین کے مساوی حقوق کے ساتھ ایک انصاف پر مبنی جمہوری معاشرے کا قیام ہے۔ یہ جدوجہد آج تک جاری ہے۔ ویف نے کبھی آمریت کی حمایت نہیں کی اس نے نیوکلیئر ہتھیاروں کی ترویج، مذہب کے ریاستی امور میں استعمال اور ملک کے اندرونی و بیرونی مسائل کو طاقت سے حل کرنے کی بھی مخالفت کی۔ اس نے چھوٹے صوبوں کے حقوق و اختیارات اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کی بھی حمایت کی۔

ویف یا خواتین محاذِ عمل نے کس حد تک کامیابی حاصل کی؟ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ خواتین کی اس تحریک سے حقوقِ نسواں کی جدوجہد پر دیرپا اثرات مرتب ہوئے یا نہیں؟ یہ سوالات پاکستان کے سیاسی سیاق وسباق سے ہٹ کر نہیں دیکھے جاسکتے۔ جو ملک پے در پے فوجی آمریت کا شکار ہوتا رہا ہے، معیشت آئی۔ ایم۔ ایف اور ورلڈ بینک کی سرپرستی میں ہو اور جمہوری ادارے ختم کر دیئے گئے ہوں، ظاہر ہے وہاں خواتین کے حقوق کی جدوجہد کس طرح کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی ہے۔ کیا مزدوروں کی تحریک کامیاب ہوئی؟ معاشرے کے دیگر محروم طبقوں نے کیا حاصل کیا ہے وہ بھی دیکھنا چاہیے۔ لیکن جو خواتین کی تحریک سے دور بیٹھے دانشور جو نہ کبھی سڑکوں پر آئے اور نہ لاٹھیاں کھائیں یا گرفتار ہوئے، وہ آرام سے تنقید فرماتے ہیں کہ خواتین کی تو پاکستان میں کوئی تحریک ہی نہیں ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔

ویف نے خواتین کی جدوجہد کو مخصوص حلقے سے نکال کر قومی دھارے میں لا کھڑا کیا ہے۔

انتخابات میں سیاسی جماعتوں کے لیے ویف نے خواتین کے مطالبات تیار کیے۔ ان کے ساتھ لابی کی۔ جب ضیاء الحق کے بعد بے نظیر اور نواز شریف کی جمہوری حکومتیں آئیں تو ویف نے خواتین کی سیاسی شمولیت اور حدود آرڈی نینس کی منسوخی کے مطالبات کے لیے زور ڈالا۔

ضیاء الحق کے دور میں خواتین کی مزاحمت کھل کر سامنے آئی۔ خواتین نے احتجاج کے نئے طریقے استعمال کیے۔ پکٹنگ، گانے، اسکٹ، اسٹریٹ تھیٹر، اسٹکرز اور سیمینار یہ سب طریقے استعمال کیے جاتے تھے۔ صحافی خواتین نے انگریزی اخباروں میں کسی حد تک آزادی کا فائدہ اٹھا کر عورتوں کے حقوق کے بارے میں آرٹیکل، خطوط اور پریس ریلیز کو نمایاں جگہ دی۔ کراچی میں دستک تھیٹر گروپ اور لاہور میں اجوکا کا قیام عمل میں آیا۔ لوک رقص کے آرٹسٹ پنجابی میں مختلف مسائل پر اسٹریٹ تھیٹر کرتے تھے۔ خواتین آرٹسٹوں نے عورتوں کے ساتھ ناانصافی اور ان کی آزادی کو اپنا موضوع بنایا۔ مزاحمتی شاعری اور نئی شاعرات سامنے آئیں۔ خواتین کے وہ مسائل جن پر بات کرنا برا سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً گھریلو تشدد، شادی کرنے کی آزادی، زنا بالجبر، جنسی طور پر ہراساں کیے جانے جیسے موضوع پر بحث و تمحیص ہونے لگی۔

ان ہی دنوں ۱۹۸۶ء میں ہیومن رائٹس کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس کی روحِ رواں خواتین ہی تھیں۔ لاہور میں 'اثر'، 'سیمرغ' اور 'عورت فاؤنڈیشن' جیسے ادارے بنے۔ جن کا کام خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔ خواتین اسکالرز نے تحقیق کا کام شروع کیا۔ فیمنزم پر پڑھا لکھا جانے لگا۔ جنوبی ایشیا میں عورتوں کی تحریکوں کے ساتھ رابطے قائم ہوئے۔ سری لنکا، ہندوستان، بنگلہ دیش، نیپال اور پاکستان کی خواتین نے اپنے مسائل کے حل کے لیے ایک دوسرے سے سیکھنے اور جاننے کا عمل شروع کیا۔ خصوصاً ہندوستان جس کے ساتھ عوامی رابطے بالکل منقطع تھے۔ خواتین نے باہم مل کر بیٹھنے کی ترکیبیں نکالیں۔ کبھی بنگلہ دیش تو کبھی سری لنکا یہاں تک کہ ایک دوسرے کے ملکوں میں آنے جانے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ملک میں ضیاء الحق کے خلاف مزاحمت زور پکڑ رہی تھی اور خواتین کئی حوالوں سے آگے بڑھ بڑھ کر اپنا حصہ ڈال رہی تھیں۔

یوں تو ضیاء الحق نے اپنی بنائی ہوئی مجلسِ شوریٰ میں خواتین کا حصہ ڈالا تھا جو کہ ۱۰ فیصد تھا۔ مگر یہ خواتین ان کی اپنی جماعت سے چنی گئی تھیں اور عورتوں کی تحریک سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

خواتین کے بارے میں پہلا انکوائری کمیشن ضیاء الحق کے زمانے میں بنا جس کی سربراہ بیگم

زری سرفراز تھیں۔ ایک تو ان کی رپورٹ کو بدل دیا گیا اور حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کی طرح سرد خانے میں دبا دی گئی۔

۱۹۸۸ء کے انتخابات میں خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ویف نے خواتین کے مطالبات سے متعلق اپنا منشور ہر سیاسی جماعت کے پاس جا کر پیش کیا اور مطالبہ کیا کہ حدود آرڈی نینس اور قانونِ شہادت جیسے قوانین منسوخ کیے جائیں۔ آٹھویں ترمیم واپس لی جائے اور سیاسی عمل میں عورتوں کا حصہ بڑھایا جائے۔

بے نظیر کی حکومت نے چند اقدامات خواتین کی بہتری کے لیے کیے۔ مثلاً ویمنز بینک کا قیام خواتین پولیس اسٹیشن، ویمنز منسٹری اور CEDAW عورتوں کے خلاف امتیازات کے خاتمے کے کنونشن پر دستخط اور بیجنگ کانفرنس میں پاکستان کے امیج کو ایک ترقی یافتہ ملک کی حیثیت سے متعارف کرا دیا۔ لیکن حدود آرڈی نینس کو بحال نہ کیا جائے۔ نتیجتاً ایک قومی اسمبلی ایسی آئی کہ جس میں صرف تین خواتین تھیں۔ خواتین پر بڑھتے ہوئے تشدد کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی۔ کاروکاری قدیم روایت ہے مگر ۱۹۸۰ء کی دہائی میں اس پر زیادہ لکھا گیا۔ ۹۲۔۱۹۹۱ء میں جب نواز شریف نے شریعت بل متعارف کیا تو خواتین نے پارلیمنٹ کے ممبران میں لابی کی۔ ویف نے پہلا کثیر البنیاد اتحاد ترتیب دیا جس میں ۳۰ سے زیادہ سول سوسائٹی، سیاسی جماعتوں، غیر مسلموں، طالب علموں، وکیلوں، صحافیوں کے فورم شامل تھے۔ جس کا ایک پوائنٹ ایجنڈا شریعت بل کی مخالفت تھا۔ یہ پہلی جوائنٹ ایکشن کمیٹی تھی جس کی سربراہی خواتین کی تنظیم کے پاس تھی۔

جہادِ افغانستان نے پاکستان میں مذہبی جنونیت کو فروغ دیا تھا۔ مدرسوں میں تیار ہونے والے ہزاروں جہادی روس کی شکست کے بعد اپنی توجہ پاکستان پر مبذول کر رہے تھے۔ طالبان نے افغانستان میں تعلیم کے دروازے بند کر کے خواتین کو گھروں میں بند کر دیا تھا۔ پاکستانی خواتین نے اپنی افغان بہنوں کے حق میں مہم چلائی۔ جلسے جلوس کیے اور پاکستان میں طالبانائزیشن کے خطرے سے ہم وطنوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

عورتوں کی یہ جدوجہد اس لحاظ سے منفرد تھی کہ وہ عورتوں کی شخصی آزادی، سیاسی و سماجی و قانونی حقوق سے لے کر ریاست پر مذہب کی گرفت اور معاشرے کی ناہمواری کے خلاف، غرض تمام

مسائل پر آواز اٹھا رہی تھیں، کیونکہ تمام انسانی حقوق کے مسائل عورتوں کے مسائل ہیں۔

ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ۱۹۹۶ء میں بنگال میں آرمی ایکشن کے ۲۵ سال پورے ہونے پر یہ خواتین ہی کی تنظیمیں تھیں جنہوں نے بنگال میں اپنی بہنوں پر ظلم و بربریت کے خلاف آواز بلند کی۔ ان سے معافی مانگی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ نہ صرف وہ بنگلہ دیش سے معافی مانگے بلکہ ظلم کرنے والوں کو قابلِ عبرت سزائیں دیں اور مظلوموں کو معاوضہ ادا کرے۔ خواتین کی تحریک میں سیاسی پختگی کی واضح نشانیاں مل رہی تھیں۔ نواز شریف نے قوم کو ایٹم بم بنانے کی نوید دی تو خواتین انجمنوں نے ایٹمی دوڑ کے خلاف مظاہرے کیے۔

جمہوری دور میں خواتین کے مطالبات حدود آرڈی نینس کی منسوخی، عورتوں پر تشدد کے خلاف مضبوط قوانین کی ضرورت، سرکاری ملازمتوں میں دس فیصد کوٹے کا نفاذ اور سیاسی نمائندگی کو ۳۳ فیصد تک کرنا تھا۔ لیکن جمہوری دور میں تو یہ ممکن نہ ہو سکا۔

۱۹۹۹ء میں نواز شریف کی حکومت کو ختم کر کے مارشل لاء لگا دیا گیا اور جنرل پرویز مشرف برسر اقتدار آ گئے۔ جنرل پرویز مشرف کی روشن خیالی کے دعوے پر سول سوسائٹی کے بہت سے کردہ افراد ان کے حامی بن گئے۔ مگر خواتین کی تحریک نے کھل کر ان کی مخالفت کی۔ میں کم از کم 'ولیف' کے بارے میں یہ دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اس فورم سے کبھی فوجی آمریت کی حمایت نہیں کی گئی۔ گو کہ مزاحمت ہر طرف سے معدوم ہو گئی تھی اور پڑھے لکھے دانشور بھی جنرل پرویز مشرف کو مسیحا سمجھنے لگے تھے۔

۲۰۰۱ء کے بلدیاتی انتخابات میں جنرل مشرف کی حکومت نے خواتین کی ۳۳ فیصد نمائندگی کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اس موقع پر خواتین انجمنوں کے درمیان یہ بحث پیدا ہوئی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے یا نہیں۔ اکثریتی رائے یہ بنی کہ یہ عام عورت کے لیے سیاسی عمل میں شمولیت کا ایک موقع ہے اس کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہیے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جنرل مشرف کی حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے۔ عورتوں کی نمائندگی کا فارمولا جب آگے بڑھا تو پارلیمنٹ کے ایوانوں میں اسے کم کر کے ۱۷ فیصد کر دیا گیا۔

اس نمائندگی کے کیا ثمرات حاصل ہوئے یہ الگ بحث ہے۔ جنرل مشرف کے دور میں خواتین کی مزاحمت کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ان میں اوکاڑہ ملٹری فارمز کے مزارعین کی

جدوجہد میں عورتوں کا کردار بھی شامل ہے۔ خواتین پر مشتمل 'اتھاپا' بریگیڈ نے ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ قربانیاں دیں اور وہ ابھی تک 'مالکی یا موت' کے مطالبے پر جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ان زمینوں پر جو ان کے آباؤ اجداد کام کرنے آئے ہیں، ان کا حق ہے۔ ریاستی کارندے جس طرح تشدد سے مزارعین کے منہ سے روٹی چھین لینا چاہتے ہیں وہ ناانصافی کی بدترین مثال ہے۔

یہاں پر میں فشر فورک فورم کی خواتین کا بھی ذکر کروں گی جو اپنے روزگار اور معدوم ہوتے ہوئے وسائل کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ ہزاروں کسان اور مزدور خواتین جن کا تعلق نچلے طبقے سے ہے شاید ایک ایسی سیاسی قیادت کی راہ دیکھ رہے ہیں جو ان کی قوت اور قربانیوں کے بل پر عام آدمی کی زندگی میں انقلاب لا سکے۔ لیکن یہ انہیں خود اپنی ہی صفوں میں تیار کرنی ہوگی۔

قومی آزادی کی جدوجہد میں مصروف خواتین کا بھی جرأت مندانہ کردار بلوچستان میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان سارے واقعات اور کرداروں کو تفصیلاً قلم بند کرنے کی ضرورت ہے۔

خواتین کی مزاحمت ایک بار پھر ۹ مارچ ۲۰۰۷ء کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی برطرفی پر سامنے آئی۔ جنرل پرویز مشرف کے آمرانہ اقدام نے وکیلوں کو سرگرم کر دیا۔ یہ ایک ایسی تاریخی تحریک تھی جس میں پاکستان کے عوام، سول سوسائٹی اور خواتین نے وکیلوں کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے مظاہرے کیے۔ لاٹھیاں کھائیں اور گرفتاریاں دیں۔ جنرل مشرف کے خلاف اس تحریک میں وہ اس وقت تک شامل رہیں۔ جب تک ۱۶ مارچ ۲۰۰۹ء کو چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری بحال نہ ہو گئے۔

آخر میں، میں ان خواتین رہنماؤں کا بھی ذکر کرنا چاہوں گی جن کی آمریت کے خلاف مزاحمت تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ پاکستانی خواتین کبھی مردوں سے پیچھے نہیں رہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح کی ایوب خان کے خلاف مزاحمت کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ میں محترمہ نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کا بھی ذکر کرنا چاہوں گی کہ کس طرح ذوالفقار علی بھٹو کو جنرل ضیاء الحق کی طرف سے قید میں ڈالے جانے اور پھانسی دیئے جانے کے بعد انہوں نے اپنی جماعت کی قیادت کی۔ بے نظیر بھٹو دوبارہ ملک کی وزیراعظم بنیں۔ بے نظیر کی جلاوطنی، قید و بند کی صعوبتیں، دنیا کے منع کرنے کے باوجود ملک واپس آنا اور شہادت قبول کرنا پاکستانی عورت کی جرأت اور عزم کی زریں مثال ہے۔

فوجی آمریتیں اور پاکستانی صحافت

توصیف احمد خاں*

پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل محمد ایوب خان نے ۸/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک میں مارشل لاء نافذ کیا۔ آئین کو منسوخ کیا۔ وزیراعظم فیروز خان نون کی حکومت کو توڑ دیا، قومی اسمبلی ختم کردی گئی۔ تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگادی گئی۔ اخبارات کا مارشل لاء حکومت پر تنقید کا حق ختم کردیا گیا۔ ایوب خان کے مارشل لاء کو صدر میجر جنرل ریٹائرڈ اسکندر مرزا کی حمایت حاصل تھی مگر ۲۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اسکندر مرزا کو برطرف کردیا گیا اور لندن جلاوطن کردیا گیا۔[1]

ایوب خان کی حکومت کو امریکہ کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ پاکستان سرد جنگ کے دوران اس خطے میں امریکہ کا سب سے بڑا اتحادی تھا۔ ایوب خان کی حکومت نے سوویت یونین کی جاسوسی کے لئے پشاور کے قریب بڈبیر کا فضائی اڈہ امریکہ کے حوالے کیا تھا۔ امریکہ کی دوستی کے لئے ضروری تھا کہ ان تمام قوتوں کا قلع قمع کیا جائے جو جمہوریت کی بحالی بنیادی شہری حقوق کے تحت صوبائی خودمختاری، آزادئ اظہار آزادئ صحافت کے لئے جدوجہد کررہی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ایوب خان کے اقتدار سنبھالتے ہی پورے ملک میں سیاسی کارکنوں، ادیبوں، مزدور اور کسان کارکنوں، وکلاء اور صحافیوں کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ مارشل لاء کے نفاذ کے ایک ہفتے میں پہلے ہفتہ وار لیل ونہار کے ایڈیٹر سید سبط حسن کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا۔ پھر روزنامہ 'امروز' لاہور کے چیف ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی کو گرفتار کیا گیا۔ روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' کے چیف ایڈیٹر فیض احمد فیض ان دنوں ممتاز شاعر حفیظ جالندھری کے ہمراہ ادبی کانفرنس میں شرکت کے

---

* شعبۂ ابلاغ عامہ، وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی۔

لئے تاشقند گئے ہوئے تھے۔ انہیں لاہور واپسی پر گرفتار کرلیا گیا۔ ان صحافیوں کو سیکیورٹی ایکٹ کے تحت سی کلاس میں جیل میں رکھا گیا۔ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جسٹس ایم آر کیانی کے حکم پر فروری ۱۹۵۹ء میں ان صحافیوں کو رہا کیا گیا۔ ایوب خان کی حکومت نے اخبارات پر پری سنسر شپ عائد کردی۔[۲] پھر ۱۹/اپریل ۱۹۵۹ء کو فوجی حکومت نے جمہوریت شہری آزادیوں، مزدوروں کسانوں کے حقوق صوبائی خودمختاری اور امریکی اثرات کے خلاف آواز اٹھانے والے اخباری ادارہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے اخبارات روزنامہ 'پاکستان ٹائمز'، روزنامہ 'امروز' لاہور ہفت روزہ 'لیل ونہار' اور ہفت روزہ 'اسپورٹس ٹائمز' کو سرکاری تحویل میں لے لیا۔ روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' کے ایڈیٹر مظہر علی خان نے ایک آرٹیکل میں لکھا تھا کہ صدر ایوب خان کی کابینہ کے دو وزراء جنرل کے ایل شیخ اور ذوالفقار علی بھٹو اس آپریشن کی نگرانی کررہے تھے۔

۱۹/اپریل ۱۹۵۹ء کو مرکزی حکومت نے سیکیورٹی آف پاکستان آرڈیننس ۱۹۵۹ء کے تحت پاکستان کے اخبارات کے انتظامات چلانے والے ادارہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ بورڈ آف ڈائریکٹرز کو توڑ کر اس ادارہ کے اخبارات روزنامہ 'پاکستان ٹائمز'، روزنامہ 'امروز' ہفت روزہ 'لیل و نہار' اور ہفت روزہ 'اسپورٹس ٹائمز' کو قومی تحویل میں لے لیا۔ حکومت نے سیکیورٹی آف پاکستان آرڈیننس کے تحت 'پاکستان ٹائمز' کے مدیر مظہر علی خان، 'امروز' کے مدیر احمد ندیم قاسمی اور ہفت روزہ کے مدیر سید سبط حسن کو گرفتار کرلیا۔[۳]

'پاکستان ٹائمز' کے اس وقت کے ایڈیٹر مظہر علی خان کے صاحبزادے اور بائیں بازو کے دانش ور مصنف طارق علی نے تحریر کیا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے ان کے والد مظہر علی خان کو ۱۹/اپریل ۱۹۵۹ء کی ساری رات اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ 'پاکستان ٹائمز' کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دیتے رہیں مگر مظہر علی خان تیار نہ ہوئے اور دوسرے دن انہوں نے ایڈیٹر شپ سے استعفیٰ دیدیا۔ ضمیر نیازی نے اپنی کتاب 'صحافت پابند سلاسل' پر تحریر کیا ہے کہ پی پی ایل پر سرکاری قبضہ کا منصوبہ ایوب حکومت کے وزیر داخلہ بریگیڈیئر ایف آر خان کی ہدایت پر پاکستان کی انٹیلی جنس سروسز کے سربراہ میاں انور نے تیار کیا تھا اور ممتاز قانون دان منظور قادر نے اس کا قانونی مسودہ تیار کیا تھا۔ ایوب حکومت نے پی پی ایل کے اخبارات کو سرکاری تحویل میں لے کر دو مقاصد فوری طور پر حاصل کئے۔ ایک مقصد تو ان اخبارات کی آواز بند کرنا تھا۔ دوسرا مقصد باقی

آزاد اخبارات کی گردن پر تلوار کھڑی کرنا تھا تا کہ جو اخبارات حکومت کی ہدایات کی مخالفت کریں اس کے مالک سے اخبار کی ملکیت چھین لی جائے۔[۴]

پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے اخبارات پر فوجی حکومت کے قبضے سے نہ صرف آزادئ صحافت پر قدغن لگی بلکہ شہری کے کاروبار کرنے کے حق کو بھی غصب کیا گیا اور اس فیصلے سے اخباری تنظیموں آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی اور کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کی ہیت پر بھی ضرب لگی مگر ان دونوں تنظیموں نے اس اہم مسئلے پر خاموشی اختیار کر لی۔

ڈھاکہ، فروری ۱۹۶۰ء میں پی ایف یو جے کی ایگزیکٹو کونسل کا اجلاس ڈھاکہ میں ہوا۔ اجلاس میں 'امروز' کے حمید ہاشمی اور منو بھائی نے پی پی ایل کے اخبارات پر حکومت کے فیصلے کے خلاف قرارداد پیش کی۔ ایگزیکٹو کونسل نے یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کی۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ایوب حکومت نے پی پی ایل کے اخبارات پر قبضہ کر کے آزادئ صحافت پر پابندیاں عائد کیں۔ اس فیصلے سے ملک میں جمہوریت کے بجائے آمریت مستحکم ہوگی۔ قرارداد میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ پی پی ایل کے اخبارات کو ان کے سابقہ مالکان کے حوالے کیا جائے۔[۵]

جنرل محمد ایوب خان نے اپنی حکومت کو سول حکومت میں تبدیل کرنے اور مارشل لاء کو ختم کرنے کے ایک منصوبے پر عملدرآمد شروع کیا۔ اس منصوبے کے تحت ایوب خان ایک ریفرنڈم کے ذریعے صدر منتخب ہو گئے اور پھر ۱۹۶۰ء میں پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس ۱۹۶۰ء نافذ کیا گیا۔ اس قانون میں وہ تمام پابندیاں شامل کر دی گئیں جو ۱۹۸۰ء سے مختلف قوانین کی صورت میں ملک میں نافذ رہیں۔ اس قانون کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مارشل لاء ضوابط کے ختم ہونے کے بعد اخبارات کی آزادی کو کنٹرول کیا جا سکے۔[۶]

۱۷ر جنوری ۱۹۶۰ء کو حکومت نے پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس ۱۹۶۰ء کے نفاذ کے بعد تمام اخبارات کو ہدایت کی کہ وہ نئے ڈیکلریشن حاصل کریں کیونکہ پرانے ڈیکلریشن پریس اینڈ رجسٹریشن آف بکس ۱۹۶۷ء کے تحت جاری کئے گئے تھے۔ حکومت کا کہنا تھا کہ پرانے قانون کے منسوخ ہونے کے بعد یہ ڈیکلریشن بھی منسوخ ہو گئے۔[۷]

اس قانون کے تحت حکومت کو اخبارات کو اپنی پالیسی کے مطابق ڈیکلریشن جاری کرنے کے اختیارات حاصل ہوئے۔ یوں حکومت کو اخبارات کو بلیک میل کرنے کا ایک اور

طریقہ مل گیا۔

۱۲ر جولائی ۱۹۶۰ء کو کوئٹہ میں خصوصی فوجی عدالت نے اخبار 'تنظیم' کے ایڈیٹر محمد حسن نظامی کو ایک قابل اعتراض آرٹیکل کی اشاعت پر مارشل لاء ریگولیشن ۷۰ کے تحت ایک سال قید اور جرمانہ کی سزا دی ہے۔ بعد میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے محمد حسن نظامی کو رہا کر دیا کیونکہ وہ اپنی سزا قید کاٹ چکے تھے۔

فروری ۱۹۶۰ء میں سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے 'کائنات' بہاولپور کے ایڈیٹر ولی اللہ احمد، رپورٹر شیر انور کو بالترتیب ۱۵ر اور ۹ ماہ قید اور فی کس ۱۰ر ہزار روپے جرمانے کی سزا دی۔ ان صحافیوں پر حکومت کے خلاف نفرت اور بے اطمینانی پھیلانے کا الزام تھا۔ پی ایف یو جے نے ولی اللہ احمد اور شیر انور کو دی گئی سزاؤں کی مذمت کی اور صحافیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا ان صحافیوں کو ۳ ماہ بعد رہا کیا گیا۔[8]

۲۱ نومبر ۱۹۶۰ء کو راولپنڈی کے سٹی مجسٹریٹ نے 'پاکستان ٹائمز' کے چیف رپورٹر اسرار احمد اور رپورٹر سلامت علی کے خلاف سیکریٹ ایکٹ کے تحت مقدمہ درج کر لیا۔ سلامت علی راولپنڈی یونین آف جرنلسٹس کے جنرل سیکریٹری تھے۔ راولپنڈی یونین آف جرنلسٹس نے صحافیوں کے خلاف سیکریٹ ایکٹ کے تحت مقدمہ درج کرنے کی مذمت کی ہے۔ آر یو جے نے مطالبہ کیا ہے کہ امتناعی قوانین کے تحت صحافیوں کے خلاف کارروائی کا سلسلہ بند کیا جائے اور صحافیوں سے خبر کا ذریعہ پوچھنے کے لئے دباؤ نہ ڈالا جائے۔ یونین کا کہنا تھا کہ حکومت کا اقدام آزادیٔ صحافت پر حملے کے مترادف ہے۔[9]

۱۵ر جون ۱۹۶۱ء کو ایوب خان کی حکومت نے ملک کی خبر رساں ایجنسی ایسوسی ایٹ پریس آف پاکستان (APP) کو قومی تحویل میں لے لیا۔ یوں پاکستانی اخبارات کو ملکی اور غیر ملکی خبروں کی آزادانہ فراہمی کا سب سے بڑے ذریعے پر حکومت نے کنٹرول حاصل کر لیا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے اے پی پی کے قومیانے کی شدید مذمت کی۔ پی ایف یو جے کی فیڈرل ایگزیکٹو کونسل کے ڈھاکہ کے اجلاس میں منظور کی جانے والی قرارداد میں کہا گیا تھا کہ اے پی پی کو قومیانے سے ملک میں آزادیٔ صحافت پر بندش عائد ہو گئی ہے اور اب حکومت اپنی مرضی سے ملکی اور خاص طور پر غیر ملکی خبروں کو اخبارات کے نیوز رومز تک پہنچنے سے پہلے کنٹرول کرے

گی۔ جو اخبارات اہم خبروں سے محروم ہو جائیں گے اور قارئین کا مفاد متاثر ہوگا۔[10]

جون ۱۹۶۳ء میں اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں کہ حکومت پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس ۱۹۶۰ء کو مزید سخت کر رہی ہے اور ایک ترمیمی آرڈیننس میں اخبارات کو پی پی ایل کے اخبارات کی طرح سرکاری تحویل میں لینے اور اخبارات کے اجراء کے لئے لائسنس کے نظام کے نفاذ کے لئے شقیں شامل کی جا رہی ہیں۔ ان خبروں کی اشاعت سے صحافیوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔[11]

۱۱ اگست ۱۹۶۳ء کو راولپنڈی کے صحافیوں نے اخبارات پر ممکنہ پابندیوں کے خلاف ایک گھنٹے کی ہڑتال کی اور قومی اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کیا۔ راولپنڈی یونین آف جرنلسٹس نے ایک قرارداد میں کہا کہ اخبارات کو قومیانے اور لائسنس کے نظام سے اخباری صنعت متاثر ہوگی اور مجوزہ نظام میں صحافیوں کا پیشہ ورانہ حق متاثر ہوگا اور آزادئ صحافت پر نئی پابندیاں عائد ہوں گی۔[12]

۳ ستمبر ۱۹۶۳ء کو پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس ۱۹۶۰ء میں ترمیم کر دی گئی۔ ان ترمیمات میں اخبارات کے اجراء کے لئے لائسنس اور اخبارات کو قومیانے کی شقیں شامل نہیں تھیں مگر اخبارات سے اعلیٰ عدالتوں کی کارروائی اور قومی و صوبائی اسمبلیوں کی کارروائی کی براہ راست اشاعت کا حق چھین لیا گیا تھا اور اخبارات کے اجراء کے نئے ڈیکلریشن پر نئی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ حکومت کو ڈیکلریشن منسوخ کرنے، اخبارات سے ضمانت طلب کرنے کے اختیارات حاصل ہو گئے تھے۔

۵ ستمبر ۱۹۶۳ء کو پنجاب یونین آف جرنلسٹس کی اپیل پر صحافیوں نے پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس کے خلاف پنجاب اسمبلی کے سامنے مظاہرہ کیا۔ صحافی اپنے ہاتھوں میں بینر اور پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے جن میں اس قانون کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔[13]

۶ ستمبر ۱۹۶۳ء کو ایسٹ پاکستان یونین آف جرنلسٹس نے فیصلہ کیا ہے کہ پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس ۱۹۶۳ء کے خلاف ایک دن کی ہڑتال کی جائے۔[14]

۶ ستمبر ۱۹۶۳ء کو کراچی یونین آف جرنلسٹس نے فیصلہ کیا ہے کہ ۹ ستمبر کو ملک بھر میں ہڑتال کی جائے۔[15]

۷ستمبر۱۹۶۳ءکوراولپنڈی، پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے اپنی ملحقہ تنظیموں کی پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس کے نفاذ کے خلاف ۹ستمبر کو ہڑتال کرنے کے فیصلے کی توثیق کردی۔

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی فیڈرل ایگزیکٹو کمیٹی نے اپنے اس اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ''پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس ترمیمی ۱۹۶۳ءجدید صحافت کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا۔ اس آرڈیننس میں انتظامیہ کے تحفظ پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور آرڈیننس میں جدید صحافت کی بنیادی ضرورت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس قانون میں عوام کو فوری اطلاعات فراہم کرنے کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اس آرڈیننس کے تحت خبروں کا معروضیت کے اصول کے مطابق تحریر ہونا مشکل ہوگا۔ اب صحافیوں کے پاس خبر تحریر کرنے کے طریقے اور اس کی سرخی تحریر کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ اب حکومت کو قاری کے مفاد سے زیادہ اخبارات میں کوریج ملے گی۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ اسی آرڈیننس کے نفاذ کے بعد رپورٹر اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے خبر تحریر نہیں کر سکے گا بلکہ اس کو سنسر شدہ مواد کو خبر کے طور پر تسلیم کر کے پیش کرنا ہوگا۔ اس صورتحال میں اخبارات میں صحت مندانہ مقابلہ کا رجحان ختم ہوجائے گا اور سارے اخبارات میں ایک جیسی خبریں شائع ہونگی اور یہ یکسانیت قاری کو مایوس کرے گی۔ پی ایف یو جے کی قرارداد میں کہا گیا تھا کہ اس قانون کی بناء پر پریس نوٹ اور ہینڈ آؤٹ کی لازمی اشاعت سے تمام اخبارات میں ایک ہی الفاظ استعمال ہونگے یا دوسری صورت میں اخبارات کو بندش کا سامنے کرنا پڑے گا۔ اس صورتحال میں چھوٹے اخبارات کی بقا کا مسئلہ پیدا ہوگا۔ ان صحافتی اصولوں کی خلاف ورزی کے باوجود آرڈیننس کے نفاذ سے حکومت کو شکست کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ عوام کے لئے ان خبروں کا مطالعہ کرنا مشکل ہوگا۔ اس صورت میں عوام غیر ملکی ریڈیو سننے اور غیر ملکی اخبارات و جرائد پڑھنے کو ترجیح دیں گے۔ یہ صورتحال نہ تو حکومت کے لئے مناسب ہوگی اور اخبارات کے پبلشرز کو معاشی طور پر ایک بحران کا سامنا کرنا پڑے گا۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں نے اس آرڈیننس کا متن تحریر کیا ہے۔ وہ صحافت کی باریکیوں سے واقف نہیں۔ اس صورتحال میں صحافیوں کے مستقبل اور ملک کی ساکھ کو نقصان پہنچانے کے علاوہ کوئی اور مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا۔ قرارداد میں کہا گیا کہ اس آرڈیننس سے عوام براہ

راست متاثر ہونگے۔اس آرڈیننس کے تحت اخبارات سے ضمانتیں طلب کی جائیں گی۔یوں اس صورتحال سے صحافیوں کا نقصان ہوگا۔ایف ای سی کی قرارداد میں مزید کہا گیا کہ آرڈیننس کی دفعات ۲۶،۲۳اور ۲۷ کے تحت باب ۶ کو تبدیل کیا ہے جس کی بناء پر ہائی کورٹ کے اختیار کو ختم کر کے ٹریبونل قائم کرنے کا طریقہ کار درج کیا ہے۔انتظامیہ کو اتنے بے پناہ اختیارات دے کر اخبارات کی آزادی کو ختم کیا گیا ہے۔[16]

۹ستمبر ۱۹۶۳ء کو پورے ملک کے صحافیوں نے پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس ترمیمی کے خلاف احتجاجاً پی ایف یو جے کی اپیل پر ایک روز کی ہڑتال کی۔اس ہڑتال کی آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی (APNS)اور کونسل آف نیوز پیپرز ایڈیٹرز نے بھی حمایت کی۔۹ستمبر کو کراچی پریس کلب میں کراچی یونین آف جرنلسٹس (KUJ) کے زیر اہتمام ایک احتجاجی جلسہ ہوا۔جلسہ سے اے پی این ایس کے رہنما 'جنگ' کے مالک میر خلیل الرحمٰن، سی پی این ای کے 'حریت' کے ایڈیٹر فخر ماتری اور سی پی این ای کے رہنما اور 'ڈان' کے ایڈیٹر الطاف حسین نے خطاب کیا۔اس جلسے میں صحافیوں کے علاوہ اخبارات کے مالکان اور ایڈیٹروں نے بھی شرکت کی۔ایسے جلسے پورے ملک میں منعقد ہوئے۔[17]

۱۰ر ستمبر ۱۹۶۳ء کو صدر جنرل ایوب خان نے ملک کے اخبارات کے ایڈیٹروں سے ملاقات کی اور ۱۳ر ستمبر ۱۹۶۳ء کو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے گورنروں نے پریس اینڈ پبلکیشن آرڈیننس پر عملدرآمد کو ایک ماہ کے لئے روک دیا۔

۲۱ستمبر ۱۹۶۳ء کو پہلی بار کراچی میں اخباری صنعت کی تین بنیادی تنظیموں پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (PFUJ)، آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی (APNS)اور کونسل آف نیوز پرپرز ایڈیٹرز (CPNE) نے ایک جوائنٹ ایکشن کمیٹی (JAC) قائم کی جس کے کنوینر روزنامہ 'ڈان' کے ایڈیٹر الطاف حسین تھے۔جوائنٹ ایکشن کمیٹی کی ایک ذیلی کمیٹی بنائی گئی جس میں تینوں تنظیموں کے دو دو نمائندوں کو شامل کیا گیا۔اس ذیلی کمیٹی میں اے پی این ایس کی جانب سے چودہری ظہور الٰہی 'پاکستان ٹائمز'، حامد محمود 'کوہستان' متبادل نمائندے کے طور پر روزنامہ 'ڈان' کے محمود ہارون، سی پی این ای کی جانب سے الطاف حسین 'ڈان'، مجید نظامی اور متبادل نمائندے کے طور پر تفضل حسین 'اتفاق' اور پی ایف یو جے کی طرف سے اسرار احمد (پی

ایف یو جے کی آل پاکستان ایکشن کمیٹی کے کنوینر) اور اے بی ایم موسیٰ (پاکستان آبزرور) شامل تھے۔ جوائنٹ ایکشن کمیٹی کے تحت راولپنڈی پریس کلب میں جلسہ ہوا۔ جلسہ سے پریس کلب راولپنڈی کے صدر اے ایچ رضوی، اے پی این ایس کے صدر محمود ہارون، سی پی این ای کے صدر فخر ماتری اور پی ایف یو جے کے صدر صفدر قریشی نے خطاب کیا۔ جوائنٹ ایکشن کمیٹی کے ارکان اور حکومت کے درمیان مذاکرات کے بعد ۱۰/اکتوبر ۱۹۶۳ء ڈھاکہ اور لاہور میں ایک نئے جامع قانون کا اعلان کیا گیا اور ۱۲/اکتوبر کو پریس اینڈ پبلکیشن ترمیمی آرڈیننس ۱۹۶۳ء میں بعض ترامیم کی گئیں۔ ان ترامیم کے تحت اعلیٰ عدالتوں کی کارروائی اور قومی وصوبائی اسمبلیوں کی کارروائی کی اشاعت پر پابندی ختم کردی گئی۔[18] ان مذاکرات میں شریک پی ایف یو جے کے صدر صفدر قریشی کا کہنا ہے کہ سی پی این ای کے رہنما الطاف حسین کے حکومت کے لئے نرم رویے کی بناء پر اس سیاہ قانون کی صرف چند شقیں ختم ہوسکیں۔ اگر یہ رہنما کمزور رویے کا اظہار نہ کرتے تو یہ ترمیمی آرڈیننس مکمل طور پر منسوخ ہوجاتا اور اخبارات کو بدستور متعدد پابندیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو بعد میں جاکر مزید سخت کردی گئیں۔ پی ایف یو جے نے اس آرڈیننس کی مکمل طور پر منسوخی کا مطالبہ برقرار رکھا۔[19]

۸ نومبر ۱۹۶۳ء کو لاہور سے شائع ہونے والے اخبار 'کوہستان' پر پابندی لگادی گئی اور اس کے ایڈیٹر عالی رضوی، مینیجنگ ایڈیٹر شیخ حامد محمود کو لاہور سے اور چیف ایڈیٹر نسیم حجازی کو راولپنڈی سے گرفتار کرلیا گیا۔ یہ گرفتاریاں پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس کی خلاف ورزی کے نتیجے میں عمل میں آئیں۔[20]

ڈھاکہ کا روزنامہ 'اتفاق' عوامی لیگ کا حامی بااثر اور کثیر الاشاعت اخبار تھا۔ اسے نیشنل عوامی پارٹی کے صدر مولانا عبدالحمید خان بھاشانی نے ہفتہ وار کے طور پر شروع کیا تھا۔ پھر تفضّل حسین عرف مانک میاں نے اس کو روزنامے میں تبدیل کیا تھا۔ تفضّل حسین عوامی لیگ کے بانی اور سابق وزیراعظم حسین شہید سہروردی کے مداح تھے۔ دوسری طرف ان کے حکام سے بھی خوشگوار تعلقات تھے۔ 'اتفاق' مشرقی پاکستان کے عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ صدر ایوب خان نے ۱۹۶۴ء کی آخری سہ ماہی میں صدارتی انتخابات کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لئے روزنامہ 'اتفاق' کے خلاف کارروائی کا آغاز ہوا۔

۱۷/اپریل ۱۹۶۴ء کو ڈھاکہ کے اخبار 'اتفاق' کو اشتعال انگیز خبروں کی اشاعت پر حکومت مشرقی پاکستان نے ۲۵ ہزار روپے ضمانت جمع کرنے کا نوٹس جاری کیا ہے۔ حکومت نے یہ اقدام پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس کی دفعہ (۲)۲۲ کے تحت کیا ہے۔ 'اتفاق' کے ایڈیٹر تفضّل حسین نے حکومت کے اقدام کو غلط قرار دیا ہے۔[۲۱] ایسٹ پاکستان یونین آف جرنلسٹس کی ایگزیکٹو کونسل نے روزنامہ 'اتفاق' کے خلاف کارروائی کی مذمت کی ہے۔ ایگزیکٹو کونسل نے ایک قرارداد میں کہا تھا کہ اس کارروائی کا مقصد اخبار کی آزادی کو سلب کرنا ہے۔ قرارداد میں مزید مطالبہ کیا گیا کہ پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس ۱۹۶۳ء منسوخ کیا جائے۔[۲۲]

میاں افتخار الدین نے ہفت روزہ 'لیل ونہار' کو لاہور میں شائع ہونے والے اپنے اخبارات روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' اور روزنامہ 'امروز' کے ادارہ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے تحت شائع کیا تھا۔ معروف ادیب سید سبط حسن اس کے ایڈیٹر اور فیض احمد فیض چیف ایڈیٹر تھے۔ 'اخبار خواتین' کے سابق ایڈیٹر حسن عابدی مرحوم اور ممتاز کالم نگار عبدالقادر حسن اس کے شعبہ ادارت میں شامل تھے۔ 'لیل ونہار' نے جلد ہی ہفت روزہ کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر لی۔ 'لیل ونہار' میں ملکی اور بین الاقوامی سیاست، عالمی حالات، اقتصادی صورتحال، ملکی اور غیر ملکی ادب، فلم تھیٹر ڈراموں پر معیاری آرٹیکلز اور تصاویر شائع ہوتی تھیں۔ اخبار کے ایڈیٹر سید سبط حسن اور فیض صاحب نے اس کی پالیسی مرتب کی تھی اور جدید لے آؤٹ رائج کیا تھا۔ سید سبط حسن کی غیر موجودگی میں فیض احمد فیض ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اپریل ۱۹۵۹ء میں جب حکومت نے پی پی ایل کے اخبارات کو سرکاری تحویل میں لیا تو سید سبط حسن کو برطرف کر دیا گیا اور سیکیورٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور ممتاز شاعر صوفی تبسم کو نیا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اس ہفت روزہ اخبار کی پالیسی تبدیل کر دی گئی۔ یوں رسالے کی کشش کم ہو گئی۔ صوفی صاحب کو ہفت روزہ اخبار کی ادارت کا تجربہ نہیں تھا۔ ان کے بعد اشفاق احمد کو 'لیل ونہار' کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا مگر یہ رسالہ پھر وہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکا جو سید سبط حسن کی ادارت میں حاصل کی تھی۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کی انتظامیہ نے مالیاتی خسارے کی بناء پر ۲۴/اپریل ۱۹۶۴ء کو اس کو بند کرنے کا فیصلہ کیا۔[۲۳]

۲۶ جولائی ۱۹۶۴ء کو روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' کے راولپنڈی ایڈیشن میں کراچی کے نمائندے منہاج برنا کی یہ خبر شائع ہوئی کہ گورنر مغربی پاکستان اپنے عہدے سے مستعفی ہونے پر

غور کر رہے ہیں۔[۲۴]

گورنر ہاؤس لاہور نے اس خبر کی تردید کی جو اخبار میں شائع ہوئی۔ حکومت کی ایماء پر پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے لئے مالک چوہدری ظہور الٰہی نے منہاج برنا پر دباؤ ڈالا کہ وہ خبر کے ذریعہ کا انکشاف کریں۔ منہاج برنا نے اصولی موقف اختیار کیا اور ذریعہ بتانے سے انکار کیا۔ پی پی ایل کی انتظامیہ نے منہاج برنا اور 'پاکستان ٹائمز' راولپنڈی ایڈیشن کے انچارج آر اے خان کو معطل کر دیا۔ پی ایف یو جے اور ملحقہ تنظیموں نے منہاج برنا اور آر اے خان کی معطلی کی مذمت کی اور ان صحافیوں کی بحالی کے لئے کئی مہینے تک مہم جاری رکھی جس پر حکومت ان صحافیوں کی بحالی پر تیار ہوئی۔

ایوب خان نے ۱۹۶۴ء کے آخر میں صدارتی انتخاب کرانے کا فیصلہ کیا۔ مخالف سیاسی جماعتوں نے قائداعظم کی ہمشیرہ فاطمہ جناح کو صدارتی امیدوار نامزد کیا۔ فاطمہ جناح نے اپنی انتخابی مہم میں پورے ملک میں خاصی گہما گہمی پیدا کی۔ فاطمہ جناح کو کراچی، لاہور اور مشرقی پاکستان میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔ اگرچہ ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کے نظام کے تحت دونوں صوبوں سے ۴۰، ۴۰ ہزار بی ڈی اراکین کو انتخابی کالج میں شامل کیا تھا جنہیں کنٹرول کرنا آسان تھا مگر ایوب خان کی حکومت نے مخالف اخبارات کے خلاف کارروائی شروع کی۔ کراچی سے ممتاز صحافی اقبال حسن برنی کی زیر ادارت شائع ہونے والا انگریزی زبان کا ہفتہ وار 'آؤٹ لک' اور لاہور کا ہفت روزہ 'اقدام' ایوب حکومت پر تنقید کرنے پر حکومت کے دباؤ کی بناء پر یہ دونوں اخبار بند ہو گئے۔ 'نیو یارک ٹائمز' نے ۱۳ اگست ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں تحریر کیا کہ حکومت کی اس کارروائی کے بعد مغربی پاکستان میں حکومت پر تنقید کرنے والا کوئی اخبار نہیں بچا ہے۔ البتہ مشرقی پاکستان میں اپوزیشن کے چار اخبار چل رہے ہیں۔[۲۵]

حکومت نے مشرقی پاکستان کے اخبارات پر نئی پابندیاں عائد کیں۔

نیشنل پریس ٹرسٹ کی انتظامیہ نے روزنامہ 'مشرق' لاہور کے ایڈیٹر عبدالوحید کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ عبدالوحید ایوب حکومت کے حامی نہیں تھے۔

یکم جنوری ۱۹۶۵ء کو پی ایف یو جے کے صدر اسرار احمد نے الزام لگایا ہے کہ 'مشرق' لاہور کے ایڈیٹر عبدالوحید کو سیاسی وجوہات کی بناء پر ملازمت سے برطرف کیا گیا ہے۔ انہوں نے

کہا کہ یہ کارروائی آزادیٔ صحافت کے منافی ہے۔[۲۶]

۲۸ جنوری ۱۹۶۵ء کو لاہور میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان (APP) کے مینیجر ضمیر احمد قریشی کو نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔ اس حملے میں بلوچستان سے تعلق رکھنے والے مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن باقی بلوچ شدید زخمی ہوئے۔ یہ حملہ رکن قومی اسمبلی ملک غلام جیلانی کی قیام گاہ پر ہوا جہاں عبدالباقی بلوچ ملک غلام جیلانی سے ملاقات کے لئے گئے تھے اور ضمیر احمد قریشی ان کے ہمراہ تھے۔ یہ حملہ ملک جیلانی کی کوٹھی کے احاطے میں ہوا۔

۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخابات میں جنرل ایوب خان کامیاب ہو گئے اور محترمہ فاطمہ جناح کو شکست ہوگئی۔ کراچی میں مسلم لیگ کونسل کی امیدوار فاطمہ جناح نے صدارتی انتخاب میں کامیابی حاصل کی تھی۔ صدارتی انتخاب کے فوراً بعد کراچی میں لسانی فسادات پھوٹ پڑے اور طلبہ نے احتجاجی جلوس نکالنے شروع کئے۔ ان احتجاجی جلوسوں کو پولیس نے لاٹھی چارج کر کے منتشر کیا۔ پولیس نے اس موقع پر صحافیوں اور پریس فوٹو گرافروں پر تشدد کیا۔

اپریل کے مہینے میں سعودی عرب کے شاہ فیصل نے پاکستان کا دورہ کیا۔ شاہ فیصل کے اعزاز میں ۲۴ اپریل ۱۹۶۵ء کو لاہور کے شہریوں کی جانب سے شالیمار باغ میں روایتی استقبالیہ دیا گیا۔ لاہور کی انتظامیہ کی بدانتظامی کی بناء پر اس استقبالیہ کو کور کرنے والے صحافیوں پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ اس لاٹھی چارج سے ایوب حکومت کی زیر نگرانی کام کرنے والی انتظامیہ کی سوچ واضح ہوئی کہ وہ ہر انتظامی بدعملی کو پولیس کے ایکشن کے ذریعے روکنا چاہتی ہے۔[۲۷]

پنجاب یونین آف جرنلسٹس (PFUJ) نے فیصلہ کیا کہ لاہور میں صحافیوں پر پولیس تشدد کے خلاف علامتی ہڑتال کی جائے۔

۲۶ اپریل کو کراچی یونین آف جرنلسٹس نے فیصلہ کیا ہے کہ لاہور میں صحافیوں پر پولیس تشدد کے خلاف سرکاری تقریبات کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔

۲۸ اپریل کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر اسرار احمد نے گورنر مغربی پاکستان نواب امیر محمد خان سے اپیل کی ہے کہ وہ صحافیوں پر پولیس کے تشدد کو روکنے کے لئے مداخلت کریں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت صحافیوں کو ضابطۂ اخلاق کا پابند ہونے پر زور دیتی ہے مگر پولیس افسروں کے لئے کوئی ضابطۂ اخلاق نہیں ہے۔[۲۸]

۱۸/دسمبر ۱۹۶۵ء کو پشاور کے صحافی راجہ محمد اظفر کو ۱۳/دسمبر ۱۹۶۵ء کو پبلک منٹی ننس آرڈر ۱۹۶۰ء کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ راجہ محمد اظفر نے حکومت کے سرکلر کے مطابق خبر کا ذریعہ بتانے سے انکار کردیا۔ سرحد یونین آف جرنلسٹس نے راجہ محمد اظفر کی گرفتاری کی شدید مذمت کی۔ یونین نے ایک بیان میں کہا ہے کہ یہ اقدام ایک طرف بنیادی حقوق پر حملہ ہے دوسری طرف جدید صحافت کے تقاضوں کے خلاف ہے کیونکہ ایک اچھے صحافی کے لئے خبر کے ذریعے کا تحفظ سب سے بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔[۲۹]

۱۷/جون ۱۹۶۶ء کو ڈھاکہ کے نیوفیشن پریس کو Defence of Pakistan Rules کے تحت سیل کردیا گیا کیونکہ اس پریس میں عوامی لیگ کا ۶ نکاتی پروگرام شائع ہوا تھا۔ اس پریس میں روزنامہ 'اتفاق' چھپتا تھا۔ اسی طرح 'اتفاق' کو بند کردیا گیا اور اخبار کے ایڈیٹر تفضّل حسین کو گرفتار کرلیا گیا۔ ایسٹ پاکستان یونین آف جرنلسٹس (EPUJ) نے حکومت کی اس کارروائی کی مذمت کی۔ یونین کی ایگزیکٹو کونسل نے اپنے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی جس میں تفضّل حسین کی رہائی اور پریس کو بحال کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا تاکہ روزنامہ 'اتفاق' شائع ہوجائے۔ قرارداد میں حکومت کے اقدامات کو آزادیٔ صحافت پر حملہ قرار دیا ہے۔

۳ جولائی کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی اپیل پر سی پی این آئی اور اے پی این ایس کی ایک جوائنٹ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ کمیٹی کے قیام کے بعد ۲۰ جون ۱۹۶۶ء کی ہڑتال ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔[۳۰]

۲۰ جولائی کو لاہور، سی پی این ای، اے پی این ایس، اور پی ایف یو جے کے مشترکہ وفد نے گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان اور مرکزی وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین سے ملاقات کی۔ بعد میں یہ وفد مشرقی پاکستان کے گورنر سے ملا اور ہڑتال ملتوی کرنے کا اعلان کیا۔ پی ایف یو جے کے صدر اسرار احمد نے ہڑتال ملتوی کرنے کے فیصلے کا خیر مقدم کیا ہے اور ارکان کو ہدایت کی ہے کہ وہ ۲۰ جولائی ۱۹۶۶ء کو بازو پر سیاہ پٹیاں باندھیں تاکہ 'اتفاق' کے صحافیوں سے یکجہتی کا اظہار ہوسکے۔[۳۱]

۶ اگست ۱۹۶۶ء کو ڈھاکہ، ایسٹ پاکستان یونین آف جرنلسٹس کے وفد نے مشرقی پاکستان کے گورنر منعم خان سے ملاقات کی اور روزنامہ 'اتفاق' ڈھاکہ پر پابندی کے معاملے پر

بات چیت کی۔ مگر حکومت نے فوری طور پر اخبار کی اشاعت میں حائل رکاوٹوں کو دور نہیں کیا۔[۳۲]

معروف صحافی اور ادیب ابراہیم جلیس روزنامہ 'انجام' کے ایڈیٹر تھے۔ این پی ٹی کے چیئرمین اے کے سومار اخبار کو ایوب حکومت کا گزٹ بنانا چاہتے تھے مگر ابراہیم جلیس نے صحافتی اقدار کو ختم کرنے سے انکار کیا جس پر اے کے سومار نے ابراہیم جلیس کو دھمکیاں دیں۔

ممتاز صحافی آغا شورش کاشمیری نے اپنے ہفت وار رسالے 'چٹان' کی ۱۱ر جولائی ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں ایک اداریہ جس کا عنوان 'صدر ایوب کو کیا کرنا چاہئے' تھا تحریر کیا۔ اس اداریہ میں حکومت پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ حکومت نے ڈیفنس رولز آف پاکستان کے تحت 'چٹان' پر پابندی عائد کردی اور اس کے ایڈیٹر شورش کاشمیری کو گرفتار کیا گیا۔

آغا شورش کاشمیری تقریباً ۱۰۴ دن تک مختلف جیلوں میں نظر بند رہے۔ اخبارات کے ایڈیٹروں نے ۱۶ر دسمبر کو صدر ایوب خان سے شورش کاشمیری کی رہائی کی اپیل کی۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۶۶ء کو آغا شورش کاشمیری کو رہا کیا گیا۔[۳۳]

۲۸ مارچ ۱۹۶۷ء کو ڈھاکہ کے روزنامہ 'سنگ باد' کا ڈیکلریشن ڈی پی آر کے تحت منسوخ کردیا گیا۔ اس کے ایڈیٹر نصیر احمد کو گرفتار کرلیا گیا۔ اخبار کے پرنٹر پبلشر کی جانب سے ڈیکلریشن کی بحالی کی درخواست ڈپٹی کمشنر نے مسترد کردی۔ اخبار نے ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی۔ ڈھاکہ ہائی کورٹ نے ڈپٹی کمشنر کے فیصلے کو غیر قانونی قرار دیا اور حکومت کی اس فیصلے کے خلاف اجازت کی درخواست مسترد کردی۔ ۲۷ مئی کو ڈھاکہ میں صحافت بچاؤ کمیٹی قائم کی گئی جس کے چیئرمین عبدالسلام اور کنوینر علی اشرف تھے۔ ایسٹ پاکستان یونین آف جرنلسٹس کے صدر کے جی مصطفیٰ نے سنگ باد کی حمایت میں یوم احتجاج منانے کا اعلان کیا۔[۳۴]

۲۴ اپریل ۱۹۶۷ء کو آغا شورش کاشمیری کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کیا گیا۔ ان کے ہفت روزہ اخبار 'چٹان' پر پابندی لگادی گئی۔ آغا شورش کاشمیری کی اہلیہ نے اپنے شوہر کی گرفتاری کو مغربی پاکستان ہائی کورٹ میں چیلنج کیا۔ ضمیر نیازی نے اپنی کتاب 'صحافت پابند سلاسل' میں تحریر کیا ہے کہ ہائی کورٹ کے ججوں پر دباؤ ڈالا گیا اور شورش کاشمیری نے تین بار بھوک ہڑتال کی جو مجموعی طور پر ۵۲ دن جاری رہی۔ شورش کاشمیری کو ۲۵ دسمبر ۱۹۶۸ء کو رہا کیا گیا۔[۳۵]

۲۲ اپریل ۱۹۶۸ء کو حکومت مغربی پاکستان نے ہفت روزہ 'چٹان' لاہور پر پابندی عائد

کردی اور اس کے ایڈیٹر آغا شورش کاشمیری کو گرفتار کرلیا گیا۔ حکومت نے یہ حکم ڈیفنس آف پاکستان کے تحت جاری کیا تھا۔[۳۶]

۱۰ اگست ۱۹۶۸ء کو ایوب خان کی حکومت نے اپنے اقتدار کے ۱۰ سال مکمل ہونے پر عشرہ ترقیات کا آغاز کیا۔ اس موقع پر پورے ملک میں رنگارنگ پروگرام اور نمائش منعقد ہوئی مگر اس عشرے کے اختتام پر کراچی میں بائیں بازو کی طلبہ تنظیم نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (NSF) نے ایوب حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک شروع کردی۔ ایوب خان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۶۶ء میں پیپلز پارٹی قائم کرلی تھی۔ پیپلز پارٹی عوامی نیشنل پارٹی، عوامی لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں نے ایوب خان کے خلاف تحریک میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا۔ وکلاء، مزدور، کسانوں، ادیبوں، دانش وروں نے ملک بھر میں احتجاجی جلوس نکالنے شروع کئے۔ حکومت نے پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو، نیشنل عوامی پارٹی کے رہنماؤں ولی خان سمیت کئی سو کارکنوں کو گرفتار کیا۔ عوامی لیگ کے رہنما شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف اگرتلہ سازش کیس پہلے ہی چل رہا تھا۔ یوں سیاسی بے چینی انتہائی شدت اختیار کرگئی۔[۳۷]

۸ دسمبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی میں طلبہ کے ایک مظاہرے پر ایوب خان کی مسلم لیگ کے کارکنوں نے فائرنگ کی۔ اس فائرنگ سے روزنامہ 'تعمیر' راولپنڈی کے نمائندے نعیم شاہد شدید زخمی ہوگئے۔[۳۸]

۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء کو لائلپور کی انتظامیہ نے اردو کے روزنامہ 'ملت' کا ڈیکلریشن منسوخ کردیا۔ لائلپور کی انتظامیہ نے پریس اینڈ پبلکیشن آرڈیننس کی دفعہ ۱۰ کے تحت یہ کارروائی کی۔ پنجاب یونین آف جرنلسٹس نے روزنامہ 'ملت' کے ڈیکلریشن کی منسوخی کو غیر منصفانہ فیصلہ قرار دیا۔ یونین کی ایگزیکٹو کمیٹی نے ایک قرارداد میں کہا کہ اخبار کا ڈیکلریشن بحال کیا جائے۔[۳۹]

۱۹۶۸ء میں شروع ہونے والی عوامی تحریک ۱۹۶۹ء کے اوائل میں بھی جاری رہی مگر نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات نے عوامی احتجاج کو محسوس نہیں کیا اور ایوب خان کی مداح سرائی کرتے رہے۔ خاص طور پر مشرقی پاکستان میں عوام کے ڈھاکہ سے شائع ہونے والے این پی ٹی کے اخبارات 'مارننگ نیوز' اور 'دی نیک پاکستان' سے فاصلے بڑھ گئے۔ عوام کے احتجاجی جلوسوں میں

تخریبی عناصر بھی شامل ہوگئے۔

۲۴ جنوری ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ میں مشتعل ہجوم نے نیشنل پریس ٹرسٹ (NPT) کی عمارت کو نذر آتش کر دیا۔ اس عمارت میں 'مارننگ نیوز' اور 'دینک پاکستان' کے دفاتر تھے۔ ہجوم نے فائر بریگیڈ کو عمارت میں داخل نہیں ہونے دیا۔ اس آتشزدگی کے نتیجے میں 'مارننگ نیوز' کے دو صحافی زخمی ہوگئے۔ پی ایف یو جے نے تشدد کے اس واقعے کی مذمت کی۔ یونین کے بیان میں کہا گیا کہ ایوب حکومت نے این پی ٹی کے اخبار کو اپنا ترجمان بنایا ہوا ہے۔ اس لئے وہ عوام کے غیض وغضب کا شکار ہوئے۔[۴۰]

اس دوران کراچی، لاہور، ڈھاکہ اور دوسرے شہروں میں عوام کی احتجاجی تحریک میں مزید شدت آ گئی۔ صدر ایوب خان کی طرف سے چلائی گئی گول میز کانفرنس ناکام ہوگئی۔ ۲۵ جنوری کو کراچی میں آرام باغ سے نکلنے والے جلوس کو منتشر کرنے کے لئے پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور آنسو گیس کا استعمال کیا۔ پولیس نے اس جلوس کو کور کرنے والے صحافیوں پر بھی تشدد کیا۔ پولیس کی کارروائی میں 'مشرق' کے فوٹو گرافر اقبال زیدی، روزنامہ 'جنگ' کے ریاض 'ڈیلی نیوز' کے اکرام مہندی پی پی آئی کے اقبال جعفری اور 'مشرق' کے علی اختر رضوی زخمی ہوئے تھے۔[۴۱]

۲۵ جنوری ۱۹۶۹ء کو کراچی یونین آف جرنلسٹس کے مختلف یونٹوں نے آرام باغ میں ۵ صحافیوں پر پولیس کے تشدد کی مذمت کی۔ کے یو جے کے جنرل سیکریٹری صلاح الدین اسلم نے ایک اخباری بیان میں پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کے دوران پولیس کے تشدد کو آزادئ صحافت پر حملہ قرار دیا ہے۔ کراچی یونین آف جرنلسٹس کی اپیل پر صحافیوں نے ۲۶ جنوری ۱۹۶۱ء کو پولیس کے تشدد کے خلاف ہڑتال کی۔ کے یو جے کی ایگزیکٹو کمیٹی نے سرکاری تقریبات کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور ریڈیو، ٹیلی وژن کے پروگراموں میں حصہ لینے والے صحافیوں سے کہا گیا کہ وہ بھی پروگرام کا بائیکاٹ کریں۔

۲۷ جنوری ۱۹۶۹ء کو لاہور میں طلباء کے جلوس کو منتشر کرنے کے لئے پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ فوٹو گرافروں نے اس تشدد کی تصاویر کھینچی تو فوٹو گرافروں پر تشدد کیا گیا اور ان کے کیمرے توڑ دیئے گئے۔ پولیس کے لاٹھی چارج سے 'جنگ' کے محمد طفیل، 'مشرق' کے محمد عثمان کو گہرے زخم آئے۔ پنجاب یونین آف جرنلسٹس نے پولیس کی جانب سے فوٹو گرافروں پر لاٹھی

چارج کی مذمت کی۔ پی یو جے نے ایک بیان میں صحافیوں کی پیشہ ورانہ ادائیگی میں رکاوٹ ڈالنے اور تشدد کے ذمہ دار افسروں کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا۔[۴۲]

۲۷ جنوری کو کراچی کے مختلف علاقوں میں تشدد کے واقعات شروع ہو گئے اور کراچی کی انتظامیہ نے شہر کے مختلف علاقوں میں کرفیو نافذ کر دیا۔

۲۸ جنوری ۱۹۶۹ء کو کراچی پولیس نے کراچی انتظامیہ کی جانب سے جاری کردہ کرفیو پاس کو قبول کرنے سے انکار کیا جس کی بناء پر اخبارات میں ایک بحران پیدا ہو گیا۔

لاہور پنجاب یونین آف جرنلسٹس کی ایگزیکٹو کمیٹی نے اپنے ارکان کو ہدایت کی کہ وہ سرکاری تقریبات کا بائیکاٹ کریں۔ یہ فیصلہ گورنر ہاؤس کے سامنے صحافیوں کے ایک گھنٹہ کے دھرنے کے بعد کیا گیا۔ پنجاب یونین آف جرنلسٹس کے ارکان گورنر ہاؤس پہنچ کو ایک میمورنڈم دینا چاہتے تھے مگر گورنر کے ملٹری سیکریٹری اور کوئی افسر یہ میمورنڈم وصول کرنے نہیں آیا۔ ۲۹ جنوری ۱۹۶۹ء کو مغربی پاکستان کے صحافیوں نے ایک دن کی ہڑتال کی۔ اس ہڑتال میں کاتبوں اور ہاکرز نے بھی حصہ لیا۔ یہ ہڑتال صحافیوں پر پولیس تشدد کے خلاف کی گئی تھی۔[۴۳]

۲۹ فروری کو لاہور کے کچھ علاقوں بھی کرفیو لگا دیا گیا۔

۵ فروری ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ، ایسٹ پاکستان یونین آف جرنلسٹس کی اپیل پر صحافیوں نے ۵ فروری ۱۹۶۹ء کو ایک دن کی ہڑتال کی۔ یہ ہڑتال آزادئ صحافت کے خلاف حکومت کے اقدامات کے خلاف کی گئی۔[۴۴]

فروری ۱۹۶۲ء میں ایوب خان کے خلاف عوامی تحریک کے دوران دائیں اور بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں میں اختلافات شدت اختیار کر گئے۔ ۶ فروری کو سکھر میں ایک سیاسی جماعت کے کارکنوں نے سکھر کے مقامی اخبار کی کاپیوں کو نذر آتش کر دیا۔

روزنامہ 'اتفاق' ڈھاکہ کے پرنٹنگ پریس کو ۱۷ جون ۱۹۶۶ء کو سیل کیا گیا تھا جس کی بناء پر روزنامہ 'اتفاق' کی اشاعت معطل ہو گئی۔ اخبار کے ایڈیٹر تفضل حسین کو ڈی پی آر کے تحت گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اخبار کی تنظیموں کے احتجاج کے بعد حکومت نے روزنامہ 'اتفاق' کے پرنٹنگ پریس کے خلاف اقدامات واپس لئے تھے۔ پی ایف یو جے کی جدوجہد کے نتیجے میں ۱۱ فروری ۱۹۶۸ء کو روزنامہ 'اتفاق' دو صفحے پر شائع ہونا شروع ہوا۔[۴۵]

نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبار روزنامہ 'مشرق' نے جو کراچی، لاہور اور پشاور سے شائع ہوتا تھا جدت کا مظاہرہ کیا اور ایوب خان کے خلاف مظاہروں کی خبریں اور مخالف سیاسی رہنماؤں کے بیانات شائع کرنے شروع کئے۔ کراچی میں آرام باغ مسجد سے نکلنے والے جلوس کے شرکاء کو منتشر کرنے کے لئے پولیس مسجد میں داخل ہوگئی اور نمازیوں پر تشدد کیا۔ 'مشرق' کراچی اور لاہور نے اس واقعے کی خبریں اور تصاویر تفصیل سے شائع کیں جس پر حکومت نے سرکاری اخبار کے کراچی ایڈیشن کے اشتہارات بند کر دیئے اور 'مشرق' کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔[۴۶]

۱۳ر فروری ۱۹۶۹ء کو مغربی پاکستان کے وزیر اطلاعات احمد سعید کرمانی نے مغربی پاکستان اسمبلی میں بیان دیتے ہوئے تصدیق کی کہ 'مشرق' کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ پابندی 'مشرق' کے نامناسب رویے کی بناء پر لگائی گئی ہے۔ 'مشرق' نے آرام باغ مسجد کراچی میں پولیس والوں کے داخلے کی تصاویر شائع کی ہیں۔[۴۷]

۲۶ فروری کو ہنگاموں کے بعد ڈھاکہ میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ پولیس نے کرفیو زدہ علاقوں میں جانے والے صحافیوں پر تشدد کیا۔

ایوب خان کی حکومت نے عوامی تحریک کی خبروں کی بیرون ممالک اشاعت کو روکنے کے لئے نئی پابندیاں عائد کیں۔

۸ مارچ ۱۹۶۹ء کو راولپنڈی میں اسٹیٹ بینک نے غیر ملکی اخبارات اور نیوز ایجنسیوں کے لئے کام کرنے والے پاکستانی صحافیوں کو ہدایت کی کہ وہ فارن ایکسچینج بونس حاصل کرنے کے لئے غیر ملکی اداروں کو بھیجی گئی خبریں اور تصاویر وزارت تعلیم کو پیش کریں۔ اسٹیٹ بینک کے سرکلر میں کہا گیا ہے کہ وزارت تعلیم متعلقہ صحافی کو یہ سرٹیفکیٹ جاری کرے گی کہ اس کی بھیجی ہوئی خبریں حکومت مخالف نہیں تھی تو پھر پریس انفارمیشن ڈپارٹمنٹ (PID) انہیں فارن ایکسچینج بونس حاصل کرنے کے لئے وزارت تعلیم کی سفارش پر اپنا سرٹیفکیٹ جاری کرے گا۔ پی ای ڈی کی ایکریڈیٹ فہرست میں شامل صحافیوں کا کہنا تھا کہ وزارت تعلیم کا خبروں کی جانچ پڑتال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پی ایف یو جے نے وزارت اطلاعات سے اپیل کی ہے کہ اس معاملے میں مداخلت کریں۔[۴۸]

ایوب خان کے خلاف تحریک کے آخری مہینوں میں دائیں اور بائیں بازو کی سیاسی

جماعتوں کے درمیان اختلافات نے نئی شکل اختیار کر لی۔ پیپلز پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی اور دائیں بازو کی جماعت اسلامی کے کارکنوں کے درمیان مختلف شہروں میں تصادم کے واقعات ہوئے۔ ان سیاسی جماعتوں نے صحافیوں اور اخبارات پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ان کے مفادات کے تابع رپورٹنگ کریں۔ کراچی میں ایک سیاسی جماعت نے خبر رساں ایجنسی پی پی آئی کے دفتر پر حملہ کیا۔ 'جنگ' راولپنڈی کے رپورٹر ضیغم زیدی ایک سیاسی جماعت کے حملے کا شکار ہوئے۔ یہ صورتحال مغربی پاکستان کے علاوہ مشرقی پاکستان میں بھی پیدا ہوئی۔

۲۰/اکتوبر ۱۹۶۹ء کو راولپنڈی میں پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے مندوبین کی دوسالہ کانفرنس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ اخبارات پر پابندی لگانے والے تمام قوانین منسوخ کئے جائیں۔ دوسالہ کانفرنس کے اجلاس میں منظور کی جانے والی قرارداد میں کہا گیا تھا کہ فوری ضرورت آزادئ صحافت کی مکمل بحالی ہے۔ اخبارات اور ابلاغ عامہ کے تمام اداروں کو آزاد ہونا چاہئے۔ اجلاس میں منظور کی جانے والی ایک اور قرارداد میں کہا گیا تھا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کی موجودہ شکل کو توڑا جائے۔ 'پاکستان ٹائمز' اور 'امروز' اس کے اصل مالکان کے حوالے کئے جائیں۔ 'مارننگ نیوز'، 'دینک پاکستان'، 'مشرق' اخبار اور 'خواتین' کے معاملات کا حل علیحدہ علیحدہ نکالا جائے۔ ایک اور قرارداد میں صحافیوں کے ساتھ پاسپورٹ کے اجراء کے لئے امتیازی سلوک ختم کیا جائے۔[۴۹]

۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو صدر ایوب خان نے اپنے ہی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اقتدار اپنے کمانڈر انچیف جنرل آغا محمد یحییٰ خان کو سونپ دیا۔ یحییٰ خان نے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا اور ۱۹۶۲ء کے آئین کو منسوخ کر دیا۔ مارشل لاء حکومت نے ہڑتالوں اور مظاہروں کو خلاف قانون قرار دے دیا اور اخبارات کو نئی حکومت کے خلاف ہر قسم کی تنقید سے باز رہنے کا حکم دیا۔ نئی حکومت نے پریس پر سے پابندیاں کچھ مہینے کے اندر اندر اٹھالیں۔ حکومت نے اخبارات کے ڈیکلریشن جاری کرنے کے لئے پالیسی نرم کر دی۔ ۵ مئی ۱۹۶۵ء کو صوبائی حکومتوں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو مرکزی وزارت اطلاعات کی ہدایات کے بغیر ڈیکلریشن کے سلسلے میں تمام درخواستوں پر فیصلے کا اختیار دیا۔[۵۰]

جنرل یحییٰ خان نے مارشل لاء میں صحافیوں کے خلاف اقدامات کا سلسلہ جاری رکھا۔

۹ ستمبر ۱۹۷۰ء کو سرگودھا پولیس نے ۳ صحافیوں عاشق حسین جعفری، عبدالرشید اور فیض محمود فیض کو ایم پی او کی مختلف دفعات کے تحت گرفتار کرلیا۔

ممتاز صحافی اور 'پاکستان آبزور' کے نمائندے نجی اللہ مشرقی پاکستان کے حقوق کے لئے اپنی تحریروں کی بناء پر ہمیشہ مشہور رہے۔ انہوں نے ہفت روزہ 'انٹرونگ' میں مشرقی پاکستان کے حالات اور فوجی حکومت کی پالیسی کے حوالے سے آرٹیکل تحریر کیا تھا۔

۳۰ دسمبر ۱۹۷۰ء کو راولپنڈی میں 'پاکستان آبزرور' کے نامہ نگار نجی اللہ اور ہفت روزہ 'انٹرونگ' لاہور کے ایڈیٹر اے آر شمس نغمی کو مارشل لاء ریگولیشن 16,A کے تحت گرفتار کرلیا۔ پی ایف یو جے نے نجی اللہ اور اے آر شمس کی گرفتاری کی مذمت کی۔ [۵۱]

۲۰ فروری ۱۹۷۰ء کو راولپنڈی کی خصوصی فوجی عدالت نے روزنامہ 'پاکستان آبزرور' کے راولپنڈی کے نمائندے سید نجی اللہ اور شمس الغنی کو ۵ سال قید اور ۵ ہزار روپے جرمانے اور شمس الغنی کو ۳ سال قید اور ۲۵ ہزار روپے جرمانے کی سزا دی۔ [۵۲]

۲۳ فروری ۱۹۷۰ء کو پاکستان یونین آف جرنلسٹس کے صدر کے جی مصطفیٰ کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان سے اپیل کی ہے کہ نجی اللہ اور شمس الغنی کو فوری طور پر رہا کردیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ نجی اللہ اور شمس الغنی کی گرفتاری آزادئ صحافت پر حملے کے مترادف ہے۔ ۱۳ مارچ ۱۹۷۰ء کو نجی اللہ اور شمس الغنی کو رہا کردیا گیا۔ [۵۳]

دسمبر ۱۹۷۰ء میں ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ ان انتخابات میں مشرقی پاکستان سے عوامی لیگ اکثریتی ووٹوں سے کامیاب ہوئی۔ سندھ، پنجاب، سرحد سے پیپلز پارٹی نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں۔ فوجی سربراہ جنرل یحییٰ خان مغربی پاکستان کی اکثریتی جماعت پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان کی اکثریتی جماعت عوامی لیگ میں نئے آئین کے خدوخال پر سمجھوتہ نہیں ہوا۔ جنرل یحییٰ خان نے اکثریتی جماعت عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کرنے سے انکار کردیا۔ یکم مارچ کو جنرل یحییٰ خان نے ۳ مارچ کو ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کرنے کا اعلان کیا کیونکہ پیپلز پارٹی اور بعض دوسری جماعتوں نے اجلاس میں شرکت سے انکار کردیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان کو مشرقی پاکستان کا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ مشرقی پاکستان زون بی کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اپنے پہلے حکم میں اخبارات کے لئے

پاکستان کی خودمختاری اور سالمیت کے خلاف کسی خبر، تبصرے یا تصویر کی اشاعت کو ممنوع قرار دے دیا۔[۵۴]

عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن نے سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو جنرل یحییٰ خان نے سیاسی سرگرمیوں پر مکمل پابندی اور مکمل پریس سنسر شپ نافذ کردی۔ جنرل یحییٰ خان نے مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۷ بھی جاری کیا جس میں کہ پہلے سے سنسر کرائے بغیر کوئی خبر، پمفلیٹ یا پوسٹر شائع کرنے پر پابندی لگادی۔[۵۵]

۴ مارچ ۱۹۷۱ء کو ایسٹ پاکستان یونین آف جرنلسٹس نے حکومت سے پریس پر عائد تمام پابندیوں کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ یونین کی ایگزیکٹو کونسل نے فیصلہ کیا کہ اخبار نویس تمام انتظامی احکام اور پریس کی ایڈوانس کی خلاف ورزی کریں گے جن سے معروضی رپورٹنگ کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔ ۶ مارچ کو پی ایف یو جے کے مغربی پاکستان کے عہدیداروں نے مشرقی پاکستان کی صحافی برادری کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اظہار کیا۔ انہوں نے اخبارات پر عائد پابندیوں کے خاتمے کا بھی مطالبہ کیا۔ ۲۶ مارچ کو مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن شروع ہوتے ہی عوامی لیگ کے ترجمان اخبار 'دی پیوپل' کی عمارت کو دھماکے سے اڑادیا گیا۔[۵۶]

۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں عوامی لیگ کے حامی اخبار روزنامہ 'اتفاق' کو ۲ ماہ کے لئے بند کردیا گیا اور ۲۸ مارچ کو روزنامہ 'پیوپل' People کے دفتر پر پاکستان کی فوج نے حملہ کیا اور عمارت کو تباہ کردیا۔

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے سیکریٹری جنرل منہاج برنا نے فوج کے روزنامہ 'پیپلز' کی عمارت کو تباہ کرنے اور روزنامہ 'اتفاق' پر پابندی لگانے اور روزنامہ 'پیوپل' کے دفتر پر فوج کے حملے کی مذمت کی۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ ان اقدامات سے آزادئ صحافت پر نئی پابندیاں عائد ہونگی اور ملک کو شدید نقصان پہنچے گا۔[۵۷]

۳۰ مارچ ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان کے مارشل لاء حکام نے ڈھاکہ میں مقیم تمام بیرونی صحافیوں کو ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ یہ اخباری نمائندے مغربی بنگال کے دارالحکومت کلکتہ میں جمع ہوگئے۔ پی ایف یو جے نے اس اقدام کو آزادئ صحافت پر حملے کے مترادف قرار دیا۔[۵۸]

مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن شروع ہوتے ہی کرنافلی پیپرز ملز سے کاغذ کی فراہمی

معطل ہوگئی جس کی بناء پر مغربی پاکستان میں اخباری کاغذ کی قلت پیدا ہوگئی۔

۱۱ رمئی ۱۹۷۱ء کو لاہور میں پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے سیکریٹری جنرل منہاج برنا نے ایک بیان میں خدشہ ظاہر کیا کہ نیوز پرنٹ کم ہونے کی بناء پر مالکان اخبارات صحافیوں کو ملازمتوں سے برطرف کریں گے۔[۵۹]

یحییٰ خان کی حکومت نے مغربی پاکستان کے اخبارات پر بھی سخت پابندیاں عائد کردیں۔

۱۴ رمئی ۱۹۷۱ء کو لاہور کے اخبارات کے خلاف مارشل لاء ریگولیشن ۷۷ کی خلاف ورزی پر مقدمات قائم کئے گئے ان اخبارات میں 'نوائے وقت' 'کوہستان' اور 'مساوات' شامل تھے۔[۶۰]

۲۲ مئی ۱۹۷۱ء کو روزنامہ 'آزاد' کے ادارتی بورڈ کے رکن عبداللہ ملک کو سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے ایک سال قید اور ۵۰ ہزار روپے کے جرمانے کی سزا دی۔ عبداللہ ملک پر قابل اعتراض تقریر کرنے کا الزام لگایا گیا۔

یکم جولائی ۱۹۷۱ء کو سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے ہفت روزہ 'آفاق' کے مدیر شوکت حسین شوکت کو ۶ ماہ قید بامشقت اور ۵ ہزار روپے جرمانے کی سزا دی۔ عدالت نے 'آفاق' کا ڈیکلریشن ۳ ماہ کے لئے معطل کردیا۔ شوکت حسین شوکت کے خلاف مارشل لاء ریگولیشن ۷۷ کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔[۶۱]

یکم اکتوبر ۱۹۷۱ء کو مارشل لاء ریگولیشن ۸۹ کو خلاف ورزی کے الزام میں روزنامہ 'مساوات' لاہور کو ایک ہفتے کے لئے بند کیا گیا۔ 6 اکتوبر کو یہ پابندی ختم کردی گئی۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ایسٹرن سیکٹر کے ایریا کمانڈروں کے درمیان ہونے والی جنگ بندی کا معاہدہ ہوا۔ پاکستانی فوج کے ایسٹرن کمانڈر کے سربراہ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے بھارتی فوج کے لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ یوں مشرقی پاکستان ختم ہوگیا اور بنگلہ دیش قائم ہوگیا۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کے صدر اور سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے فرائض سنبھال لئے۔[۶۲]

فوج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی رات کو وزیراعظم ذوالفقار علی

بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ [۶۳]

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا نے چیف لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق سے اپیل کی کہ پریس اینڈ پبلکیشن آرڈیننس منسوخ کیا جائے، نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑا جائے اور ایک آزاد و جمہوری نفاذ کے قیام کے لئے دوسرے ضروری اقدامات کئے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ حالات میں اپنک اور پی ایف یو جے کے پاس عبوری حکومت کے سامنے آزادئ صحافت کے تحفظ اور حالات کار کو بہتر بنانے کے مطالبات کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ عبوری حکومت کو آزادئ صحافت کو یقینی بنانے کے لئے اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کرنی چاہئیں۔ انہوں نے کہا کہ سرکاری اشتہارات کا کوٹہ اور اخباری کاغذ کی قسم کو سیاسی بنیادوں پر تسلیم کرے۔ ان کی میرٹ کے مطابق تقسیم کو یقینی بنانا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ سابقہ حکومت کے اشتہارات اور اخباری کاغذ کی تقسیم سیاسی بنیادوں پر کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ ان معاملات کی تحقیقات ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ریڈیو، ٹیلی وژن اور خبر رساں ایجنسیوں کو آزاد کیا جائے۔ تمام صحافیوں اور ٹریڈ یونین کارکنوں کو رہا کیا جائے۔ [۶۴]

۲۰ جولائی ۱۹۷۷ء کو روزنامہ 'مساوات' لاہور کے ایڈیٹر ایس جی ایم بدر الدین کو گرفتار کر لیا گیا۔ سرکاری ہینڈ آؤٹ کے مطابق روزنامہ 'مساوات' اور روزنامہ 'نوائے وقت' کے ایڈیٹر کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ہدایات اور فریم ورک کی خلاف ورزی پر مارشل لاء ہیڈ کوارٹرز میں طلب کیا گیا تھا۔ 'نوائے وقت' کے ایڈیٹر حاضر ہو گئے مگر 'مساوات' کے ایڈیٹر نے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ [۶۵]

۲۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو پولیس نے روزنامہ 'جسارت' کے سابق ایڈیٹر صلاح الدین اور اردو ڈائجسٹ کے ایڈیٹر الطاف حسن قریشی کو گرفتار کر لیا۔ یہ گرفتاریاں کراچی یونیورسٹی میں ایک جلسے میں خطاب کے بعد ہوئیں۔ دونوں صحافیوں کو ایک گھنٹے بعد رہا کر دیا گیا۔ [۶۶]

کراچی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ 'معیار' میں اسٹیٹ بینک کے نام وزارت داخلہ کا جاری کیا ہوا ایک خفیہ ہدایت نامہ شائع ہوا جس میں بعض افراد کے ملک سے باہر جانے پر پابندی لگائی گئی تھی۔

۱۶/اگست ۱۹۷۷ء کو ہفت روزہ 'معیار' کے ایڈیٹر محمود شام کو گرفتار کر لیا گیا۔ محمود شام کو وزارت داخلہ کی خفیہ ہدایات کی اشاعت پر گرفتار کیا گیا۔ ان کی گرفتاری آفیشل سیکریٹ ایکٹ ۱۹۲۳ء کے تحت ہوئی۔ [۶۷]

۳ ستمبر ۱۹۷۷ء کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا کو نیشنل پریس ٹرسٹ ختم کرنے کے بارے میں آرٹیکل لکھنے پر 'پاکستان ٹائمز' سے برطرف کر دیا گیا۔ منہاج برنا نے یہ آرٹیکل کراچی سے شائع ہونے والے اردو کے ہفت روزہ 'الفتح' میں تحریر کیا تھا۔ [۶۸]

پیپلز پارٹی کی حکومت نے ۱۹۷۵ء میں اخباری صنعت کے معاملات کے بارے میں سفارشات تیار کرنے کے لئے ایک پریس کمیشن قائم کیا تھا مگر اس کمیشن نے کوئی خاطر خواہ کام نہیں کیا۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے پریس کمیشن کو ختم کر دیا۔

شیخ زید بن سلطان النہیان ٹرسٹ نے حکومت کی ہدایت پر ۲۲/اکتوبر ۱۹۷۷ء کو روزنامہ 'مساوات' کراچی کو شائع کرنے سے انکار کر دیا جس کی بناء پر روزنامہ 'مساوات' کراچی کی اشاعت معطل ہو گئی۔ [۶۹]

۲ نومبر ۱۹۷۷ء کو راولپنڈی میں روزنامہ 'حیات' راولپنڈی کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر طفر لودھی کو لاہور میں روزنامہ 'مساوات' لاہور کے ایڈیٹر ایس جی ایم بدرالدین کو مارشل لاء ضابطہ نمبر ۱۳ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ [۷۰]

۸ نومبر ۱۹۷۷ء کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور آل پاکستان نیوز پیپرز ایمپلائز کنفیڈریشن (APNEC) کی مشترکہ اپیل پر ۸ نومبر ۱۹۷۷ء کو یوم مطالبات منایا گیا۔ ۱۸/نومبر ۱۹۷۷ء کو کراچی میں پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی فیڈرل ایگزیکٹو کونسل کے ۳ روزہ اجلاس میں مطالبہ کیا گیا کہ روزنامہ 'مساوات' کی اشاعت کی راہ میں رکاوٹوں کو ختم کیا جائے۔ فیڈرل ایگزیکٹو کونسل کے اجلاس میں منظور کی جانے والی قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ہفت روزہ 'نصرت' اور 'ہلال پاکستان' کی اشاعت بھی معطل ہے۔ حکومت کو اس بارے میں فوری اقدامات کرنے چاہئیں۔

اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ اخبار کی اشاعت کی بحالی کے لئے بھوک ہڑتال کی جائے گی۔ 'مساوات' کے صحافیوں نے اجلاس میں کہا کہ حکومت کا یہ موقف درست نہیں کہ روزنامہ

'مساوات' کی اشاعت مالیاتی بحران کی بناء پر معطل ہوئی تھی۔'مساوات' کی انتظامیہ نے صحافیوں اور کارکنوں کی تنخواہیں ادا کردی ہیں۔اس معاملے میں حکومت کا کوئی کردار نہیں ہے۔[۱]

۴دسمبر ۱۹۷۷ء کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور آل پاکستان نیوز پیپرز ایمپلائز کنفڈریشن نے روزنامہ 'مساوات' کراچی کی بحالی کے لئے کراچی پریس کلب سے احتجاجی تحریک شروع کی۔ پہلے دن پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر اور آل پاکستان نیوز پیپرز ایمپلائز کنفیڈریشن کے چیئرمین منہاج برنا کی قیادت میں ۱۱ صحافیوں اور کارکنوں نے کراچی پریس کلب میں بھوک ہڑتال شروع کردی۔ ۴۸ گھنٹے کی اس بھوک ہڑتال میں دو خواتین صحافی بھی شامل تھیں۔ یہ صحافی 'مساوات' کی اشاعت میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کا مطالبہ کررہے تھے۔کراچی پولیس نے روزنامہ 'مساوات' کی بحالی کے لئے بھوک ہڑتال کرنے والے ۲۱ صحافیوں کو کراچی پریس کلب سے گرفتار کرلیا۔مگر پھر حکومت نے روزنامہ 'مساوات' کو پرنٹنگ پریس تبدیل کرنے کی اجازت دے دی۔[۲]

۱۰ جنوری ۱۹۷۸ء کو لاہور کی انتظامیہ نے روزنامہ 'حیات' کے پبلشر کو نوٹس جاری کیا ہے کہ وہ پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس کے تحت ۲ ہزار روپے کی ضمانت جمع کرائیں۔حکومت نے یہ کارروائی پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کی اہلیہ بیگم نصرت بھٹو کے بیان کی اشاعت کے خلاف کی۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے روزنامہ سے ضمانت طلب کرنے کی مذمت کی۔ یونین کے سیکریٹری جنرل نثار عثمانی نے کہا کہ یہ اقدام امتناعی قانون کے تحت کیا گیا ہے جو آزادیٔ صحافت کے منافی ہے۔[۳]

۲۱ جنوری ۱۹۷۸ء کو روزنامہ 'سن' لاہور میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے بارے میں توہین آمیز کلمات شائع ہونے پر روزنامہ 'سن' لاہور کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر اصغر رضوی اور ایک سب ایڈیٹر اور ٹائپ گرافٹ کو ایک ایک سال قید بامشقت اور ۱۰،۱۰ کوڑوں کی سزا سنائی گئی مگر اگلے دن چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے یہ سزا معاف کردی۔[۴]

۲۲ جنوری ۱۹۷۸ء کو کراچی میں پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا اور جنرل سیکریٹری نثار عثمانی نے وفاقی حکام سے مطالبہ کیا کہ روزنامہ 'سن' کے معاملے کی اعلیٰ سطحی تحقیقات کرائیں اور روزنامہ 'سن' لاہور اور کراچی بند کرنے پر اس کی انتظامیہ کے خلاف

کارروائی کی جائے۔[۵]

۹ فروری ۱۹۷۸ء کو کراچی میں پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا نے ہفت روزہ 'الفتح' اور ہفت روزہ 'معیار' کو اظہار وجوع کے نوٹس کے اجراء اور ۳۰ ہزار روپے ضمانت طلب کرنے کی مذمت کی۔ منہاج برنا نے ایک بیان میں کہا کہ ایک طرف وزارت اطلاعات اخباری تنظیموں سے پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس کی تبدیلی کے بارے میں بات چیت کر رہی ہے۔ دوسری طرف اس قانون کے تحت ضمانت طلب کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ اقدامات آزادیٔ صحافت کے منافی ہیں۔[۶]

۱۳/ مارچ ۱۹۷۸ء کو لاہور میں حکومت پنجاب نے روزنامہ 'حیات' کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا۔ حکام نے روزنامہ 'مساوات' لاہور سے بیگم نصرت بھٹو کے بیان کی اشاعت پر ایک لاکھ روپے کی ضمانت طلب کی۔ لاہور کے مارشل لاء حکام نے 'مساوات' کے ایڈیٹر ایس جی ایم بدرالدین اور افسر بکار خاص (OSD) ظہیر کاشمیری کو مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۳۳ کے تحت گرفتار کر لیا ہے۔ ۱۴/ مارچ ۱۹۷۸ء کو حکومت پنجاب نے روزنامہ 'مساوات'، روزنامہ 'تعمیر' اور ہفت روزہ 'زندگی' کے خلاف پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس ۱۹۶۳ء کے تحت کارروائی کی اور ان اخبارات سے ۱۵، ۱۵ ہزار روپے کی ضمانت طلب کی ہے اور اظہار وجوع کے نوٹس جاری کئے۔

۱۵/ مارچ ۱۹۷۸ء کو لاہور کی سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے 'مساوات' کے ایڈیٹر ایس جی ایم بدرالدین افسر بکار خاص اور معروف شاعر ظہیر کاشمیری اور پرنٹر میر جمیل الرحمٰن کو ایک ایک سال قید بامشقت کی سزا دی۔[۷]

۲۲ مارچ ۱۹۷۸ء کو حکومت پنجاب نے روزنامہ 'مساوات' لاہور اور فیصل آباد کی اشاعت معطل کر دی اور اس کے پرنٹنگ پریس کو سیل کر دیا۔ یہ اقدام پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس کے تحت کیا گیا تھا۔[۸]

۲۲ مارچ ۱۹۷۸ء کو کراچی میں حکومت سندھ نے روزنامہ 'امن' کراچی کو اظہار وجوہ کا نوٹس دیا۔ یہ اقدام پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس ۱۹۶۳ء کے تحت کیا گیا۔ حکومت نے روزنامہ 'امن' سے ایک لاکھ ۸۰ ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی۔

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد مخالف

اخبارات کے خلاف سخت اقدامات کئے۔ پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبار 'مساوات' کی اشاعت کو مختلف طریقوں سے معطل رکھا گیا۔ پیپلز پارٹی کے ایک اور حامی اخبار روزنامہ 'حیات' لاہور اور راولپنڈی پر پابندی لگادی گئی اور اخبارات سے ضمانتیں طلب کی گئیں۔

پی ایف یو جے نے آزادئ صحافت پر پابندیوں کے خلاف مہم شروع کی۔[۷۹]

۲۷ مارچ ۱۹۷۸ء کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے پریس کونسل کے قیام کا اعلان کیا۔ انہوں نے کہا کہ صحافی پریس کونسل میں اپنا ضابطہ اخلاق نافذ کریں گے اور اپنا احتساب کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ بلوچستان اور سرحد میں پہلی ہی پریس کونسلیں قائم ہو چکی ہیں۔

کراچی، پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا نے پریس کونسل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ پریس کونسل اس وقت کامیاب ہو سکتی ہے اور ضابطہ اخلاق پر عمل ہو سکتا ہے جب حکومت غیر معمولی قوانین کے تحت اخبارات کے خلاف کارروائی بند کرے اور تمام امتناعی قوانین مثلاً پریس اینڈ پبلکیشنز آرڈیننس اور مارشل لاء قوانین ختم کئے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ اس صورتحال میں پی ایف یو جے اور اپنک کو پریس کونسل قبول نہیں۔ صحافیوں کے خلاف منفی ریمارکس افسوس ناک ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پی ایف یو جے صرف اخبارات کی آزادی نہیں چاہتی بلکہ ذمہ دارانہ صحافت کی حامی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پریس کونسل جمہوری ماحول میں پروان چڑھتی ہے۔[۸۰]

۸/اپریل ۱۹۷۸ء کو کراچی میں روزنامہ 'صداقت' کے ایڈیٹر بشیر رانا کو مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۳۳ کے تحت گرفتار کرلیا۔ پولیس نے روزنامہ 'صداقت' کے پرنٹر افتخار حسین کو بھی گرفتار کیا۔

۸/اپریل ۱۹۷۸ء کو کراچی میں آل پاکستان نیوز پیپرز ایمپلائیز کنفیڈریشن اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے مشترکہ اجلاس میں روزنامہ 'مساوات' کی بندش اور ایڈیٹروں کی گرفتاریوں پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ پی ایف یو جے کے صدر اور اپنک کے چیئرمین منہاج برنا کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں منظور کی جانے والی قرارداد میں حکومت کے متعدد اخبارات کے خلاف امتناعی قوانین کی مذمت کی گئی۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ روزنامہ

'مساوات' کی بندش سے ۲۵۰ خاندان متاثر ہورہے ہیں اور اب روزنامہ 'صداقت' کراچی، روزنامہ 'اعلان' کراچی، روزنامہ 'امن' کراچی ہفت روزہ 'الفتح' کراچی، ہفت روزہ 'معیار' ہفت روزہ 'زندگی' لاہور ہفت روزہ 'لیل ونہار' لاہور اور ماہنامہ 'ہیرالڈ' کراچی کو نوٹس جاری کئے گئے ہیں جو کہ آزادیٔ صحافت پر حملے کے مترادف ہیں۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ حکومت کے اقدامات کا مقصد مخالف آوازوں کو خاموش کرنا ہے۔ قرارداد میں مزید کہا گیا تھا کہ یہ صورتحال جمہوریت کے لئے نقصان دہ ہے۔ اجلاس میں منظور کی جانے والی ایک قرارداد میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ پریس کونسل کے قیام سے پہلے امتناعی قوانین منسوخ کئے جائیں جب تک امتناعی قوانین نافذ ہیں پریس کونسل کے قیام کا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا اور ان قوانین کی منسوخی کے بعد ہی صحافی اپنے تیار کردہ ضابطۂ اخلاق پر عمل کرسکیں گے۔[۸۱]

اپریل ۱۹۷۸ء میں سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو لاہور ہائی کورٹ نے قصوری قتل کیس میں موت کی سزا دے دی۔ پھر ذوالفقار علی بھٹو نے اس سزا کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کردی۔ بھٹو صاحب اور ان کے وکلاء نے طویل بیانات سپریم کورٹ میں داخل کئے جن میں بھٹو پر لگائے گئے الزامات کو رد کیا گیا۔ ضیاء الحق حکومت سابق وزیراعظم بھٹو اور ان کے ساتھیوں کے سپریم کورٹ میں داخل کئے گئے بیانات کی اشاعت کے حق میں نہیں تھی۔ اس لئے پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبار 'مساوات' اور پارٹی کے حامی اخبارات کو بند کرنے اور ان کے ایڈیٹروں کی گرفتاری کی ایک مہم شروع ہوئی۔ ۲۶ مارچ ۱۹۷۸ء کو 'مساوات' کراچی پر پابندی لگائی گئی تاکہ اخبار میں بھٹو کی سپریم کورٹ میں اپیل کا ضمیمہ شائع نہ ہوسکے۔[۸۲]

۱۱/اپریل ۱۹۷۸ء کو لاہور میں روزنامہ 'مساوات' کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر عباس اطہر اور روزنامہ 'پیغام' سرگودھا کے ایڈیٹر شیخ منظور حسین کو سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی لاہور ہائی کورٹ میں سزائے موت کے خلاف سپریم کورٹ میں دائر کی گئی اپیل شائع کرنے پر گرفتار کرلیا گیا۔[۸۳]

۱۴/اپریل ۱۹۷۸ء کو راولپنڈی پولیس نے روزنامہ 'تعمیر' کے ایڈیٹر شبیر الاسلام کو مفرور ملزم قرار دیدیا۔ پولیس نے شبیر الاسلام کی رہائش گاہ پر نوٹس چسپاں کیا ہے جس میں کہا گیا کہ شبیر الاسلام نے خود کو پولیس کے حوالے نہیں کیا تو ان کی جائیداد ضبط کرلی جائے گی۔[۸۴]

۲۱/اپریل ۱۹۷۸ء کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا نے حکومت کی جانب سے روزنامہ 'مساوات' کراچی کو بند کرنے کے اقدام کی مذمت کی۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ روزنامہ 'مساوات' لاہور پہلے ہی بند ہو چکا ہے اور اس کے ایڈیٹر گرفتار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ روزنامہ 'مساوات' کے پبلشر جمیل الرحمٰن کو کوٹ لکھپت جیل سے اسی وقت رہا کیا گیا جب انہوں نے 'مساوات' کراچی اور لاہور کے پبلشر کی حیثیت سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا اور اب یہ امکان ہے کہ حکام پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس ۱۹۶۳ء کا سہارا لے کر تکنیکی بنیاد پر مساوات کو بند کر دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ 'مساوات' کراچی کو نئے پرنٹنگ پریس کی اجازت نہ دینے اور پرانے پرنٹر پبلشر فاؤنڈیشن پریس میں شائع کرانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ پیپلز فاؤنڈیشن نے شرط عائد کی ہے کہ روزنامہ 'مساوات' سنسر کرنے کے بعد شائع ہو سکے گا ورنہ دوسری صورت میں اخبار بند ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہی طریقہ کار روزنامہ 'ہلال پاکستان' اور ہفت روزہ 'نصرت' کے لئے اپنایا گیا ہے۔ [۸۵]

پی ایف یو جے اور ایپنک کی قیادت نے روزنامہ 'مساوات' اور دوسرے اخبارات پر پابندی اور گرفتار صحافیوں کی رہائی کے لئے حکومت سے مذاکرات کئے مگر اس حکومت نے صحافیوں کے مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو ۲۹/اپریل ۱۹۷۸ء کو لاہور میں، آل پاکستان نیوز پیپرز ایمپلائیز کنفیڈریشن اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (PFUJ) کی مشترکہ سنٹرل کمیٹی نے لاہور سے ۱۳/اپریل سے روزنامہ 'مساوات' کی بحالی کے لئے احتجاجی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ کمیٹی نے گرفتار ایڈیٹروں کی رہائی اور 'مساوات' کی بحالی کے مطالبات پیش کئے ہیں۔ کمیٹی کے اجلاس میں منظور کردہ قرارداد میں کہا گیا کہ حکومت کے مخالفانہ رویہ کی بناء پر بات چیت ناکام ہوگئی ہے۔ لاہور میں بار بار صحافیوں اور اخباری کارکنوں نے رضا کارانہ طور پر گرفتاریاں دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس ہی دن لاہور میں حکومت پنجاب نے پی ایف یو جے کے صدر منہاج برنا کو ۲ ماہ کے لئے پنجاب بدر کر دیا۔ حکومت نے روزنامہ 'مساوات' کے دفتر میں تمام افراد کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ [۸۶]

۳۰/اپریل ۱۹۷۸ء کو پی ایف یو جے کے صدر منہاج برنا نے پنجاب سے نکالے جانے کے بعد کراچی پہنچنے پر کہا کہ آزادئ صحافت کا مسئلہ اس طرح حل نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا

کہ آزادیٔ صحافت صرف پنجاب کا نہیں بلکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے۔

۲۲ مارچ ۱۹۷۸ء سے ۲۷ مئی ۱۹۷۸ء تک روزنامہ 'مساوات' کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس سلسلے میں پی ایف یو جے اور ایپنک کی قیادت میں ملک بھر کے صحافیوں اور کارکنوں نے ۳۰ اپریل سے 'مساوات' لاہور کے دفتر میں بھوک ہڑتال کا پروگرام بنایا۔ اس فیصلے کے بعد ایپنک کے چیئرمین منہاج برنا کو لاہور میں عزیز صدیقی مرحوم کے گھر سے پکڑ کر چھ ماہ کے لئے صوبہ بدر کر دیا گیا۔ تقریباً بائیس افراد کو گرفتار کرنے کے بعد چودہ افراد کو سرسری سماعت کی فوجی عدالت کی طرف سے ۷ مئی ۱۹۷۸ء کو قید جرمانے کی سزائیں سنادی گئیں جن میں صدر پی ایف یو جے نثار عثمانی اور سیکریٹری جنرل ایپنک حفیظ راقب، سمیت تقریباً سو صحافیوں اور اخباری کارکنوں کو ایک سال قید کی سزا سنا کر پنجاب کی مختلف جیلوں میں ڈال دیا گیا۔

۱۰ مئی ۱۹۷۸ء کو سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے روزنامہ 'پیغام' سرگودھا کے ایڈیٹر مظفر حسین کو ۶ ماہ قید اور ۵ ہزار روپے جرمانے کی سزا دی۔

۱۱ مئی ۱۹۷۸ء کو حکومت سندھ کے پی ایف یو جے کے سربراہ منہاج برنا پر تقریر کرنے، بیان دینے اور انٹرویو دینے پر پابندی لگا دی گئی۔

جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے گرفتار شدہ صحافیوں اور اخباری کارکنوں کو سرسری سماعت کی فوجی عدالتوں کی جانب سے سزاؤں اور جرمانوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان صحافیوں کو پنجاب کی دور دراز کی جیلوں میں منتقل کیا گیا اور ان صحافیوں سے جسمانی مشقت لی جانے لگی۔ یہ ملک کی تاریخ میں ایک انوکھی صورتحال تھی۔

۱۳ مئی ۱۹۷۸ء کو لاہور میں سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے چار صحافیوں کو قید اور کوڑوں کی سزا دی۔ ان صحافیوں میں مسعود اللہ خان، اقبال احمد جعفری، خاور نعیم ہاشمی اور ناصر زیدی شامل تھے۔ ان صحافیوں کو ۱۳ مئی ۱۹۷۸ء کی رات کو کوٹ لکھپت جیل لاہور میں کوڑے مارے گئے۔ جیل کے ڈاکٹر نے کمزور جسمانی حالت اور اپاہج ہونے کی بناء پر مسعود اللہ خان کی خراب صحت کی بناء پر کوڑے مارنے کی اجازت نہیں دی اسلئے انہیں کوڑے نہیں لگے۔ برصغیر میں آزادیٔ صحافت اور صحافیوں کی جدوجہد کی تاریخ میں صحافیوں کو کوڑے مارنے کا واحد واقعہ ہے۔ فوجی حکومت کی اس کارروائی کی پوری دنیا میں مذمت کی گئی۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس

کو کور کرنے والے صحافیوں نے حکومت پاکستان کے اقدام کو وحشیانہ قرار دیا اور سیکریٹری خارجہ آغا شاہی کے دورہ اقوام متحدہ کے بائیکاٹ کی دھمکی دی۔ ۸۷

۱۵ مئی ۱۹۷۸ء کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور ایپنک کی اپیل پر صحافیوں اور کارکنوں کو کوڑے مارنے کے خلاف ۲ گھنٹے کی علامتی ہڑتال کی گئی۔

۱۶ مئی ۱۹۷۸ء کو پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (PPL) لاہور کی انتظامیہ نے پی ایف یو جے کے صدر منہاج برنا کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ انتظامیہ نے 'پاکستان ٹائمز' کراچی آفس میں بیورو چیف کی اسامی ختم کر دی۔ انتظامیہ کا کہنا کہ اب سابق بیورو چیف منہاج برنا کی خدمات کی ضرورت نہیں ہے۔ ۸۸

حکومت نے پی ایف یو جے کی تحریک کو ختم کرنے کے لئے پی ایف یو جے کے مخرفین کے ایک چھوٹے گروہ سے مذاکرات کئے۔

۲۰ مئی کو کراچی میں اخباری صنعت کی انجمنوں کے ۲۴ عہدیداروں نے پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور ایپنک کی قیادت پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ۸ نکاتی مطالبات کی منظوری تک بھوک ہڑتال جاری رہے گی۔ ان رہنماؤں نے مشترکہ بیان میں کہا کہ حکومت اور پنجاب یونین آف جرنلسٹس کے بعض خود ساختہ نمائندوں کے درمیان بات چیت کا پی ایف یو جے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان افراد اور حکومت کے درمیان ہونے والے معاہدے کو صحافی اور کارکن قبول نہیں کریں گے۔ اس بیان پر دستخط کرنے والوں میں پی ایف یو جے کے نائب صدر ایم اے قیوم، کراچی یونین آف جرنلسٹس کے سیکریٹری جنرل احفاظ الرحمٰن اور دوسرے عہدیدار شامل ہیں۔

۲۱ مئی ۱۹۷۸ء کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے نائب صدر اے ایم قیوم نے کہا کہ صرف پی ایف یو جے اور ایپنک کی قیادت ہی حکومت سے بات چیت کر سکتی ہے اور صحافیوں کے حقیقی نمائندوں کے علاوہ کسی اور سے حکومت کی بات چیت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یونین کے ترجمان نے نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات سے صحافیوں اور کارکنوں کی برطرفی کی مذمت کی۔ ترجمان نے کہا کہ این پی ٹی کا انتظامیہ کا مقصد صحافیوں اور کارکنوں کو آزادئ صحافت کی بحالی کی تحریک میں شمولیت سے روکنا ہے۔ ۲۱ مئی کو لاہور میں ایپنک اور پاکستان فیڈرل یونین

آف جرنلسٹس کے ترجمان نے کہا کہ روزنامہ 'مساوات' کی بحالی اور آزادئ صحافت کے تحفظ کے لئے صحافیوں اور کارکنوں کی بھوک ہڑتال حکومت اور اپنک و پی ایف یو جے کی قیادت سے بات چیت سے پہلے ختم نہیں ہوسکتی۔ ترجمان نے کہا کہ حکومت اور اخبارات کے درمیان تنازعات کھلے ماحول میں بات چیت کے ذریعے حل ہو سکتے ہیں۔ ترجمان نے کہا کہ بات چیت شروع ہونے سے پہلے حکومت کی کوئی بات نہیں مانی جاسکتی۔

۲۹ مئی ۱۹۷۸ء کو لاہور میں پنجاب یونین آف جرنلسٹس PUJ کے بعض نمائندوں اور حکومت کے درمیان معاہدے کے بعد حکام نے موجودہ انتظامیہ کے تحت 'مساوات' لاہور شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ پی یو جے کے ان نمائندوں اور اپنک کے بعض عہدیداروں نے ازخود حکومت کو یقین دہانی کرائی کہ روزنامہ 'مساوات' بین الاقوامی طور پر مسلمہ صحافتی اقدار کی پابندی کرے گا۔ حکومت نے پی ایف یو جے اور اپنک کی روزنامہ 'مساوات' لاہور کی بحالی کے لئے بھوک ہڑتال کی۔ تحریک میں گرفتار ہونے والے صحافیوں اور کارکنوں کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

حکومت نے روزنامہ 'مساوات' پر عائد پابندی ختم کردی۔ حکومت نے روزنامہ 'مساوات' کے ایڈیٹر ایس جی ایم بدرالدین اور سینئر صحافی ظہیر کاشمیری کو اور روزنامہ 'پیغام' سرگودھا کے ایڈیٹر مظفر الحسن کو رہا کردیا۔

۳۰ مئی ۱۹۷۸ء کو لاہور میں پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور اپنک کے ترجمان نے حکومت اور صحافیوں کے نام نہاد نمائندوں کے درمیان ہونے والے معاہدے کو مسترد کردیا۔ ترجمان نے کہا ہے کہ ان نمائندوں نے ۱۵۰ صحافیوں اور کارکنوں کی قربانیوں کو فروخت کردیا۔

۲ جون ۱۹۷۸ء کو حکومت سندھ نے پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا پر تقریر کرنے اور بیان دینے پر پابندی عائد کردی۔ حکومت نے یہ اقدام منٹی نس آف پبلک آرڈر آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۰ء کے تحت کیا۔[۸۹]

۵ جون ۱۹۷۸ء کو کراچی پولیس نے پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا کے خلاف دفعہ ۲۷۹ اور ۳۳۷ کے تحت مقدمہ درج کر کے گرفتار کرلیا۔ انہیں بعد میں

ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ منہاج برنا پر شاہراہ فیصل پر ایک سائیکل سوار کو ٹکر مارنے کا الزام لگایا گیا۔[90]

۶ جون ۱۹۷۸ء میں روزنامہ 'صداقت' کراچی میں وفاقی بجٹ پر تنقیدی اداریہ ''جنرل صاحب کا بجٹ اندھے کی لاٹھی'' شائع ہوا۔ یہ اداریہ بائیں بازو کے دانش ور محمد میاں نے تحریر کیا تھا۔ حکومت سندھ نے ۴ جولائی ۱۹۷۸ء کو روزنامہ 'صداقت' کراچی کے ایڈیٹر بشیر رانا کو گرفتار کر لیا۔ حکومت نے بشیر رانا کو پیشکش کی کہ وہ معذرت نامہ تحریر کریں تو انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ بشیر رانا نے حکومت کی پیشکش کو مسترد کر دیا۔ سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے بشیر رانا کو قید اور جرمانے کی سزا دی۔

۱۵ جون ۱۹۷۸ء کو کراچی میں پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا نے روزنامہ 'صداقت' کراچی کے ایڈیٹر بشیر رانا کی جانب سے حکومت کی پیشکش مسترد کرنے پر انہیں مبارکباد دی۔ برنا نے ایک بیان میں کہا کہ مسلح افواج کسی تنقید سے بالاتر نہیں اور بشیر رانا کا یہ مطالبہ درست ہے کہ ان کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔[91]

بشیر رانا کو سنٹرل جیل سکھر منتقل کر دیا گیا۔ بشیر رانا نے ۱۰ ستمبر ۱۹۷۸ء کو جیل میں ہونے والے غیر قانونی سلوک کے خلاف بھوک ہڑتال شروع کر دی۔

۱۵ ستمبر ۱۹۷۸ء کو اپینک اور پی ایف یو جے کے عہدیداروں نے سکھر جیل میں نظر بند روزنامہ 'صداقت' کے ایڈیٹر بشیر رانا سے اپیل کی کہ وہ بھوک ہڑتال ختم کر دیں۔ ان عہدیداروں میں منہاج برنا اور محمود علی اسد شامل تھے۔ ان رہنماؤں نے ایک بیان میں کہا کہ صحافی برادری بشیر رانا کی رہائی کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔[92]

روزنامہ 'مساوات' لاہور کی بحالی کی تحریک میں نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات کے صحافیوں اور کارکنوں نے بھرپور حصہ لیا۔ 'مساوات' کے بحال ہونے کے بعد نیشنل پریس ٹرسٹ کی انتظامیہ نے اس تحریک میں حصہ لینے پر ۲۴ سے زیادہ صحافیوں کو اور اخباری کارکنوں کو ملازمتوں سے برطرف کیا گیا۔ پی ایف یو جے نے روزنامہ 'مساوات' کراچی پر پابندی کے خاتمے این پی ٹی کے اخبارات سے برطرف کئے گئے۔ صحافیوں کی بحالی، گرفتار شدہ صحافیوں کی رہائی اور تمام امتناعی قوانین کی منسوخی اور دیگر معاشی مطالبات کی منظوری کے لئے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔

۳۰ جون ۱۹۷۸ء کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور ایپنک کی سنٹرل ایکشن کمیٹی کی اپیل پر یوم مطالبات منایا گیا۔ اس موقع پر روزنامہ 'مساوات' کراچی پر پابندیوں ہفت روزہ 'الفتح' اور ہفت روزہ 'معیار' کو نوٹس جاری کرنے سمیت صحافیوں کی نظر بندی اور نیشنل پریس ٹرسٹ NPT سے ۲۴ سے زیادہ صحافیوں کی برطرفی کی مذمت کی گئی۔ [۹۳]

۱۹ر جولائی ۱۹۷۸ء کراچی میں روزنامہ 'مساوات' کراچی پر پابندی کے خاتمے نیشنل پریس ٹرسٹ سے نکالے گئے صحافیوں کی بحالی، امتناعی قوانین کی منسوخی، گرفتار شدہ صحافیوں کی رہائی اور دوسرے ۸ مطالبات کو منوانے کے لئے پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور آل پاکستان نیوز پیپرز ایمپلائیز کنفیڈریشن کی اپیل پر صحافیوں نے کراچی پریس کلب میں بھوک ہڑتال شروع کردی۔ پی ایف یو جے کے سربراہ منہاج برنا کی قیادت میں ۴ صحافیوں کے گروپ نے بھوک ہڑتال شروع ہوگئی۔ ان صحافیوں کو رات گئے گرفتار کرلیا بھوک ہڑتال کی مہم جس میں صحافیوں کے علاوہ اخباری کارکنوں، طلبہ، مزدور، کسان، دانش ور شامل تھے۔ آزادئ صحافت کے لئے چلائی جانے والی تحریک میں پورے ملک سے تعلق رکھنے والے ۳۰۰ صحافیوں، اخباری کارکن، طالب علم، مزدور، کسان، وکیل اور دانش ور گرفتار ہوئے۔ اس تحریک کے دوران صحافیوں کے رہنما منہاج برنا کی قیادت میں صحافیوں، اخباری کارکنوں اور دیگر لوگوں نے سندھ کی مختلف جیلوں میں طویل بھوک ہڑتال کی۔ حکومت نے پی ایف یو جے اور ایپنک کی قیادت سے مذاکرات کئے اور ۱۹ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے سیکریٹری جنرل نثار عثمانی اور آل پاکستان نیوز پیپرز ایمپلائیز کنفیڈریشن کے سیکریٹری جنرل حفیظ راغب نے ایک مشترکہ بیان میں کہا کہ پاکستان قومی اتحاد (PNA) کے رہنماؤں اور دوسری سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور وکلاء کی اپیل اور حکام سے بات چیت کے بعد احتجاجی تحریک کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے جیل میں نظر بند بھوک ہڑتال کرنے والے صحافیوں سے اپیل کی کہ وہ بھی بھوک ہڑتال ختم کردیں۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ حکومت اخباری صنعت کے مسائل بات چیت سے حل کرے گی۔ پی ایف یو جے کے تحریک ختم کرنے کے اعلان کے ساتھ ہی سندھ کی جیلوں میں نظر بند صحافی اخباری کارکن، طالب علموں، مزدوروں، کسان، کارکنوں، وکیلوں اور دانش واروں کی رہائی شروع ہوگئی۔

۱۱/اکتوبر ۱۹۷۸ء کو اسلام آباد میں حکومت پاکستان نے نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین کو ہدایت کی کہ نیشنل پریس ٹرسٹ سے برطرف کئے گئے۔صحافیوں کی بحالی کے لئے نظرثانی کا عمل تیز کریں۔حکومت نے پی ایف یو جے کے سربراہ منہاج برنا سمیت یونین کے کئی عہدیداروں کو ملازمتوں پر بحال نہیں کیا۔

۱۷/اکتوبر ۱۹۷۸ء کو وفاقی حکومت نے اعلان کیا کہ تمام صوبائی حکومتوں نے بعض اخبارات پر پری سنسر شپ عائد کردی ہے۔وفاقی حکومت نے ایک اعلامیہ میں کہا کہ تمام صوبائی حکومتوں نے مغربی پاکستان امن وامان آرڈر آرڈیننس ۱۹۶۰ء کے تحت ۶ اخبارات اور ۲ رسائل پر ۲ ماہ کے لئے پری سنسر شپ عائد کی ہے۔ان اخبارات میں روزنامہ 'مساوات' کے تمام ایڈیشن، روزنامہ 'ہلال پاکستان' کراچی، روزنامہ 'امن' کراچی، روزنامہ 'صداقت' کراچی، روزنامہ 'اعلان' کراچی، روزنامہ 'نجات' سکھر ہفت روزہ 'نصرت' کراچی اور ہفت روزہ 'ذوالفقار' کراچی شامل ہیں۔[۹۴]

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا نے بعض اخبارات پر پری سنسر شپ عائد کرنے کی مذمت کی۔انہوں نے کہا کہ حکومت نے صحافیوں کی حالیہ تحریک سے یہ سبق سیکھا ہے کہ اخبارات کو بند کرنے کے بجائے ان پر سنسر شپ عائد کردی جائے۔منہاج برنا نے کہا کہ امتناعی قوانین کے تحت یہ فیصلہ جمہوری منحرفین Democratic Dissent کو ختم کرتا ہے۔[۹۵]

یکم نومبر ۱۹۷۸ء کو بھاولنگر کرسرسری سماعت کی فوجی عدالت نے روزنامہ 'امروز' لاہور کے نائندے عثمان نسیم ہاشمی کو ایک سال قید بامشقت کی سزا دی ہے۔ان پر مارشل لاء ضابطہ نمبر ۳۳ کی خلاف ورزی کا الزام تھا۔

معروف صحافی حسین نقی نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سیکریٹریٹ سے صوبوں اور ضلعی حکام کو بھیجے گئے۔ایک سرکلر کی بنیاد پر لاہور سے شائع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ 'ویو پوائنٹ' میں ایک آرٹیکل تحریر کیا۔سی ایم ایل اے سیکریٹریٹ نے اس سرکلر میں ضلعی حکام کو ہدایت کی تھی کہ بائیں بازو کے کارکنوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جائے۔

۳ دسمبر ۱۹۷۸ء کو حکومت پنجاب نے لاہور کے 'ویو پوائنٹ' کے ایڈیٹر مظہر علی خان اور

پاکستان پریس انٹرنیشنل PPI کے بیورو چیف حسین نقی کو آفیشل سیکریٹ ایکٹ کے تحت گرفتار کرلیا۔ حسین نقی کو تحقیقات کے لئے لاہور قلعہ میں نظر بند رکھا گیا۔

۹ دسمبر ۱۹۷۸ء حکومت پنجاب نے لاہور کے ہفت روزہ 'ویو پوائنٹ' پر سنسر شپ عائد کردی۔ یہ اقدام پبلک منٹی نس آرڈیننس ۱۹۶۰ء کے تحت کیا۔

سپریم کورٹ نے مارچ ۱۹۷۹ء میں سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی لاہور ہائی کورٹ سے سزائے موت کے خلاف اپیل کو چار تین کے فیصلہ سے مسترد کردیا۔ صدر جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی سزا موت معاف کرنے کے لئے دنیا کے بہت سے سربراہان مملکت کی رحم کی اپیلوں کو مسترد کرتے ہوئے ۴/اپریل ۱۹۷۹ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کا حکم دیا۔ کراچی اور ملک کے مختلف شہروں میں بھٹو کی پھانسی کے خلاف احتجاج کے لئے نکالنے جانے والے جلوسوں کو کور کرنے والے بعض صحافیوں کے خلاف مقدمات درج کئے گئے۔ یونائٹڈ پریس انٹرنیشنل (UPI) کراچی کے نامہ نگار داؤد سبحانی کو ۳ ماہ کے لئے نظر بند کردیا گیا۔ ہفت روزہ 'لوح وقلم' کے چیف ایڈیٹر ارشاد راؤ کے وارنٹ جاری کردیئے گئے اور روزنامہ 'صدات' کراچی کے سب ایڈیٹر بصیر نوید کو تھانے طلب کر کے پوچھ گچھ کی گئی۔

۱۰/اپریل ۱۹۷۹ء کو اسلام آباد میں روزنامہ 'مسلم' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ایاز امیر کو مارشل لاء ضابطہ نمبر ۳۳/اور امن وامان کے قانون مجریہ ۱۹۶۰ء کے تحت گرفتار کرلیا۔

۱۵/اکتوبر ۱۹۷۹ء کو مرکزی حکومت نے سرکاری خبر رساں ایجنسی اے پی پی APP کو مکمل طور پر سرکاری کنٹرول میں لینے کے لئے آرڈیننس جاری کیا۔

۲۰/اگست ۱۹۷۹ء کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا نے کہا کہ وفاقی حکام بعض اخبارات پر نئی پابندیوں خاص طور پر پری سنسر شپ نافذ کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اخبارات پر نئی پابندیوں سے صورتحال مزید کشیدہ ہوجائے گی۔ انہوں نے کہا کہ عام انتخابات کے انعقاد کے لئے ضروری ہے کہ صحافت مکمل طور پر آزاد ہونا ضروری ہے۔[۹۶]

۳ ستمبر ۱۹۷۹ء کو کراچی میں سندھ حکومت نے ماہنامہ 'پاکستان فورم' کو شوکاز نوٹس جاری کیا اور ۲۰ ہزار روپے ضمانت طلب کی۔[۹۷]

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر ضیاء الحق نے ۱۷/اکتوبر ۱۹۷۹ء کو عام انتخابات غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کرنے ان کے حسابات منجمد کرنے اور اخبارات پر مکمل سنسر شپ عائد کرنے کا اعلان کیا۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنی نشری تقریر میں کہا کہ وہ اخبارات اور جرائد جو صحافت کی آڑ میں ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھے بند کر دیئے گئے ہیں اور باقی اخبارات پر سنسر شپ عائد کر دی گئی ہے۔ ۱۸/اکتوبر ۱۹۷۹ء کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۴۹ جاری کیا جس کے تحت اخبارات پر پری سنسر شپ عائد کر دی گئی۔ یہ پری سنسر شپ کئی سالوں جاری رہی۔ حکومت سندھ نے کراچی کے روزنامہ 'صداقت' اور روزنامہ 'مساوات' کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ یہ اقدام مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۴۹ کے تحت کیا گیا۔ [98]

حکومت بلوچستان نے کوئٹہ کے روزنامہ 'اعتماد' اور روزنامہ 'قائد' پر پابندی لگا دی۔ کوئٹہ کے ڈپٹی کمشنر نے ان اخبارات کے ڈیکلریشن منسوخ کر دیئے۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو لاہور میں سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے ہفت روزہ 'صدائے وطن' کے ایڈیٹر شفقت محمود کو ایک سال قید، ۱۰ کوڑوں اور ۵۰ ہزار روپے جرمانے کی سزا دی۔ شفقت محمود پر مسلح افواج کے خلاف نفرت پھیلانے کا الزام لگایا گیا۔ پنجاب یونین آف جرنلسٹس نے شفقت محمود کو قید، کوڑوں اور جرمانے کی سزاؤں کو وحشیانہ قرار دیا۔

۱۳/نومبر ۱۹۷۹ء کو اسلام آباد میں ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے ہفت روزہ 'فار ایسٹرن اکنامک ریویو' کے نمائندے سلامت علی کو مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۴ اور ۱۳ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔

حکومت نے تعزیرات پاکستان کی دفعات ۴۹۹ اور ۵۰۰ میں ترمیم کر دی۔ اس ترمیم کے تحت سرکاری افسروں کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنے خلاف حقائق کی بنیاد پر شائع ہونے والے مواد سے ہتک محسوس کریں تو متعلقہ اخبار کے ایڈیٹر، پبلشر اور مصنف کے خلاف فوجداری مقدمہ درج کر سکتے ہیں۔ یوں پیچ کی اشاعت پر عملی طور پر پابندی لگا دی گئی۔

۱۹۸۰ء کے آخری مہینوں میں تمام مخالف جماعتوں کا اتحاد قائم ہوا جو تحریک بحالی جمہوریت کہلایا۔ ایم آر ڈی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

یکم جنوری ۱۹۸۱ء کو کراچی سے شائع ہونے والے پیپلز پارٹی کے حامی ہفتہ وار 'الفتح'

کے دفتر پر چھاپہ مار کر چیف ایڈیٹر ارشاد راؤ اور ایڈیٹر وھاب صدیقی، اسسٹنٹ ایڈیٹر واحد بشیر، کاتب ضامن علی شاہ اور عبدالسلام کو گرفتار کرلیا گیا۔ 'الفتح' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر واحد بشیر کے مطابق ان کے دفتر سے سینئر صحافی نعیم آروی، شرف علی، وھاب صدیقی کے بھائی نظام صدیقی، غلام مرتضی چوکیدار اور جلد ساز محمد اسلم کو بھی گرفتار کیا گیا۔ واحد بشیر کے مطابق نعیم آروی اور شرف علی کو ۱۴ دن بعد، چوکیدار غلام مرتضی کو ۲۶ دن بعد اور نظام صدیقی کو ۲۸ دن بعد رہا کیا گیا۔ 'الفتح' کے ایڈیٹر وھاب صدیقی کو ۱۹۸۱ء میں پی آئی اے کے جہاز کی ہائی جیکنگ کے نتیجے میں زبردستی دمشق بھیج دیا گیا۔ ان صحافیوں اور کارکنوں پر تحریری لٹریچر کی خفیہ طباعت اور اشاعت کا الزام لگایا گیا۔

نامعلوم نوجوانوں نے کراچی سے پشاور جانے والی پی آئی اے کی پرواز کو اغواء کرلیا اور طیارے کو کابل لے جایا گیا۔ کابل میں ایک ہائی جیکر جو بعد میں سلام اللہ کے نام سے مشہور ہوا نے کابل ایئرپورٹ پر پی آئی اے کے ایک مسافر، جو ایک پاکستانی فوجی افسر تھا کو قتل کردیا جس کے بعد فوجی حکومت نے پورے ملک سے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے علاوہ بائیں بازو کے کارکنوں صحافیوں، ادیبوں، ٹریڈ یونین رہنماؤں کی گرفتاری کی مہم شروع کردی۔ اس مہم کے دوران ہزاروں لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔

یکم مارچ ۱۹۸۱ء کو لاہور میں اس مہم کے دوران بائیں بازو کے سینئر صحافیوں مظہر علی خان، امین مغل، عبداللہ ملک، حمید اختر اور آئی اے رحمٰن کو گرفتار کر کے بہاولپور جیل میں نظر بند کردیا گیا۔ ان صحافیوں کو مارشل لاء ریگولیشن کے تحت ۶ ماہ کے لئے قید کیا گیا ہے۔

۳۰/اکتوبر ۱۹۸۱ء کو کراچی کی سرسری سماعت کی فوجی عدالت نے ہفت روزہ 'الفتح' کے ایڈیٹر ارشاد راؤ اور ضامن شاہ کو قابل اعتراض لٹریچر شائع کرنے، عوام میں سورش پیدا کرنے اور پاکستانی مسلح افواج کے خلاف بے اطمینانی پھیلانے کے الزام میں ایک ایک سال قید بامشقت فی کس ۵ کوڑوں کی سزا سنائی۔ ضامن علی شاہ اور عبدالسلام کو ایک سال بعد رہا کیا گیا جبکہ صحافی واحد بشیر کو ایک سال ۶ ماہ اور ۷ دن قید میں رہنا پڑا۔

۲۷ دسمبر ۱۹۸۱ء کو لاہور میں روزنامہ 'امن' لاہور کے نمائندے ادریس بٹ کو گرفتار کرلیا گیا۔

یکم جنوری ۱۹۸۲ء کو اخبارات پر عائد پری سنسر شپ ختم کی گئی مگر کچھ اخبارات اور جریدوں پر سنسر شپ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۲۰ مارچ ۱۹۸۲ء حکومت سندھ نے اندرون سندھ کے صحافیوں نثار بلیدی، روزنامہ 'ہلال پاکستان' شبیر، روزنامہ 'امن' سعید قائم خوانی، روزنامہ 'نوائے وقت' زبیر احمد مجاہد اور روزنامہ 'جنگ' کے رحمد ایوب چانڈیو کو گرفتار کرلیا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے ان صحافیوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔ یونین نے ایک بیان میں کہا کہ ان صحافیوں نے کسی قانون کی خلاف ورزی کی ہے تو پھر ان کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔[۹۹]

۱۵ر جولائی ۱۹۸۲ء کو لاہور میں سندھ کے روزنامہ 'ہلال پاکستان' کے لاہور کے بیورو چیف احسان اللہ خان کو گرفتار کرلیا گیا۔ پولیس انہیں نامعلوم مقام پر لی گئی۔

۲۱ر اگست ۱۹۸۲ء کو لاہور کے ایڈیشنل کمشنر نے پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر نثار عثمانی کو نوٹس جاری کیا۔ ان پر قابل اعتراض تقریر کرنے کا الزام تھا۔ نثار عثمانی کو نوٹس دیا گیا کہ وہ ۲۵ر اگست کو ڈویژنل کمشنر کے سامنے پیش ہو کر وضاحت کریں۔[۱۰۰]

۲۱ر اگست ۱۹۸۲ء کو لاہور میں پولیس نے بائیں بازو کے ہفت روزہ 'ویو پوائنٹ' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر امین مغل کو گرفتار کیا۔ پی ایف یو جے نے پنجاب کی انتظامیہ سے مطالبہ کیا کہ امین مغل کو رہا کیا جائے۔ یونین نے ایک بیان میں ان خبروں پر تشویش کا اظہار کیا کہ صحافی کو قید تنہائی میں رکھا گیا ہے۔[۱۰۱]

۲۳ر اگست ۱۹۸۲ء کو لاہور میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ۳ سو کارکنوں نے لاہور کے دو روزناموں روزنامہ 'جنگ' اور روزنامہ 'نوائے وقت' کے دفتروں پر حملہ کیا اور انہیں تہس نہس کر دیا۔ اس حملے میں روزنامہ 'نوائے وقت' کے ۸ کارکن زخمی ہو گئے۔ یہ طلبہ ان اخبارات میں شائع ہونے والی ایک خبر پر احتجاج کر رہے تھے۔ یہ خبر بھرا ہوا پستول لے کر پشاور جانے والی پی آئی اے کی پرواز میں سوار ہونے کی کوشش کرنے والے جمعیت کے ناظم اعلیٰ بشیر احمد اور ایک اور کارکن کی گرفتاری سے متعلق تھی۔ پنجاب یونین آف جرنلسٹس نے روزنامہ 'نوائے وقت' اور روزنامہ 'جنگ' لاہور کے دفاتر پر حملوں کی شدید مذمت کی۔ یونین کی ایک پریس ریلیز میں اس کارروائی کو اخبارات کے خلاف فاشسٹ کارروائی قرار دیا گیا۔ پریس ریلیز میں ملزمان کی گرفتاری کا مطالبہ کیا

گیا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے روزنامہ 'نوائے وقت' اور روزنامہ 'جنگ' لاہور کے دفاتر پر حملے کی شدید مذمت کی۔ یونین کے جاری کردہ پریس ریلیز میں ان حملوں کو آزادئ صحافت کے لئے خطرہ قرار دیا گیا۔ پریس ریلیز میں اے پی این ایس اور سی پی این ای کی ۲۵/اپریل ۱۹۸۸ء کو اخبارات کی ۲۴ گھنٹے کی ہڑتال کی حمایت کا اعلان کیا گیا۔ پی ایف یو جے نے ملحقہ یونینوں کو ہدایت کی کہ ۲۵/اپریل کو اس حملے کی مذمت میں احتجاجی جلسے منعقد کئے جائیں۔[۱۰۲]

فروری کے تیسرے ہفتے میں کراچی میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور شہر کے کچھ علاقوں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

۲۴ فروری ۱۹۸۳ء کو حکومت سندھ نے کراچی کے اخبارات پر سنسر شپ نافذ کر دی۔ اخبارات سے کہا گیا کہ وہ اشاعت سے قبل اپنی کاپیاں محکمہ اطلاعات سے کلیر کرائیں۔ مرکزی حکومت نے روزنامہ 'جنگ' کے اشتہارات بند کر دیئے۔ وزیر اطلاعات راجہ ظفر الحق نے مجلس شوریٰ میں بتایا کہ ۲۲ فروری سے روزنامہ 'جنگ' کے اشتہارات بند کر دیئے گئے ہیں کیونکہ روزنامہ 'جنگ' نے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں حکومت کی جاری کردہ پریس ایڈوائز کو نظر انداز کیا تھا۔

حزب اختلاف کے اتحاد تحریک بحالی جمہوریت جس میں پیپلز پارٹی، تحریک استقلال، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی پاکستان، ڈیموکریٹک پارٹی، جمعیت علمائے اسلام، مزدور کسان پارٹی، قومی محاذ آزادی سندھی تحریک، پاکستان نیشنل پارٹی شامل تھی نے ۱۹۷۳ء کے آئین کی بحالی، عام انتخابات کے انعقاد اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لئے ۱۴/اگست ۱۹۸۳ء سے سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پورے ملک میں سیاسی کارکنوں، وکلاء اور انسانی حقوق کے کارکنوں کی گرفتاریاں شروع ہوئی۔ پولیس اور فوج نے اندرون سندھ احتجاجی مظاہرین کو طاقت کے ذریعے کچلا۔ پولیس اور خفیہ ایجنسیوں نے ان سرگرمیوں کو رکرنے والے صحافیوں کو ہراساں کرنا شروع کیا۔ اخبارات کو مسلسل پریس ایڈوائز کے نظام کے ذریعے کنٹرول کیا جانے لگا۔

حکومت نے بحالی جمہوریت کی تحریک کو کوریج دینے والے کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ 'امن' پر پری سنسر شپ نافذ کر دی۔

۱۲ ستمبر ۱۹۸۳ء کو لاہور نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات روزنامہ 'پاکستان ٹائمز'، روزنامہ 'امروز' اور روزنامہ 'مشرق' کے ۱۰ صحافیوں نے بحالی جمہوریت کی تحریک میں سندھ کے عوام کے ساتھ یکجہتی کی ایک دستاویز پر دستخط کئے۔ یہ دستاویز لاہور کے ۵۵ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی جانب سے تیار کی گئی تھیں۔ ان صحافیوں میں روزنامہ 'مشرق' کے ایڈیٹر عزیز مظہر، اسٹاف رپورٹر ممتاز احمد، سب ایڈیٹر اورنگ زیب، 'پاکستان ٹائمز' کے چیف رپورٹر ای ایچ راشد، سینئر سب ایڈیٹر ریاض ملک، روزنامہ 'امروز' کے ڈپٹی ایڈیٹر مسعود اشعر، اسسٹنٹ ایڈیٹر شفقت تنویر مرزا، فیچر رائٹر مسز رخشندہ حسن، چیف رپورٹر بدرالاسلام، میگزین انچارج اطہر جاوید شامل تھے۔ دونوں اخبارات کی انتظامیہ نے ان صحافیوں کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔

پنجاب یونین آف جرنلسٹس اور پاکستان یونین آف جرنلسٹس نے صحافیوں کی نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات سے برطرفی کی شدید مذمت کی۔ پی ایف یو جے کے صدر نثار عثمانی نے ایک بیان میں کہا کہ ان صحافیوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر اس بیان پر دستخط کئے تھے۔ اس لئے ان سے روزگار چھین لیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ان صحافیوں کی برطرفی آزادئ صحافت پر بدترین حملہ ہے۔[۱۰۳]

۵ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو فیصل آباد میں روزنامہ 'ڈان' فیصل آباد کے نمائندے شمس السلام ناز کو ویسٹ پاکستان پبلک منٹی نس آرڈر کے تحت ایک ماہ کے لئے گرفتار کر لیا گیا۔ انہیں ڈسٹرکٹ جیل فیصل آباد میں نظر بند کیا گیا۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو راولپنڈی میں روزنامہ 'حیدر' کے چیف ایڈیٹر رفیع بٹ کو مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۲ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔[۱۰۴]

'ڈان' گروپ کے رسالے ماہنامہ 'ہیرالڈ' کے ۱۹۸۴ء کے اکتوبر کے شمارے میں حکومتی معاملات پر ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع ہوئی۔

۷ جنوری ۱۹۸۴ء کو حکومت سندھ نے کراچی کے ماہنامہ 'ہیرالڈ' کو شوکاز نوٹس جاری کیا۔ حکومت نے رسالے کی اکتوبر کی اشاعت میں قابل اعتراض مواد کی اشاعت پر ۱۰ ہزار روپے ضمانت طلب کی۔

صدر جنرل ضیاء الحق کے دور میں نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات کی ادارتی آزادی

ختم کر کے انہیں مکمل طور پر حکومت کا ترجمان بنا دیا گیا جس کے نتیجے میں ان اخبارات کی اشاعت بہت کم ہوگئی اور ان اخبارات میں مالیاتی خسارہ بڑھنا شروع ہوگیا۔ حکومت نے ان اخبارات کو مالیاتی خسارہ سے بچانے کے لئے سرکاری اداروں کو ہدایات جاری کیں وہ صرف نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات خریدیں۔

۱۹ر فروری ۱۹۸۴ء کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے حکومت کے اس سرکلر پر تشویش کا اظہار کیا جس میں سرکاری اداروں کو ہدایت دی گئی ہیں کہ وہ صرف نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات خریدیں۔ اس سرکلر میں روزنامہ 'جنگ' لاہور، روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور، روزنامہ 'مسلم' اسلام آباد، 'ڈان'، 'حریت'، 'اسٹار'، 'ڈان' کراچی خارج کر دئے ہیں جبکہ سرکاری اخبارات 'پاکستان ٹائمز' لاہور، روزنامہ 'امروز' لاہور، روزنامہ 'مارننگ نیوز' کراچی، 'ہلال پاکستان' کراچی، روزنامہ 'مشرق' اور 'اخبار خواتین' اسی فہرست میں شامل ہیں۔[۱۰۵]

سندھ کے سینئر صحافی 'سندھ نیوز' کے سابق نیوز ایڈیٹر سہیل سانگی کو ۱۱ر نومبر ۱۹۸۰ء کو کراچی سے گرفتار کیا گیا۔ ان کے ساتھ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر نذیر عباسی، کمیونسٹ پارٹی کے رہنما پروفیسر جمال نقوی، کمال وارثی، بدر ابڑو، امر لال اور بشیر شر کو باغیانہ لٹریچر شائع کرنے اور حکومت اور مسلح افواج کے خلاف نفرت پھیلانے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ نذیر عباسی کو فوجی حکام نے تشدد کر کے شہید کر دیا۔ سہیل سانگی کمیونسٹ رہنما جام ساقی، جمال نقوی، کمال وارثی، بدر ابڑو، امر لال، بشیر شر اور طالب علم رہنما (چیف ایڈیٹر 'عوامی آواز') ڈاکٹر جبار خٹک کے خلاف خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ خفیہ عسکری ایجنسی انٹر سروسز انٹیلی جنس ایجنسی (ISI) کی تفتیش کے دوران طالب علم رہنما نذیر عباسی جاں بحق ہوگئے۔ خصوصی فوجی عدالت نے سہیل سانگی کو تمام الزامات سے بری کر دیا اور وہ شدید بیمار ہوگئے مگر انہیں رہا نہیں کیا گیا۔

سہیل سانگی کو ۱۱ر نومبر ۱۹۸۵ء کو رہا کیا گیا۔[۱۰۶]

۱۹۸۰ء میں روزنامہ 'جنگ' لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا۔ 'جنگ' لاہور کمپیوٹر کی جدید ٹیکنالوجی پر شائع ہونے والا پہلا پاکستانی اخبار تھا۔ یہ ایک نئے لے آؤٹ، رنگین تصاویر پر خبروں اور توصیحی آرٹیکلز کی بناء پر پورے پنجاب میں مقبول ترین اخبار کی حیثیت اختیار کر گیا۔ 'جنگ' کی

مقبولیت سے روزنامہ 'نوائے وقت' کی سرکولیشن متاثر ہوئی۔ روزنامہ 'نوائے وقت' کو رجعت پسندانہ پالیسی کو تبدیل کرنا پڑا۔ 'نوائے وقت' کے چیف ایڈیٹر مجید نظامی ۱۹۸۴ء میں اے پی این ایس اور سی پی این ای کے صدر منتخب ہو گئے۔ انہوں نے ایک بیان میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صدر ضیاء الحق سے مطالبہ کیا کہ اخبارات کے درمیان مقابلے کی دوڑ کو روکنے کے لئے مارشل لاء ریگولیشن جاری کیا جائے۔

۱۹/اپریل ۱۹۸۴ء کو کراچی یونین آف جرنلسٹس کے صدر صدیق بلوچ اور جنرل سیکریٹری صبیح الدین غوثی نے آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی (APNS) اور کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز (CPNE) کے صدر مجید نظامی کے اس بیان کی مذمت کی جس میں انہوں نے حکومت سے اخبارات کے درمیان سرکولیشن کے مقابلہ کی دوڑ ختم کرنے کے لئے مارشل لاء ریگولریشن کے اجراء کی اپیل کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ مجید نظامی نے حکومت سے اخبارات پر مزید پابندیوں کی مانگ کی ہے جس سے اخبارات کی ساتھ متاثر ہوگی اور نیا مارشل لاء ضابطہ اخبار کے ادارہ کو تباہ کر دے گا۔[۱۰۷]

'پاکستان ٹائمز' کی انتظامیہ نے پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر منہاج برنا کو ۱۹۷۹ء میں روزنامہ 'مساوات' پر پابندی کے خلاف تحریک منظم کرنے پر 'پاکستان ٹائمز' سے برطرف کر دیا تھا۔ برنا صاحب نے اپنی برطرفی کو قومی صنعتی تعلقات کمیشن میں چیلنج کیا۔ کمیشن نے ۵ سال بعد منہاج برنا کی برطرفی کو غیر قانونی قرار دیا تو 'پاکستان ٹائمز' کی انتظامیہ نے منہاج برنا کو ان کی اصل اسامی یعنی کراچی میں بحیثیت بیورو چیف تعینات کرنے کے بجائے بلوچستان کے شہر قلات میں تبادلہ کر دیا۔

جون ۱۹۸۴ء میں امریکی وزیر دفاع وائن برگر نے لاہور کا دورہ کیا اور ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ اس پریس کانفرنس میں شریک پی پی آئی لاہور کے بیورو چیف نے وائن برگر سے امریکہ کی پاکستان سے متعلق پالیسی پر سوال کیا۔ حسین نقی کے اس سوال کو پسند نہیں کیا گیا اور انہیں پی پی آئی کی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

صدر جنرل ضیاء الحق نے اپنی حکومت کو سویلین حکومت میں تبدیل کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۸۴ء میں ایک منصوبہ پر عملدرآمد شروع کیا۔ اس منصوبے کے تحت صدارتی ریفرنڈم کا

انعقاد کیا گیا۔ اس ریفرنڈم میں ووٹروں سے سوال کیا گیا کہ وہ صدر ضیاء الحق کے اسلامی نظام کے نفاذ کے عمل کی حمایت کرتے ہیں اور اس سوال کی حمایت کا یہ مطلب لیا گیا کہ ووٹرز صدر ضیاء الحق کو آئندہ 5 سالوں کے لئے صدر منتخب کر رہے ہیں۔ وزارت اطلاعات نے اس ریفرنڈم کے موقع پر اخبارات کو پریس ایڈوائز کے ذریعے پابند کیا کہ وہ صرف ریفرنڈم کی حمایت میں خبریں، تبصرے اور بیانات شائع کریں اور اخبارات کو ہدایت کی گئی کہ وہ کالعدم سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی پریس کانفرنس میں رپورٹرنہ بھیجیں۔

صدر ضیاء الحق نے ۱۹۸۴ء کے ریفرنڈم میں کامیابی کے بعد ۲۰ مارچ ۱۹۸۵ء کو ملک میں غیر جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا مگر حکومت نے آزادانہ اور شفاف انتخابات کے انعقاد کے لئے اخبارات پر دباؤ کم نہیں کیا۔

۱۲ر فروری ۱۹۸۵ء کو پنجاب کے محکمہ داخلہ نے ہفت روزہ 'عوامی جمہوریت' لاہور کو عظیم شاعر فیض احمد فیض کی نظم 'محنت کش' شائع کرنے پر نوٹس جاری کیا۔ حکومت کے نوٹس میں کہا گیا کہ اس نظم کی اشاعت سے مختلف طبقات میں نفرت پھیلے گی۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے صدر نثار عثمانی نے فیض احمد فیض کی نظم کی اشاعت پر ہفت روزہ 'عوامی جمہوریت' کو نوٹس دینے کی مذمت کی۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کا اقدام آزادئ صحافت پر حملے کے مترادف ہے۔[۱۰۸]

۲۰ مارچ ۱۹۸۵ء کو ملک میں غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات منعقد ہوئے۔ صدر ضیاء الحق نے میر پور خاص ضلع سے منتخب قومی اسمبلی اور سندھ کے روحانی پیشوا پیر پگارا کے قریبی معاون محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم نامزد کیا۔ محمد خان جونیجو نے کچھ عرصے بعد سیاسی جماعت مسلم لیگ کی قیادت سنبھال لی اور دسمبر ۱۹۸۵ء میں مارشل لاء کے خاتمے کا اعلان کیا۔[۱۰۹]

۱۹۸۵ء میں کراچی میں پریشر گروپ ظہور پذیر ہوئے۔ یہ پریشر گروپ سیاسی، مذہبی، لسانی جماعتوں اور ان کی ذیلی تنظیموں کے کارکنوں پر مشتمل تھے۔ ۲۲ر اپریل کو طلبہ کے ایک گروہ نے جماعت اسلامی کے ترجمان اخبار روزنامہ 'جسارت' کراچی کے دفتر پر حملہ کیا اور دفتر کو نقصان پہنچایا۔

نومبر ۱۹۸۵ء وزیر اعظم جونیجو کے اخبارات پر پابندیوں کے خاتمے کے اعلانات کے باوجود روزنامہ 'امن' کراچی اور ہفت روزہ 'معیار' پر سے سنسر شپ ختم نہیں کی گئی۔[۱۱۰]

اکتوبر ۱۹۹۹ء کو وزیراعظم نواز شریف اور چیف آف اسٹاف جنرل پرویز مشرف کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ وزیراعظم نواز شریف نے چیف آف اسٹاف جنرل پرویز مشرف کو اس وقت برطرف کیا جب وہ سری لنکا سے پی آئی اے کے جہاز کے ذریعے کراچی آ رہے تھے۔ جنرل ہیڈکوارٹرز کے کمانڈروں نے وزیراعظم نواز شریف کو گرفتار کر لیا اور جنرل پرویز مشرف ملک کے چیف ایگزیکٹو بن گئے۔ ان کے دور میں صحافیوں پر پولیس کا تشدد، خفیہ ایجنسیوں کے اہلکاروں کی ہراساں کرنے کی کارروائیوں، اخبارات پر حملوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔

سابق وزیراعظم نواز شریف کے خلاف کراچی میں طیارہ اغواء کرنے کے الزام، دہشت گردی کی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔

۲۰ نومبر ۱۹۹۹ء کو کراچی میں دہشت گردی کے مقدمات کی سماعت کی عدالت کے سامنے پولیس نے صحافیوں پر تشدد کیا۔ اس عدالت میں سابق وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کے خلاف ملک کے سربراہ جنرل پرویز مشرف کے طیارے کو اغواء کرنے کے مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔

۱۳ مئی ۲۰۰۰ء کو میرپور خاص میں روزنامہ 'امت' کراچی کے رپورٹر صوفی محمد خان کو نامعلوم افراد نے قتل کر دیا۔ صوفی خان نے عورتوں کی اسمگلنگ کے بارے میں ایک تحقیقاتی رپورٹ تیار کی تھی۔

۱۹ مئی ۲۰۰۰ء کو کراچی میں ممتاز عالم مولانا یوسف لدھانوی کے قتل کے بعد مذہبی جنونی عناصر نے روزنامہ 'بزنس ریکارڈ' کراچی کے دفتر پر حملہ کر کے اس کو آگ لگا دی۔

۱۸ جولائی ۲۰۰۰ء کو حیدرآباد کے سینیئر صحافی عبدالحفیظ عابد پر ۴ افراد نے حملہ کیا جس سے وہ زخمی ہو گئے۔

حیدرآباد کے صحافیوں نے عبدالحفیظ عابد پر حملے کے ذمہ دار افراد کی گرفتاری کا مطالبہ کیا۔[111]

۲۶ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو اسلام آباد حکومت نے ہفت روزہ 'کے ٹو' (K2) پر پابندی لگا دی اور اسکردو کے ڈپٹی کمشنر نے اخبار کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا۔

۲۷ستمبر ۲۰۰۰ء کو پاکستانی فوج کے کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن میں تعینات افسروں اور کے۔ای۔ایس۔سی کے عملے نے روزنامہ 'ڈان' کراچی کے دفتر پر چھاپہ مارا اور بجلی کے میٹر چیک کیے۔[۱۱۲]

یکم فروری ۲۰۰۱ء کو پشاور حکومت سرحد نے روزنامہ 'فرنٹیئر پوسٹ' پشاور پر پابندی لگادی۔حکومت نے یہ اقدام اخبار میں توہین رسالت پر مبنی ایک خط کی اشاعت کے بعد کیا۔پشاور میں ایک ہجوم نے روزنامہ فرنٹیئر پوسٹ کے دفتر پر حملہ کیا اور اس دفتر کو نذر آتش کردیا۔خیبر یونین آف جرنلسٹس نے مطالبہ کیا کہ اس افسر کے خلاف کارروائی کی جائے جس نے 'فرنٹیئر پوسٹ' کے ان صحافیوں کے خلاف ایف۔آئی۔آر درج کی جن کا اخبار میں شائع ہونے والے متنازعہ خط سے تعلق نہیں تھا۔[۱۱۳]

۲۸ مارچ ۲۰۰۱ء کو اسلام آباد میں روزنامہ 'نیوز' اسلام آباد کے چیف رپورٹر شکیل شیخ کو نامعلوم افراد نے اغواء کیا اور انہیں نامعلوم مقام پر لے جا کر تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔تشدد کرنے والوں نے شکیل کو بتایا کہ ان کی رپورٹوں پر سزا دی جارہی ہے۔۴/اپریل ۲۰۰۱ء کو لاہور پولیس نے پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور ایپنک کے تحت روزنامہ 'نیوز' اسلام آباد کے چیف رپورٹر شکیل شیخ کو اغواء اور تشدد کے خلاف صحافیوں نے جلوس نکالا۔جلوس کے شرکاء آزادئ صحافت کے تحفظ کے لئے نعرے لگا رہے تھے مگر پولیس نے جلوس کے شرکاء پر لاٹھی چارج کیا۔[۱۱۴]

۱۷/نومبر ۲۰۰۱ء کو اسلام آباد میں روزنامہ 'ڈان' اسلام آباد کے رپورٹر فراز ہاشمی پر ایک فوجی افسر نے حملہ کیا اور فراز ہاشمی کو شدید زخمی کردیا۔[۱۱۵]

صدر جنرل پرویز مشرف نے ۲۰۰۲ء میں اپنی حکومت کو سویلین حکومت میں تبدیل کرنے کے منصوبے پر عملدرآمد شروع کیا۔اس منصوبے کے پہلے مرحلہ میں صدر پرویز مشرف نے صدارتی ریفرنڈم منعقد کرایا جس میں وہ خود صدارتی امیدوار تھے اور اس ریفرنڈم میں اکثریتی ووٹوں سے کامیابی حاصل کی۔اس کے ساتھ ہی حکومت کے لیے پریس قوانین کی تیاری کو آخری شکل دیدی۔ان قوانین میں پریس کونسل کے قیام کے قانون کا مسودہ بھی شامل تھا۔[۱۱۶]

۱۴/اپریل ۲۰۰۲ء کو فیصل آباد میں فوج کے سربراہ جنرل مشرف کے ریفرنڈم کے جلسہ میں ہونے والے جلسے کو کور کرنے والے ۲۹ صحافیوں نے پنجاب کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل خالد

مقبول کے اخبارات کے خلاف ریمارکس پر احتجاج کیا تو پولیس نے احتجاج کرنے والے صحافیوں پر تشدد کیا۔

۱۶/اپریل ۲۰۰۲ء کو لاہور میں فیصل آباد میں صحافیوں پر تشدد کے خلاف لاہور میں صحافیوں نے جلوس نکالا۔ جلوس لاہور پریس کلب سے شروع ہوا اور گورنر ہاؤس پر مظاہرہ کیا گیا۔[۱۱۷]

صدر مشرف نے جمہوریت کی بحالی کے دوسرے مرحلہ میں عام انتخابات منعقد کرائے۔ ان انتخابات میں قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی نے اکثریتی نشستیں حاصل کیں مگر مسلم لیگ کے رہنما ظفراللہ جمالی وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ سرحد میں متحدہ مجلس عمل نے حکومت بنائی۔ پنجاب، بلوچستان اور سندھ میں مسلم لیگ نے حکومتیں قائم کی اور متحدہ قومی موومنٹ کے مرکز اور سندھ میں مخلوط حکومت میں شمولیت اختیار کی۔

حکومت نے ہتک عزت کا نیا قانون مجریہ ۲۰۰۲ء تیار کیا جو دوسرے قوانین کے تحت لیگل فریم ورک آرڈر LFO کے تحت نافذ ہوا۔

۳۰ مئی ۲۰۰۲ء کو کراچی پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور کراچی یونین آف جرنلسٹس نے ہتک عزت کے مجوزہ قانون پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ پی ایف یو جے اور کے یو جے کے مشترکہ بیان میں کہا گیا کہ ہتک عزت کے مجوزہ قانون کے ذریعے سرکاری دستاویزات کے حوالے سے نئی پابندیاں عائد ہونگی جو آزادئ صحافت کے منافی ہونگی۔[۱۱۸]

۳۰ جولائی ۲۰۰۲ء کو اسلام آباد میں پولیس نے اسلام آباد کے مضافاتی گاؤں میں پولیس کی کارروائی کی تصاویر بھیجنے والے فوٹو گرافروں پر گولی چلادی۔

۲۱/اگست ۲۰۰۲ء کو کراچی روزنامہ 'نیشن' کراچی کے رپورٹر عزیز سنگھو کو کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کے مینیجنگ ڈائریکٹر نے چائے پر مدعو کیا۔ عزیز سنگھو کے۔ای۔ایس۔سی کے مرکزی دفتر گئے تو ایم ڈی کے سامنے کارپوریشن کے بعض افسروں نے انہیں زدوکوب کیا۔ یہ افسران عزیز سنگھو کی کے۔ای۔ایس۔سی کی کارکردگی کے بارے میں خبروں سے ناراض تھے۔

۲۲/اکتوبر ۲۰۰۲ء کو جیکب آباد میں بجرانی قبیلہ کے سردار کے بیٹوں نے مقامی صحافی شاہد سومرو کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے شاہد سومرو نے

قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ کیا۔[۱۱۹]

وفاقی حکومت نے ذرائع ابلاغ سے متعلق قوانین جن اطلاعات کے حصول کا قانون پریس کونسل ہتک عزت رجسٹریشن آف بکس اینڈ نیوز پیپرز اے پی پی کی سرکاری تحویل میں لینے اور پاکستان الیکٹرونک میڈیا کنٹرول اتھارٹی کے قیام کے قوانین قومی اسمبلی کے اجلاس سے پہلے نافذ کر دیئے۔

۶ نومبر ۲۰۰۲ء کو کراچی یونین آف جرنلسٹس نے مطالبہ کیا کہ پریس سے متعلق قوانین قومی اسمبلی میں پیش کئے جائیں۔ یونین نے ہنگامی اجلاس میں منظور کی جانے والی قرارداد میں اس بات کو نوٹ کیا گیا کہ قومی اسمبلی کے اجلاس سے پہلے ایسے اہم قوانین آرڈیننس کے ذریعے ملک میں نافذ کر دیئے گئے ہیں۔[۱۲۰]

۲۵ دسمبر ۲۰۰۲ء کو فیصل آباد میں روزنامہ 'پاکستان' فیصل آباد کے نمائندے رشید قمر کو نامعلوم افراد نے گولی مار کر زخمی کر دیا۔ پنجاب یونین آف جرنلسٹس نے رشید قمر پر قاتلانہ حملے کی مذمت کی۔ یونین نے نامعلوم ملزمان کی گرفتاری کا مطالبہ کیا۔[۱۲۱]

یکم جنوری ۲۰۰۳ء کو کوئٹہ کے روزنامہ 'لشکر' کے نامہ نگار رشید بٹ کو گرفتار کر لیا گیا۔ رشید بٹ کو چار دن بعد رہا کر دیا گیا۔

یکم جنوری ۲۰۰۳ء کو راولپنڈی لاہور ہائی کورٹ راولپنڈی برانچ میں لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے عہدیداروں کی پریس کانفرنس کو کور کرنے والے صحافیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

۲۰۰۲ء میں دہشت گردی کے خلاف جنگ افغانستان سے پاکستان میں داخل ہو گئی اور ملک بھر میں خفیہ تحقیقاتی ایجنسیوں نے صحافیوں سے پوچھ گچھ کرنا شروع کر دی اور پولیس نے صحافیوں کے پیشہ ورانہ فرائض میں مداخلت کی پالیسی کو تیز کیا۔ قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد میں مذہبی انتہا پسندوں نے صحافیوں کو نشانہ بنانا شروع کیا۔

۱۸ مارچ ۲۰۰۳ء کو خیبر یونین آف جرنلسٹس نے صحافیوں کے ساتھ پولیس حکام کی بدسلوکی کی مذمت کی۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ روزنامہ 'ڈان' کے نمائندے محبوب خٹک کے ساتھ اس وقت بدسلوکی کی گئی جب وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دے رہے تھے۔[۱۲۲]

۶ مئی ۲۰۰۳ء کو اسلام آباد کے سینیئر صحافیوں عامر متین، کامران خان اور سماجی کارکن

انصار برنی سے ایک خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں نے پوچھ گچھ کی اور ان صحافیوں کو ہراساں کرنے کی کوشش کی گئی۔

۲۹ مئی ۲۰۰۳ء کو پولیس نے پنجاب اسمبلی کے سامنے صحافیوں پر لاٹھی چارج کیا۔ صحافی پنجاب اسمبلی کے قائد حزب اختلاف کی تقریر کور کر رہے تھے کہ پولیس نے ان پر لاٹھی چارج کر دیا۔ بعد میں صحافیوں نے پنجاب اسمبلی کا بائیکاٹ کیا۔

پشاور کے اخبار 'فرنٹیئر پوسٹ' میں ۱۹۹۹ء میں توہین رسالت پر مبنی ایک خط شائع ہوا تھا جس پر اخبار کے صحافی منور محسن کے خلاف مقامی عدالت میں مقدمہ چلا۔

۱۱ر جولائی ۲۰۰۳ء کو پشاور میں روزنامہ 'فرنٹیئر پوسٹ' کے صحافی منور محسن کو مقامی عدالت نے توہین رسالت کے مقدمے میں سزا سنا دی۔

۲۸ر اگست ۲۰۰۳ء کو حیدر آباد میں صدر مشرف کی حیدر آباد آمد کے موقع پر خواتین کے مظاہرے کو کور کرنے والے صحافیوں کے خلاف دہشت گردی کے تدارک کے قانون کے تحت مقدمات درج کئے گئے۔ جن صحافیوں کے خلاف مقدمات درج ہوئے ہیں ان میں ندیم پنہور، کلیم چانڈیو، شریف ابڑو، انور چانڈیو، عرفان، شاہد خٹک اور حاجی خان سیال شامل ہیں۔

کراچی میں صحافیوں نے حیدر آباد کے صحافیوں کے خلاف مقدمات درج کرنے کے خلاف احتجاجی طور پر سندھ اسمبلی کا بائیکاٹ کیا۔ [۱۲۳]

یکم ستمبر ۲۰۰۳ء کو پشاور روزنامہ 'مشرق' خیبر ایجنسی کے نامہ نگار نصر اللہ فریدی اور رسالہ 'صبح' کے اورنگ آفریدی کو تنظیم اتحاد علماء نے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ خیبر یونین آف جرنلسٹس نے ان صحافیوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔ یونین نے ایک بیان میں کہا کہ نام نہاد علماء کی تنظیم نے ان صحافیوں کو رہا کر دیا مگر صحافیوں کو دھمکیاں دی گئیں کہ وہ آزادئ صحافت کا حق استعمال نہ کریں۔ [۱۲۴]

۱۷ر ستمبر ۲۰۰۳ء اٹک پنڈی داد خان کے رپورٹر راجہ اعجاز خان کو نامعلوم افراد نے قتل کر دیا۔ اٹک کے صحافیوں نے راجہ اعجاز خان کے قاتلوں کی گرفتاری کے لیے مظاہرہ کیا۔ [۱۲۵]

۶ر اکتوبر ۲۰۰۳ء کو روزنامہ 'کاوش' حیدر آباد کے نمائندے امیر بخش بروھی کو نامعلوم افراد نے قتل کر دیا۔

۱۶ر دسمبر کو فرانس کے دو صحافیوں اور ایک پاکستانی صحافی خاور مہدی کو غیر قانونی طور پر افغانستان جانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ فرانسیسی صحافیوں کو ضمانت پر رہائی کے بعد ملک سے جانے کی اجازت دی دیدی گئی مگر خاور مہدی کو مچھ جیل بلوچستان میں نظر بند رکھا گیا۔

سینئر صحافی مبشر زیدی کی ماہنامہ 'ہیرالڈ' میں کشمیر میں جہادی عناصر کی سرگرمیوں کے بارے میں ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع ہوئی تھی جس پر ان کے خلاف میڈیا میں مہم چلائی گئی۔

۱۹ر جنوری ۲۰۰۴ء کو راولپنڈی اسلام آباد یونین آف جرنلسٹس نے سینئر صحافی مبشر زیدی کے خلاف میڈیا ٹرائل کی مذمت کی۔ آر ای یو جے کا اجلاس میں منظور کردہ قرارداد میں کہا گیا کہ سینئر صحافی اپنے پیشہ ورانہ فرائض صحافت کے اصولوں کے مطابق انجام دے رہے ہیں۔ اس مہم کا مقصد مبشر زیدی کو ہراساں کرنا ہے۔[۱۲۶]

۱۳ر مئی ۲۰۰۴ء کو مسلم لیگ کے رہنما شہباز شریف جلا وطنی کے دوران لاہور آئے تو انہیں لاہور ایئرپورٹ پر گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔

۱۴ر مئی ۲۰۰۴ء کو مسلم لیگ کے رہنما شہباز شریف کے ہمراہ پاکستان آنے والے صحافیوں پر تشدد کیا گیا۔ پولیس نے بی بی سی کے نمائندے ظفر عباس، سی این این کے نمائندے محسن نقوی کو گرفتار کر لیا اور ان کا سامان ضبط کر لیا۔

۲۹ جون ۲۰۰۴ء کو مانسہرہ کے صحافی ماجد کو ڈسٹرکٹ ناظم نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ماجد پر اپنے علاقے میں شراب کی غیر قانونی بڑھتے ہوئے کاروبار کی خبریں شائع کرنے کا الزام تھا۔ خیبر یونین آف جرنلسٹس نے مقامی صحافی ماجد کی ہلاکت کی مذمت کی ہے اور ملزمان کی گرفتاری کا مطالبہ کیا۔[۱۲۷]

یکم مارچ ۲۰۰۴ء کو کراچی پریس کلب پر ایک ہجوم نے حملہ کر دیا اور فرنیچر کو نقصان پہنچایا۔ ہجوم میں شامل افراد پہلے پریس کلب کے باہر اپنے مطالبات کے لئے مظاہرہ کر رہے تھے۔

کراچی یونین آف جرنلسٹس اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے کراچی پریس کلب پر حملے کی مذمت کی۔ دونوں یونینوں کے ایک مشترکہ بیان میں کہا گیا تھا کہ کراچی پریس کلب آزادی صحافت کا مرکز ہے۔ بیان میں ملزمان کی گرفتاری کا مطالبہ کیا گیا۔[۱۲۸]

۲۰۰۴ء میں اوکاڑہ ملٹری فارمز کے کسانوں نے مالکانہ حقوق کے لئے طویل جدوجہد کی اوکاڑہ کے صحافی ارشد جاوید نے اس جدوجہد کی مکمل رپورٹنگ کی جس پر رینجرز نے انہیں گرفتار کیا اور تشدد کا نشانہ بنایا۔

۳۰ راگست ۲۰۰۴ء کو روزنامہ 'نوائے وقت' اوکاڑہ کے صحافی ارشد جاوید کو اوکاڑہ ملٹری فارمز کی تحریک کو کور کرنے پر گرفتار کر لیا گیا۔ رینجرز نے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا۔

۳۰ راگست ۲۰۰۴ء کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے مطالبہ کیا کہ فرسودہ سیاہ قوانین سیکریٹ ایکٹ اور ہتک عزت کے قوانین منسوخ کئے جائیں۔[۱۲۹]

۲۰۰۶ء میں چار صحافیوں کو فرائض کی ادائیگی کے دوران قتل کیا گیا۔ وزیرستان میں روزنامہ 'اوصاف' کے رپورٹر حیات اللہ کو 5 دسمبر 2005ء کو نامعلوم افراد نے اغواء کیا گیا۔ ۱۵ جون ۲۰۰۶ء کو ان کی لاش برآمد ہوئی۔ اخباری تنظیموں، انسانی حقوق کے اداروں اور سیاسی جماعتوں کے مطالبے پر وزیراعظم شوکت عزیز نے پشاور ہائی کورٹ کے جج پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا مگر یہ رپورٹ شائع نہیں ہوئی۔ اس ہی سال ڈیرہ اسماعیل خان میں اون لائن نیوز ایجنسی کے نمائندے ۳۲ سالہ مقبول حسین سیال کو نامعلوم افراد نے اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جب وہ پیپلز پارٹی کے ایک رہنما کا انٹرویو لے کر موٹر سائیکل پر واپس آ رہے تھے۔[۱۳۰]

کاوش ٹیلی وبن کے کیمرہ مین منیر احمد سانگی انڑ اور ابڑو فیصلے کے درمیان فائرنگ کی منظر کشی کرتے ہوئے قتل کر دیئے گئے۔ اسلام آباد میں خبر رساں ایجنسی پاکستان پریس انٹرنیشنل (PPI) کے بیورو چیف ملک محمد اسماعیل خان کو اسلام آباد کی مرکزی مارکیٹ میں نامعلوم افراد نے قتل کر دیا۔ بلوچستان کے صحافی منیر مینگل کو خفیہ ایجنسی نے اغواء کیا۔ منیر مینگل نے بلوچی زبان کا ٹیلی وژن چینل قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ایک سال بعد بازیاب ہوئے۔ جیکب آباد میں جیو ٹی وی کے نمائندے مکیش روپیٹا اور فری لانس کیمرہ مین سنجے کمار کو ملٹری انٹیلی جنس کے اہلکاروں نے اغواء کیا اور انہیں 3 ماہ بعد رہا کیا گیا۔ ان رپورٹروں نے جیکب آباد کے پاک فضائیہ کے اڈے کی فلم بنائی تھی۔ یہ اڈا امریکی فوج کی تحویل میں تھا۔[۱۳۱]

وزیرستان میں بی بی سی کے نمائندے دلاور وزیر جو اسلام آباد میں ان کے بھائی ذوالفقار علی سے ملنے گئے تھے لاپتہ ہو گئے۔ پھر کچھ دنوں بعد اسلام آباد میں ذوالفقار علی سے سادہ

کپڑوں میں ملبوس افراد نے رابطہ کیا اور بتایا کہ دلاور پاکستان میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں زخمی حالت میں داخل ہیں وہ اس کے ساتھ چلیں مگر ذوالفقار علی نے ان افراد کے ساتھ جانے سے انکار کیا۔ اگست میں دلاور کے ۱۶ سالہ چھوٹے بھائی تیمور خان کو وزیرستان میں نامعلوم افراد نے گولی مار کر ہلاک کیا۔[۱۳۲]

ستمبر ۲۰۰۶ء میں روزنامہ 'بزنس ریکارڈر' کراچی کے صحافی سعید سربازی کو نامعلوم افراد نے اغواء کیا۔ انہیں ۳ دن بعد رہا کیا گیا۔[۱۳۳]

۲۰۰۷ء پاکستان میں سیاسی تنازعات کا سال تھا۔ ملک کے فوجی سربراہ جنرل مشرف نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار چوہدری کو ان کے عہدے سے معذول کر دیا۔ وکلاء نے اس فیصلے کے خلاف تحریک شروع کی۔ الیکٹرونک میڈیا نے اس تحریک میں بھرپور کوریج دی۔ جنرل مشرف نے جون ۲۰۰۷ء میں الیکٹرونک میڈیا کو کنٹرول کرنے کے لیے پیمرا ترمیمی آرڈیننس (Pemra Amendment Ordinance 2007) نافذ کیا۔ اس قانون کے تحت حکومت کو کسی چینل کی نشریات پر پابندی لگانے اور اس کے آلات ضبط کرنے کا اختیار حاصل ہوا۔ حکومت نے ۳ نومبر ۲۰۰۷ء کے اخبارات اور الیکٹرونک میڈیا پر پابندیاں عائد کرنے کے لیے ان قوانین میں ترمیم کی۔ اس کے ساتھ ہی چیف آف اسٹاف نے ملک کا آئین معطل کر کے ایمرجنسی نافذ کر دی اور عبوری آئینی حکم نافذ کیا۔ اس کے ساتھ ہی ملک میں کام کرنے والے نیوز چینلز کی نشریات پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس حکم کا اطلاق جیو ٹی وی، ڈان نیوز، اے آر وائی، آج اور دوسرے چینلز پر ہوا۔ پورے ملک میں صحافیوں نے ذرائع ابلاغ پر پابندیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ کراچی میں ۲۰۰ کے قریب صحافیوں نے جن میں خواتین بھی شامل تھیں احتجاجی جلوس نکالنے پر گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت نے جیو ٹی وی کے علاوہ باقی چینلز کو حکومت کی شرائط منظور کرنے پر نشریات شروع کرنے کی اجازت دے دی۔ حکومت نے اس کے ساتھ ہی مختلف چینلز کے ٹاک شوز پر بھی پابندی لگا دی۔ وکلاء کی تحریک کے دوران پنجاب پولیس کے اہلکاروں کے اسلام آباد میں جیو ٹی وی پر حملہ کیا اور صحافیوں کو زدوکوب کرنے کے علاوہ دفتر کا فرنیچر اور آلات کو تباہ کیا۔ ۱۲ مئی ۲۰۰۷ء کو چیف جسٹس کی کراچی آمد کے موقع پر متحدہ قومی موومنٹ نے چیف جسٹس کی مخالفت میں ریلی منعقد کی اور مسلح افراد کی فائرنگ سے پیپلز پارٹی اور عوامی نیشنل پارٹی کے متعدد

کارکن ہلاک کیے۔اس دن آج ٹی وی کے ہیڈکوارٹر پر مسلح افراد نے فائرنگ کی اور دفتر کے باہر کئی گاڑیوں کو نذر آتش کر دیا۔[۱۳۴]

ایمرجنسی کے دوران ایف ایم ۹۹ اور ایف ایم ۱۰۳ ریڈیو اسٹیشنوں پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔اپریل 2007ء میں ملک کے انگریزی کے سب سے بڑے اخبار روزنامہ 'ڈان' کے چیف ایگزیکٹو نے ایک تحریری بیان میں الزام لگایا کہ وفاقی حکومت اور حکومت سندھ نے اخبارات کے اشتہارات پر پابندی عائد کر دی ہے۔اس سال 2007ء میں ملک کے مختلف علاقوں میں 7 صحافیوں کو قتل کیا گیا ان میں سکھر کے اخبار نجات کے کے مقبول رفیق، شاہ پور جہاں کے صحافی منیر آرائیں، پیر جو گوٹھ میں تعینات روزنامہ 'خبروں' کے نامہ نگار نثار احمد سولنگی، اسلام آباد میں تعینات روزنامہ 'مرکز' کے فوٹو گرافر جاوید خان، حیدر آباد کے اخبار ہل چل کے صحافی رب نواز چانڈیو، کراچی میں اے آر وائی ٹی وی چینل کے کیمرہ مین محمد عارف، میر پور خاص میں تعینات روزنامہ 'جنگ' کے نمائندے احمد مجاہد شامل ہیں۔اس سال لاہور میں روزنامہ 'پوسٹ' کے فوٹو گرافر وقاص شفیع کو ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے حکام نے اس وقت ہراساں کیا جب وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دے رہے تھے۔اسی طرح راولپنڈی میں ڈان نیوز ٹی وی چینل کے نمائندے بابر حسین کو سادہ کپڑوں میں ملبوس افراد نے گرفتار کیا اور نامعلوم مقام پر لے جا کر تفتیش کی گئی۔خضدار میں تعینات روزنامہ 'انتخاب' کے نمائندے ریاض مینگل کو نامعلوم افراد نے اغواء کیا۔[۱۳۵]

References حوالہ جات

۱۔ ضمیر نیازی، صحافت پابند سلاسل، ترجمہ: اجمل کمال (کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء)

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ منو بھائی، سینئر صحافی، ذاتی انٹرویو لاہور، ۲۰۰۷ء

۶۔ ضمیر نیازی کے بحوالۂ سابقہ۔

۷۔ روزنامہ 'ڈان' کراچی، ۱۷ر جنوری ۱۹۶۰ء

۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۲ر جولائی ۱۹۶۰ء

۹۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۱ نومبر ۱۹۶۰ء

۱۰۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۵ر جون ۱۹۶۱ء

۱۱۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۱ر اگست ۱۹۶۳ء

۱۲۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۱ر اگست ۱۹۶۳ء

۱۳۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۳ ستمبر ۱۹۶۳ء

۱۴۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۶ ستمبر ۱۹۶۳ء

۱۵۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۶ ستمبر ۱۹۶۳ء

۱۶۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۷ ستمبر ۱۹۶۳ء

۱۷۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۹ ستمبر ۱۹۶۳ء

۱۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۱ ستمبر ۱۹۶۳ء

۱۹۔ صفدر قریشی، سابق صدر پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس، ذاتی انٹرویو، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

۲۰۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۸ نومبر ۱۹۶۳ء

۲۱۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۷/اپریل ۱۹۶۴ء

۲۲۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۷/اپریل ۱۹۶۴ء

۲۳۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۴/اپریل ۱۹۶۴ء

۲۴۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۶ جولائی ۱۹۶۴ء

۲۵۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۳/اگست ۱۹۶۴ء

۲۶۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، یکم جنوری ۱۹۶۵ء

۲۷۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۸ جنوری ۱۹۶۵ء

۲۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۶/اپریل ۱۹۶۵ء

۲۹۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۸/دسمبر ۱۹۶۵ء

۳۰۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۳ جولائی ۱۹۶۶ء

۳۱۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۰ جولائی ۱۹۶۶ء

۳۲۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۶/اگست ۱۹۶۶ء

۳۳۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۱/جولائی ۱۹۶۶ء

۳۴۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۸ مارچ ۱۹۶۷ء

۳۵۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۴/اپریل ۱۹۶۷ء

۳۶۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۲/اپریل ۱۹۶۸ء

۳۷۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۰/اگست ۱۹۶۸ء

۳۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۸ دسمبر ۱۹۶۸ء

۳۹۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء

۴۰۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۴ جنوری ۱۹۶۹ء

۴۱۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۴ جنوری ۱۹۶۹ء

۴۲۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۷ جنوری ۱۹۶۹ء

۴۳۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۸ جنوری ۱۹۶۹ء

۴۴۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۵ فروری ۱۹۶۹ء

۴۵۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۷ر جون ۱۹۶۶ء

۴۶۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۱ر فروری ۱۹۶۸ء

۴۷۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۳ر فروری ۱۹۶۹ء

۴۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۸ مارچ ۱۹۶۹ء

۴۹۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۰ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

۵۰۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء

۵۱۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۳۰ دسمبر ۱۹۷۰ء

۵۲۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۰ فروری ۱۹۷۰ء

۵۳۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۳ فروری ۱۹۷۰ء

۵۴۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۳۰ مارچ ۱۹۷۱ء

۵۵۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء

۵۶۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۴ مارچ ۱۹۷۱ء

۵۷۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء

۵۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۳۰ مارچ ۱۹۷۱ء

۵۹۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۱ر مئی ۱۹۷۱ء

۶۰۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۴ر مئی ۱۹۷۱ء

۶۱۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۲ مئی ۱۹۷۱ء

۶۲۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء

۶۳۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۵ جولائی ۱۹۷۷ء

۶۴۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۰ر جولائی ۱۹۷۱ء

۶۵۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۲ جولائی ۱۹۷۷ء

۶۶۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۴ جولائی ۱۹۷۷ء

۶۷۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۶ر اگست ۱۹۷۷ء

۶۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۳ ستمبر ۱۹۷۷ء

۶۹۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۲/اکتوبر ۱۹۷۷ء

۷۰۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲نومبر ۱۹۷۷ء

۷۱۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۸/نومبر ۱۹۷۷ء

۷۲۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۴دسمبر ۱۹۷۷ء

۷۳۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۰/جولائی ۱۹۷۸ء

۷۴۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۱جنوری ۱۹۷۸ء

۷۵۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۲جنوری ۱۹۷۸ء

۷۶۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۹فروری ۱۹۷۸ء

۷۷۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۳/مارچ ۱۹۷۸ء

۷۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۲مارچ ۱۹۷۸ء

۷۹۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۲مارچ ۱۹۷۸ء

۸۰۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۱مارچ ۱۹۷۸ء

۸۱۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۸/اپریل ۱۹۷۸ء

۸۲۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۸مارچ ۱۹۷۸ء

۸۳۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۱/اپریل ۱۹۷۸ء

۸۴۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۴/اپریل ۱۹۷۸ء

۸۵۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۱/اپریل ۱۹۷۸ء

۸۶۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۹/اپریل ۱۹۷۸ء

۸۷۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۳/مئی ۱۹۷۸ء

۸۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۵/مئی ۱۹۷۸ء

۸۹۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۳۰مئی ۱۹۷۸ء

۹۰۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۵جولائی ۱۹۷۸ء

۹۱۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۵/جون ۱۹۷۸ء

۹۲۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۵/ستمبر ۱۹۷۸ء

۹۳۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۳۰ جون ۱۹۷۸ء

۹۴۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۸ر جولائی ۱۹۷۸ء

۹۵۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۷ر اکتوبر ۱۹۷۸ء

۹۶۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۰ر اپریل ۱۹۷۹ء، ۱۵ر اکتوبر ۱۹۷۹ء

۹۷۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۳ ستمبر ۱۹۷۹ء

۹۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۷ر اکتوبر ۱۹۷۹ء

۹۹۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۰ مارچ ۱۹۸۲ء

۱۰۰۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۱ر اگست ۱۹۸۲ء

۱۰۱۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۱ر اگست ۱۹۸۲ء

۱۰۲۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۳ر اگست ۱۹۸۲ء

۱۰۳۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۲ر ستمبر ۱۹۸۳ء

۱۰۴۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۵ر اکتوبر ۱۹۸۳ء

۱۰۵۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۶ر نومبر ۱۹۸۴ء

۱۰۶۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۱ر نومبر ۱۹۸۰ء

۱۰۷۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۹ر اپریل ۱۹۸۴ء

۱۰۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۲ر فروری ۱۹۸۵ء

۱۰۹۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۸ مارچ ۱۹۸۵ء

۱۱۰۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۲ر اپریل ۱۹۸۵ء

۱۱۱۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۹ مئی ۲۰۰۰ء

۱۱۲۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۷ ستمبر ۲۰۰۰ء

۱۱۳۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، یکم فروری ۲۰۰۱ء

۱۱۴۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۸ مارچ ۲۰۰۱ء

۱۱۵۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۷ر نومبر ۲۰۰۱ء

۱۱۶۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۴ر اپریل ۲۰۰۱ء

۱۱۷۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۶/اپریل ۲۰۰۲ء
۱۱۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۳۰ مئی ۲۰۰۲ء
۱۱۹۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۲/اکتوبر ۲۰۰۲ء
۱۲۰۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۶ نومبر ۲۰۰۲ء
۱۲۱۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۵ دسمبر ۲۰۰۲ء
۱۲۲۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۸/مارچ ۲۰۰۳ء
۱۲۳۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۸/اگست ۲۰۰۳ء
۱۲۴۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، یکم ستمبر ۲۰۰۳ء
۱۲۵۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۷/ستمبر ۲۰۰۳ء
۱۲۶۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۱۹/جنوری ۲۰۰۴ء
۱۲۷۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۲۹ جون ۲۰۰۴ء
۱۲۸۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، یکم مارچ ۲۰۰۴ء
۱۲۹۔ روزنامہ 'ڈان'، کراچی، ۳۰/اگست ۲۰۰۴ء
۱۳۰۔ انسانی حقوق کمیشن (HRCP) رپورٹ، ۲۰۰۵ء
۱۳۱۔ انسانی حقوق کمیشن (HRCP) رپورٹ، ۲۰۰۵ء
۱۳۲۔ انسانی حقوق کمیشن (HRCP) رپورٹ، ۲۰۰۶ء
۱۳۳۔ انسانی حقوق کمیشن (HRCP) رپورٹ، ۲۰۰۶ء
۱۳۴۔ انسانی حقوق کمیشن (HRCP) رپورٹ، ۲۰۰۷ء
۱۳۵۔ انسانی حقوق کمیشن (HRCP) رپورٹ، ۲۰۰۸ء

مارشل لاء اور تعمیرات

پرویز وندل

ایک طبقاتی معاشرہ میں دولت کم آمدنی والے طبقات سے اونچی آمدنی والے طبقات کی طرف کھینچتی جاتی ہے یعنی دولت مزدور کسان اور دیگر نچلے طقبات پیدا کرتے ہیں اور اونچی آمدنی والے اسے گرفت کر لیتے ہیں۔ معاشرہ میں قانون، رواج اور دیگر رسومات کے ذریعے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور اسے کلچرل یعنی موسیقی، شاعری، ڈرامہ اور دیگر فنون کے ذریعے تقویت پہنچائی جاتی ہے۔ اس طبقاتی کھینچا تانی کے خلاف جدوجہد بھی رہتی ہے۔ یہ جمہوری قدروں کے لیے کوششیں ہوتی ہیں۔

جمہوری کاوشوں اور جدوجہد کے ذریعے کچھ قانون نچلی آمدنی والے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے بھی بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً ٹریڈ یونین کی آزادی کم سے کم آمدنی کا تحفظ مزارعین کی بے دخلی کی رکاوٹ، الیکشن میں مساوی حقوق، عورتوں کے حقوق کی حفاظت وغیرہ شامل ہیں۔

جب مارشل لاء لگایا جاتا ہے تو تمام قانون گویا بے عمل ہو جاتے ہیں اور جو مارشل لاء لگاتے ہیں وہ جو چاہتے ہیں وہی قانون بن جاتا ہے یعنی عام حالات میں اگر دولت کا بہاؤ نیچے سے اوپر جانے میں کوئی بندشیں ہوں تو وہ بھی ختم کر دی جاتی ہیں۔ طبقاتی لوٹ کھسوٹ تو پہلے بھی ہوتی ہے لیکن مارشل لاء میں اس طرح کی بندشیں ختم ہو جاتی ہیں۔

دیگر ذرائع کے علاوہ تعمیرات ایک راستہ ہے جس کے ذریعے اونچی آمدنی والوں کو بے تحاشہ فائدے پہنچائے جاتے ہیں۔ ریاستی وسائل کو استعمال کیا جاتا ہے ریاستی وسائل بنیادی طور پر ٹیکسوں کے ذریعے اکٹھے کیے جاتے ہیں جو تمام امیر و غریب لوگ دیتے ہیں اور ان وسائل کا

استعمال کچھ یوں ہوتا ہے کہ نتیجے میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو جاتا ہے۔

مارشل لاء لگاتے ہوئے لگانے والا ہمیشہ یہ کہتا ہے کہ اسے کوئی ذاتی غرض نہیں۔ وہ صرف ملک بچانے کے لیے، قوم کی ترقی کے لیے اور غریبی مٹانے کے لیے مارشل لاء لگا رہا ہے اور ساتھ ہی وہ بڑے بڑے پروجیکٹ یعنی ڈیم، سڑکیں، حکومتی دفاتر اور پل وغیرہ بنانے کا اعلان کرتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ تمام عوامل کس طرح دولت کو نیچے سے اوپر بھیجنے میں مدد دیتے ہیں۔

تمام ڈویلپمنٹ بنیادی طور پر زمین کو ڈویلپ کرتی ہے مثلاً ڈیم بنا کر نہریں کھودی جاتی ہیں تو جس جس جگہ سے نہر گزرتی ہے وہ زمین ڈویلپ ہوتی ہے اور اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح جب سڑکیں بنتی ہیں۔ پانی کی سپلائی پہنچائی جاتی ہے، بجلی پہنچائی جاتی ہے تو آس پاس کی زمین کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔

جب تک تمام نجی ملکیت رہتی ہے تو زمین کے مالکان کو بنیادی طور پر بہت بڑی دولت کی کھیپ ملتی ہے۔ زمین کے مالکان کا اس دولت کو بنانے اور پیدا کرنے میں کوئی کردار نہیں ہوتا اور اس سارے عمل میں ریاست کے وسائل استعمال ہوئے ہوتے ہیں جو امیروں اور غریبوں کے مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں۔

حکمران اور طبقات کے مابین کبھی کبھار اس موضوع پر بہت لڑائی ہوتی ہے کہ نہر، سڑک یا پل کسی کی زمین میں سے گزرے اور اس کو فائدہ ہو۔ اس سلسلے میں لاہور رِنگ روڈ کا راستہ متعین کرنے میں جو سالہا سال لگے وہ اس کشمکش کی عکاسی کرتے ہیں۔

اسی طرح ڈویلپمنٹ یعنی سرکاری دفاتر بنانا یا یادگاریں بنانا دولت کو نیچے سے اوپر منتقل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ جہاں کوئی بڑا سرکاری دفتر بنتا ہے وہاں آس پاس کی سڑکیں بن جاتی ہیں اور اس طرح اس علاقہ میں زمین کی قیمت پہلے کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم شہر اسلام آباد میں ہونے والی ڈویلپمنٹ اور اس کے زمین کی قیمت پر ہونے والے اثرات کو مدِ نظر رکھ سکتے ہیں۔

ملک میں رہائشی مسئلہ اور اس کا حل

عوام کی بہت بڑی تعداد رہائشی مسائل سے دوچار ہے۔ ہر مارشل لاء لگانے والا ان

مسائل کو حل کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ ان وعدوں کی تاریخ پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

1- ایوب کا مارشل لاء

جب ایوب نے حکومت سنبھالی تو کراچی میں مہاجرین کی رہائش کا مسئلہ کافی شدید تھا اس نے کراچی اور لاہور میں غریب عوام کی رہائش کے منصوبے شروع کیے۔ کراچی میں کورنگی اور لاہور میں کوٹ لکھپت، ٹاؤن شپ سکیم شروع ہوئیں اس کے لیے بیرونی امداد بھی حاصل کی گئی۔ ہم لاہور کے منصوبے کو ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں۔

کوٹ لکھپت 1960ء کی دہائی میں ڈیزائن ہوا اور تقریباً 1966ء میں زمین پر کام شروع ہو گیا۔ یہ منصوبہ حکومت نے نچلے درجے کے ملازمین کے لیے بنایا اور آس پاس کی انڈسٹری کے نچلے درجے کے ملازمین کے لیے اور مزدوروں کے لیے تعمیر ہوا۔ 1965ء اور 1966ء تک اس کو لاہور کے باہر ہی گنا جاتا تھا۔ اور سرکار کے درجہ چار کے ملازمین کے لیے روزانہ آنا جانا اچھا خاصا خرچہ بن سکتا تھا۔ منصوبے میں سڑکیں چوڑائی اور مضبوطی کے حوالے سے بہترین بنائی گئیں یعنی اس کا انفراسٹرکچر (Infrastructure) بہت قیمتی تھا لیکن جو گھر بنائے گئے ان کی قیمت اس وقت کے حساب سے 2500 روپے رکھی گئی اور جو اصل قیمت نکلی کم سے کم خرچے کے باوجود وہ 2700 روپے بنی۔ حکومت کا حکم ہوا کہ یہ 2500 سے نہیں بڑھ سکتی تو اس وقت کے ڈیزائنر نے گھروں کا D.P.C ختم کر دیا اور یوں گھر بننے شروع ہو گئے۔ میرے پاس ایسی تصاویر ہیں جو بتاتی ہیں کہ دیوار ابھی چھت تک پہنچنے سے پہلے ہی نمی کا شکار ہو گئی۔

اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علاقہ جس کا انفراسٹرکچر نہایت عمدہ تھا اور جو گھر بنائے گئے غریبوں کے لیے وہ نہایت ناکس تھے اور جیسے ہی حکومت نے گھر الاٹ کیے لوگوں نے گھر بیچ دیئے اس طرح سارا علاقہ اب غریبوں کی آبادی کجا اب اچھے خاصے امیروں کا علاقہ بن گیا ہے۔

ایوب کے زمانے کے دوران ہی لاہور میں تین بڑی آبادیاں پایۂ تکمیل تک پہنچیں۔

سکیم	ٹوٹل لاگت Lacs	نفع/نقصان	%age (اوسط

گلبرگ I	15.4 Lac	2.5	1 6 % نقصان
گلبرگ II	57.5 Lac	3.2	5 . 6 % نقصان
مڈل طبقہ			
	10.5	5.02	47% نفع
سمن آباد	45.6	16.6	36% نفع
ملتان روڈ	6.7	3.7	55% نفع
نچلا طبقہ			
شادباغ	31.0	5.7	18.4% نفع
قلعہ لکشمن سنگھ	20.0	7.9	40% نفع

شادباغ

یہ نچلی آمدنی والے افراد کے لیے بنائی گئی سکیم اعداد وشمار کے مطابق 31.0Lac روپے خرچ ہوئے اور 5.7Lac کی آمدنی ہوئی یعنی 18.4% منافع ہوا۔

سمن آباد

یہ سکیم درمیانی آمدنی والے افراد کے لیے بنائی گئی اور اس پر 45.6 لاکھ خرچ ہوئے اور 6.6 لاکھ کی آمدنی ہوئی۔

گلبرگ

یہ اونچی آمدنی والے افراد کے لیے بنائی گئی اس پر 57.5 لاکھ کا خرچہ ہوا اور 3.2 لاکھ کا نقصان ہوا۔

پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سکیموں کی لوکیشن کا فیصلہ کس نے کیا گویا کس نے فیصلہ کیا کہ غریب لوگوں کی آبادی ایسی جگہ بنائی جائے جہاں سیلاب کا خطرہ ہو اور آنا جانا مشکل ہو اور گلبرگ ایسی اونچی جگہ بنایا گیا جو شہر کا بہترین علاقہ ہو۔ اوپر دیئے گئے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ادارے نے شاد باغ بنانے میں منافع کمایا اور گلبرگ بنانے میں نقصان اٹھایا اور یوں غریبوں کے مسائل امیروں کی طرف منتقل کر دیئے۔

ضیاء کا دور

مختصراً ضیاء نے اپنی فوج کے لیے زمینوں کی الاٹمنٹ کے دروازے کھول دیئے۔ ہر طرف نئی سکیمیں بننے لگیں۔ جس میں مارشل لاء کے نفاذ کی وجہ سے لوگوں سے زمین سستی لی جاتی تھی اور افسروں میں بانٹ دی جاتی تھی۔ تفصیل سے اس کو Study کیا جا سکتا ہے اور یہ ایک باقاعدہ تحقیق کا مقالہ بن سکتا ہے۔

پرویز مشرف

جنرل پرویز مشرف نے تو اس عمل کو ایک آرٹ کا درجہ دے دیا۔ پہلے تو وہ زمینداروں سے اونے پونے داموں پر زمین خریدتے تھے لیکن بعد میں تو بالکل ہی مفت لینا شروع کر دیا۔ ہر ایکڑ زمین کے عوض دو کنال کی دو فائلیں دے دی جاتیں کچھ عرصہ تو فائلوں کا کاروبار چلا لیکن اب بہت سے زمیندار زمین سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور فائلیں کسی کام نہیں آ سکتیں۔

یہ ایک بہت سرسری سا جائزہ ہے جو سارے عمل کے رخ کا تجزیہ کرتا ہے لیکن حقیقت اس سے زیادہ کمپلیکس ہے اور میرے خیال میں زیادہ گھمبیر بھی۔ ڈی ایچ اے کا وسیع علاقہ اب صرف زمینداروں کی مشکلات سے بھرا ہوا ہے بلکہ وہاں کے جو مزدور تھے وہ روزگار کی تلاش میں لاہور منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کسی دن صبح سویرے لاہور کے باغات، سرکلر روڈ، داتا صاحب، ریلوے سٹیشن اور لبرٹی پارک میں دیکھیں تو جگہ جگہ بے گھر لوگ سوئے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ ہے مارشل لاء کی دین۔

مارشل لاء ذہنیت کے خلاف جدوجہد جمہوری قدروں سے کی جاتی ہے۔ ہمیں معاشی

رکاوٹ کے طریقے بھی سمجھنے ضروری ہیں۔ عام طور پر سڑک اور دیگر منصوبوں کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن ان کے پیچھے اصل محرکات کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ساری جدوجہد کو ایک وسیع جمہوری عمل سے فیلڈ میں پھیلانا چاہیے۔

مساجد کا تعمیراتی تشخص.....اور مارشل لاء

غافر شہزاد

ماہرین فن تعمیر نے انسان کے گردوپیش کے ماحولیاتی مظاہر کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک کو سماجی ماحول (Social Environment) کا نام دیا گیا ہے جبکہ دوسرے کو تعمیراتی ماحول (Built Environment) سے معنون کیا گیا ہے۔ سماجی ماحول انسانی سرگرمیوں، طرز رہن سہن، عادات واطوار، تہذیبی ضابطے وترجیحات، باہمی روابط وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ تعمیراتی ماحول میں انسان اور فطرت کی بنائی ہوئی اشیاء شامل کی گئی ہیں۔ اگر ایک طرف ندی نالے، جنگل، باغات، پہاڑ، جھرنے، فطرت کے مظاہر ہیں تو دوسری جانب انسان کی بنائی ہوئی عمارات، سڑکیں، گاڑیاں، شہر، رہائشی کالونیاں، یادگاریں وغیرہ اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ اگر ایک جانب انسان اور اس کی زندگی کے روز وشب ہیں تو دوسری جانب کائنات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے معاملات ہیں۔ جہاں ان دونوں کا باہمی ٹکراؤ ہوتا ہے کچھ نہ کچھ ضرور وقوع پذیر ہوتا ہے۔ حکومتوں اور سیاسی جماعتوں کے دساتیر میں ایک جانب تو انسان اور اس کی زندگی کے معیارات کو بہتر سے بہتر کرنے کے خواب دکھائے جاتے ہیں تو دوسری جانب انسان کے گردوپیش کے تعمیراتی ماحول کی بہتری کے منصوبے بھی پیش کئے جاتے ہیں، میرے آج کے مقالے کا موضوع تعمیراتی ماحول (Built Environment) ہے کہ خصوصاً مارشل لاء کے ادوار میں ہمارے جرنیل جب

حکومتی تخت پر مسند نشین ہوتے ہیں تو تعمیراتی ماحول میں کس قسم کی تبدیلیاں لانے میں کوشاں رہتے ہیں اور ان کو کس سطح تک کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ لوگ ان تبدیلیوں کو قبول کرتے ہیں، یا مسترد کر دیتے ہیں، اس لیے کہ دنیا بھر میں کامیابی و ناکامی کا پیمانہ بہر حال عوام کا ردّ و قبول ہی ہے۔ کم و بیش تین دہائیوں پر پھیلے ہوئے مارشل لاء کے ان تین ادوار میں بے شمار تعمیرات ہوئیں۔ شہر اور قصبے بسائے گئے ان کے سرسری جائزے کے بعد میری توجہ ان ادوار میں جدید تر مسجد کی تعمیر و تشکیل پانے والی تعمیری روایت اور جمالیات تک محدود رہے گی۔

ایوب خان کے دور اقتدار میں دوسرے پانچ سالہ منصوبے (1960-65) کے دوران میں صدر پاکستان کی خصوصی ہدایت پر گریٹر لاہور کا ماسٹر پلان تیار کیا گیا اس ٹیم میں ایک بھی باقاعدہ تعلیم یافتہ ٹاؤن پلانر یا اربن ڈیزائنر شامل نہیں تھا البتہ ٹیم کو کولمبو پلان لاہور کے ایڈوائیزر پی ڈبلیو جی پاول (P.W.G. Powell) کی خصوصی معاونت حاصل رہی۔ اس وقت برطانوی عہد کا تیار کردہ 40-1939ء کا لاہور کا سروے پلان میسر تھا جسے 1961ء میں فضائی فوٹوگرافی کی مدد سے اس وقت کی ضروریات کے مطابق از سر نو تیار کیا گیا۔ ماسٹر پلان تیار ہونے کے بعد اسے گورنر ورکنگ گروپ کہ جس کے سربراہ ایک فوجی جرنیل تھے، کے سامنے رکھا گیا، جنہوں نے علاوہ ازیں دیگر، درج ذیل سفارشات پیش کیں۔

1- کنٹونمنٹ کی توسیع کے سبب اور عسکری نقطہ نظر کو مدنظر رکھتے ہوئے لاہور کی مزید توسیع فیروز پور روڈ کی مشرقی جانب اور لاہور کنٹونمنٹ کی جنوبی جانب نہ کی جائے۔

2- ریلوے لائن اور فیروز پور روڈ کا درمیانی رقبہ جو کہ مستقبل میں صنعتوں کے فروغ کے لئے مختص کیا گیا ہے اس کو پارک میں تبدیل کر دیا جائے۔

3- جی ٹی روڈ کے ساتھ باغبانپورہ میں مختص کیا جانے والا صنعتی یونٹوں کا رقبہ کم کر کے عام ضروریات زندگی کی اشیاء سے متعلق تجارتی سرگرمیوں تک محدود کر دیا جائے۔

مذکورہ بالا تحکمانہ ہدایات میں لاہور شہر یا اس میں بسنے والے شہریوں کے مفادات کے

تحفظ کے برعکس، کنٹونمنٹ کے اندر بسنے والی احساس تفاخر کی حامل نسل کی ترجیحات پر زور دیا گیا تھا۔ ان فیصلوں نے کنٹونمنٹ اور اس کی جنوبی جانب والے زمینی رقبے کی قسمت کا تعین کر دیا۔ ایوب خان کے دور میں جدید آبادی کے قواعد وضوابط کے تحت عالمی رجحانات کی طرز پر ٹاؤن شپ اور سیٹلائٹ ٹاؤن بسائے گئے ان کی منصوبہ بندی، سہولیات کی فراہمی اور زمینی استعمال کی تخصیص مقامی طرز معاشرت سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ گرڈ آئرن پیٹرن (جالی دار نمونے) کے انداز میں قائمۃ الزاویہ سڑکیں ایک دوسرے کو کراس کرتی، چوک بناتی اور ہاؤسنگ کالونی کو بلاک میں تقسیم کرتی تھیں۔ ہر بلاک کے اندر مسجد ڈسپنسری سکول گراؤنڈ اور دکانات کے لیے جگہ مخصوص کی گئی تھی۔ مقامی لوگ ایسی پابندیوں کے عادی نہ تھے اور نہ ہی کارپوریشن سختی سے لوگوں کو ان کی خواہش کے خلاف طرز زندگی اختیار کرنے پر مجبور کر سکی لہٰذا باہم ٹکراؤ کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایوب خان لوگوں کو جدید تر طرز زندگی اور طرز معاشرت کے نام پر درآمد کئے گئے ضابطوں کے تحت ٹاؤن شپ اور سیٹلائٹ ٹاؤن میں زندگی گزارنے پر مجبور کرتا رہا اور یوں اجتماعی سطح پر ایوب خان کے خلاف اٹھنے والے احتجاج میں یہ رویہ بھی شامل ہو گیا۔ اس کے برعکس ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹیوں میں نہ صرف ان قواعد وضوابط کو مکمل طور پر ریٹائرڈ آرمی افسروں کی معاونت سے لاگو کیا گیا بلکہ مخصوص طرز زندگی اور جدید تر آبادکاری کے عالمی رجحانات کو فروغ ملا اور آنے والے وقت میں ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹیوں میں گھر بنانا اور رہنا ایک اعلیٰ معیار زندگی کے طور پر قبول کر لیا گیا۔

ایوب خان کے دور اقتدار سے قبل یہاں برطانوی ماہرین فن تعمیرات کام کر رہے تھے مگر ایوب خان نے امریکی و دیگر ممالک کے ماہرین فن تعمیرات کے لئے دروازے کھول دیئے لہٰذا چیئرنگ کراس میں قیام پاکستان سے پہلے برطانوی عہد میں اسمبلی ہال، شاہدین بلڈنگ اور فری میسن ہال کی عمارات ایستادہ تھیں تو قیام پاکستان کے بعد ایک جانب جدید فن تعمیر کی حامل عمارت واپڈا ہاؤس امریکی آرکیٹکٹ ایڈورڈ اسٹون نے ڈیزائن کی تو دوسری جانب جے اے

رچی (J.A.Ritchi) نے الفلاح بلڈنگ کا ڈیزائن تیار کیا۔ دونوں عمارتوں کا جمالیاتی تعلق نہ تو عہد مغلیہ سے بنتا تھا اور نہ ہی انگریزی عہد کی جمالیات سے یہ جڑی ہوئی تھیں۔ واپڈا ہاؤس کی عمارت اس عہد کی جدید فن تعمیر کی تحریک کا ایک نمونہ تھی تو دوسری جانب الفلاح بلڈنگ پلان میں ماڈرن تھی مگر اس کا روکار (Elevation) غربی اور جنوبی جانب سے آنے والی تیز شمسی شعاعوں کو عمارت میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کا ایک نتیجہ تھا گویا شدید موسمی اثرات کو زائل کرنے کی خواہش میں ایلیویشن کی یہ شکل ظہور پذیر ہوئی وگرنہ اس کا یہاں کی تعمیرات کی روایت یا جمالیات سے کوئی تعلق بنتا نظر نہیں آتا۔ اسی طرح اس وقت کے انٹر کانٹی نینٹل اور موجودہ پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کا ڈیزائن امریکی ماہر فن تعمیر ولیم بی ٹیبلر (W.B.Tabler) کا جدید فن تعمیر کا شاہکار ہے۔

ایوب خان کے دور میں تعمیرات کا یہ سلسلہ یونہی وقوع پذیر نہیں ہو رہا تھا بلکہ حکومتی سطح پر باقاعدہ اس کی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی، عالمی سطح پر اس وقت ماڈرن فن تعمیر کی تحریک عروج پر تھی، اس تحریک کے تمام ماسٹرز جیسے لی کاربوزیئر، ایف ایل رائیٹ وغیرہ امریکہ میں مقیم تھے اور وہ امریکہ میں فن تعمیر کی ایک نئی جہت کی داغ بیل ڈال رہے تھے اور چاہتے تھے کہ ان ملکوں میں جہاں برطانوی حکومتیں رہی ہیں، وہاں تعمیرات کی یہ نئی روایت پھلے پھولے، لہٰذا جہاں پاکستان جیسے ملکوں کو امریکی امداد و قرضے مل رہے تھے وہاں یہ ماہرین تعمیرات قرضے کی ایک لازمی شرط کے طور پر بھجوا دیئے جاتے بالکل اسی طرح جیسے آج ورلڈ بینک یا ایشین ڈویلپمنٹ بینک کسی بھی ترقی پذیر ملک کو قرضہ دیتا ہے وہاں یہ شرائط بھی عائد کر دیتا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کے اتنی تعداد اور اس مشاورتی فیس پر عالمی سطح کے مشیر و ماہرین رکھیں جائیں گے۔ کوئی بھی PC-1 اس وقت تک پاس نہیں ہوتا جب تک یہ شرط پوری نہ ہو جائے۔

یہ ماڈرن فن تعمیر قدیمی روایت سے جڑی ہوئی تعمیری جمالیات کے خلاف ایک ردعمل تھا۔ عمارتوں کی اندرونی و بیرونی سطحوں کو سیدھا اور تزئین و آرائش کے جھنجھٹ سے پاک کر دیا

گیا تھا۔ بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ عمارات کی تعمیر اور اس وقت کے متعارف ہونے والے عمارت سازی کے نئے سامان سیمنٹ اور سٹیل کے باہمی اشتراک سے اسٹرکچر کی تعمیر کے امکانات کی دریافت کی ایک کوشش۔ اس سے زیادہ کوئی اور ترجیح نہ تھی۔ ماڈرن فن تعمیر کی تحریک کے زیر اثر جب مرات خان نے مینار پاکستان کا ڈیزائن تیار کیا تو اس کے پیش نظر بھی یہاں کی تعمیراتی روایت یا قرارداد مقاصد کی بنیادی روح یا فلسفہ نہ تھا بلکہ ایک اونچے کنکریٹ و اسٹیل کے مینار کی تعمیر ہی پیش نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر کوشش کے باوجود آج تک مینار پاکستان کے اسٹرکچر کو علامتی سطح پر ہم 23 مارچ 1940ء کی قرارداد کے ساتھ نہیں جوڑ پائے۔ اس وقت کے صدر پاکستان نے اپنی سطح پر ڈیزائن میں ایک اضافہ کر کے مینار پاکستان کو منفرد کر دیا تھا اور وہ تھا مینار کی چوٹی پر گنبد اور کلس، جو کہ علامتی سطح پر بقول صدر پاکستان، مینار کو اسلام اور پاکستان سے جوڑتا ہے۔ اتنے بلند قامت مینار کی تعمیر کے لیے حکومت کے پاس پیسے نہیں تھے مگر تعمیر کا جذبہ تھا، اس جذبے کو عملی شکل دینے کے لئے حکومت نے سینما کے ٹکٹوں پر ٹیکس لگا کر قرارداد پاکستان کی اس یادگار کو پروان چڑھایا اور پایہ تکمیل تک پہنچایا مگر آج تک اس کا باضابطہ افتتاح نہیں کر سکے اور بغیر افتتاح کے ہی عوام کے لیے اسے کھول دیا گیا۔

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں جب آرمی کے جرنیل ملک میں جدید فن تعمیر کے شاہکار تعمیر کروانے کی کوشش کر رہے تھے تو مساجد کی تعمیری روایت میں تبدیلی آ جانا کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی لہٰذا جب ڈھاکہ میں مسجد بیت المکرّم کی تعمیر اور ڈیزائن کا معاملہ سامنے آیا تو اس وقت کے مشرقی پاکستان کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل امراؤ خان کہاں پیچھے رہنے والے تھے انہوں نے بیت المکرّم مسجد کا ڈیزائن ایسا تیار کروایا جو مشابہت میں ہو بہو خانہ کعبہ کے مکعب سے مشابہت رکھتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی بیرونی دیواروں کا رنگ سفید ہے جبکہ خانہ کعبہ کی بیرونی دیواروں کا رنگ سیاہ ہے۔ بیت المکرّم کے ایوان کی اونچائی 99 فٹ

رکھی گئی جس کی نسبت اللہ تعالیٰ کے 99 ناموں کے ساتھ جوڑی گئی۔ مسجد کے ایوان کی منزلوں کی تعداد 5 رکھی گئی جس کی نسبت پنج تن پاک سے تھی۔ بیت المکرّم کی بیرونی داخلی ڈیوڑھی پر گنبد اور تین کمانوں کا داخلی دروازہ تعمیر کیا گیا ہے۔ مسجد کا لازمی عنصر مینار ہمیں یہاں نظر نہیں آتا کہ جو خدا تعالیٰ کی وحدانیت کی ایک علامت ہے۔ مسجد کی تعمیر 1963ء میں مکمل ہوئی۔

کراچی میں ڈیفنس آفیسرز ہاؤسنگ سوسائٹی میں 1966ء میں جب نئی مسجد کی تعمیر کا معاملہ سامنے آیا تو مسجد کمیٹی کے اراکین جو کہ ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھے، انہوں نے بابر حمید (جو کہ ابتدائی طور پر ایک مجسمہ ساز تھا اور جس نے اٹلی سے تعلیم حاصل کر رکھی تھی اور اس وقت اسلام آباد میں جے اے رحیم کے دفتر میں کام کر رہا تھا) سے ایک جدید تر ڈیزائن کی حامل مسجد طوبیٰ کی تعمیر کی فرمائش کی۔ بابر حمید نے 212 فٹ قطر کے ایک بڑے شیل کو مسجد کے ایوان کے طور پر ڈیزائن کر کے جدت پسندی کے فن کا مظاہرہ کیا اور آرمی افسروں کے دل موہ لئے۔ کنکریٹ کے اس بڑے شیل کے اندر سب سے اگلی صف سب سے چھوٹی اور جوں جوں پیچھے چلتے آئیں صفیں لمبی ہوتی جاتی ہیں۔ ایوان کے اندر کھڑے ہوں یا باہر معلوم ہی نہ پڑتا تھا کہ قبلہ کس سمت میں ہے، اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے شیل کی قبلہ سمت میں ایک مینار کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا جو کہ پہلے ڈیزائن میں شامل نہ تھا۔ مسجد کے ایوان کا سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ 212 فٹ قطر کا یہ بغیر ستون والا ایوان تھا اور سٹیل اور کنکریٹ کا ایک شاندار تجربہ کہ بغیر ستون کے اتنا بڑا ہال تعمیر کر دیا گیا۔ ہال کیا تھا چھت ہی چھت تھی، جب چھت کا رقبہ عام عمارتوں کی نسبت بڑھ گیا تو اندر داخل ہونے والی گرمی کی حدت بھی بڑھ گئی لہٰذا ہال کے اندر درجہ حرارت کنٹرول کرنے کے لیے ائر کنڈیشنگ لازم ہوگئی۔ اسی ڈیزائن کی نقالی ہمیں شاہراہ قائداعظم پر مسجد شہداء کی شکل میں نظر آتی ہے کہ جس کی تعمیر کو رکوانے کے لیے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا مگر روایتی مسجد کے ایوان سے الگ اس مسجد کی تعمیر کو نہ رکوا سکے۔

ایوب خان کے عہد میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نئے دارالخلافہ اسلام آباد کا قیام عمل

میں لایا گیا۔ اس کی ماسٹر پلاننگ کے لیے پروفیسر ڈاکسیڈس(Doxidis) کی خدمات حاصل کی گئیں جس نے اس وقت کے مروجہ ٹاؤن پلاننگ کے اسٹائل جالی دار نمونہ (Grid Iron Pattern) کو اسلام کے صراط مستقیم کے ساتھ جوڑتے ہوئے اسلام آباد کا ڈیزائن تیار کیا مگر یہ بات بھول گیا کہ مسلم بستیوں میں سب سے اہم اور نمایاں عمارت مسجد کی ہوتی ہے، جب اس کی توجہ اس جانب دلائی گئی تو آخری سرے پر واقع مرگلہ کی پہاڑیوں کے قدموں میں جامع مسجد کے لیے 44 ایکڑ کا قطعہ اراضی مخصوص کر دیا گیا جسے 1966ء میں فیصل مسجد کا نام دے دیا گیا۔ 1968ء میں انٹرنیشنل یونین آف آرکیٹیکٹس کے تعاون سے فیصل مسجد کے ڈیزائن کے عالمی مقابلے میں ویدات ڈلوکی کے ڈیزائن کو اولین قرار دیا گیا جس کا تعلق ترکی سے تھا۔ 1957ء میں ویدات ڈلوکی نے انقرہ میں مسجد کے ڈیزائن کا جو مقابلہ جیتا تھا وہ یہی ڈیزائن تھا۔ ہوا یوں کہ جب انقرہ میں مسجد کی تعمیر بنیادوں سے نکل کر سطح زمین سے اوپر اٹھنے لگی، مقامی لوگوں کو معلوم ہوا کہ مسجد کے اس جدید ڈیزائن کا تعلق وہاں کی مساجد کی تعمیری روایت سے نہیں ہے تو احتجاج اتنا شدید ہو گیا کہ لوگوں نے اس جدید مسجد کے ڈیزائن کی بنیادیں تک اکھاڑ پھینکیں اور پھر دس سال بعد ویدات ڈلوکی نے وہی ماڈرن ڈیزائن اسلام آباد میں فیصل مسجد کے لیے بھجوا دیا جسے انتہائی تحسین کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ انقرہ میں بننے والے ڈیزائن میں چھت گنبد دار رکھی گئی تھی مگر یہاں اس کو خیمہ نما بنا دیا گیا۔ کچھ لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ بصری سطح پر چاروں میناروں سے خانہ کعبہ کے مکعب کے ساتھ ایک مشابہت جنم لیتی ہے، کچھ لوگ اس کو صحرا میں خیمہ کی نسبت قرار دیتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ مرگلہ کی چوٹیوں سے مشابہت رکھتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ فیصل مسجد کے 200x200 مربع فٹ ایوان کی بغیر ستون چھت کو کھڑا کرنے کے لیے چاروں کونوں سے مرکزی سمت میں جو شہتیر (Beam) جاتے ہیں ان کی استقامت کے لیے چاروں کونوں پر 300 فٹ اونچے چار میناروں کی تعمیر ایک اسٹرکچر کے توازن کے لیے مجبوری تھی اور یہ بلڈنگ فارم کنکریٹ واسٹیل کے اسٹرکچر کے ایک تجربے سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور ہمارے آرمی جرنیل

سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کو ایک جدید مسجد کا تحفہ دیا ہے جو ان کے امیج کو ماڈریٹ بناتی ہے۔

جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں جب حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے مزار کی تعمیر و توسیع کا معاملہ سامنے آیا تو پہلے مرحلے کے طور پر مسجد کی تعمیر کی گئی۔ اس کے ڈیزائن کے انتخاب کے لیے ماہرین تعمیرات کے درمیان ایک مقابلہ رکھا گیا۔ حتمی ڈیزائن کے فیصلے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے سربراہ خود جنرل محمد ضیاء الحق تھے۔ 26 اکتوبر 1978ء کو کمیٹی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے ماہرین فن تعمیرات سے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ مسجد حضرت داتا گنج بخش کے ڈیزائن میں بادشاہی مسجد جیسا تعمیراتی حسن، مسجد وزیر خان جیسی جمالیات و تزئین و آرائش اور شاہجہانی مسجد ٹھٹھہ جیسی شان و شوکت اور جمال ہونا چاہیے۔''

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی جنرل ضیاء الحق ماہرین فن تعمیرات کو مزید ہدایات جاری کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لوگ درگاہ حضرت علی ہجویریؒ پر جائیں، وہاں کچھ وقت گزاریں اور پھر اُسی ذہنی کیفیت اور عقیدت کے ساتھ بیٹھ کر مسجد حضرت داتا گنج بخش کا عالی شان ڈیزائن تیار کریں۔

19 فروری 1980ء کو جب جنرل ضیاء الحق نے نقوی اینڈ صدیقی کے تیار کردہ ڈیزائن کی حتمی منظوری عطا فرمائی تو ساتھ ہدایت نامہ بھی جاری کیا ''میناروں کا انداز تعمیر ترکی کی مساجد جیسا ہونا چاہیے۔ برآمدوں کی چھتیں گنبد دار ہونی چاہئیں، مسجد کے داخلی دروازوں کا ڈیزائن اسلامی فن تعمیرات کا شاہکار ہونا چاہیے۔'' اس وقت جو ڈیزائن داتا دربار مسجد کے ایوان کا تعمیر کیا گیا ہے یہ جنرل محمد ضیاء الحق کے ذوق جمالیات کا آئینہ دار ہے اس میں یقیناً انہیں بادشاہی مسجد، مسجد وزیر خان اور جامع مسجد ٹھٹھہ کے اعلیٰ ترجمالیاتی معیارات کی توسیع نظر آئی ہوگی۔ مسجد کے ساتھ میزائل نما دو بڑے 190 فٹ اونچے میناروں کی تعمیر کے اصرار میں ہمیں ایک فوجی جرنیل کے ذوق جمالیات کی صداقت نظر آتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد چھ

دہائیوں کے عرصے میں فوجی جرنیل جو منصبِ صدارت پر بھی متمکن رہے ان کے عہد میں مسجد بیت المکرّم ڈھاکہ، مسجد طوبیٰ کراچی، فیصل مسجد اسلام آباد اور داتا دربار مسجد لاہور کے جدید تر ڈیزائن کی تعمیر نے مسجد کے فنِ تعمیر کی نئی جمالیات متعارف کروائی ہے جو صدیوں پر پھیلی قدیمی روایت سے الگ تھلگ اور جدید تر ہے اس روایت کو یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل آرکیٹکٹس نے آگے بڑھانے کی کوشش کی اور نئی ہاؤسنگ کالونیوں اور صنعتی عمارتوں میں جدید تر ڈیزائن کی حامل مساجد کے نمونے بنوائے مگر عوامی سطح پر لوگوں نے ان جدید تر ڈیزائنوں کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔ اس کے متوازی عام لوگوں نے مسجد کی اس تعمیری روایت کو آگے بڑھایا اور اپنایا ہے جس کا جمالیاتی ربط مسجد نبویؐ کے گنبد اور مینار سے بنتا ہے۔ اس نقالی اور تقلید کے پیچھے مسجد نبویؐ سے مسلمانوں کی محض عقیدت ہی نہیں ہے بلکہ اس جمالیات سے جڑی ہوئی وہ روحانی تسکین بھی ہے جو دیکھنے والوں اور ان مساجد میں نماز ادا کرنے والوں کو ملتی ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں جدید مساجد نہ صرف بصری و جمالیاتی سطح پر اس کشش سے عاری ہیں بلکہ روحانی سطح پر بھی لوگوں کو تسکین نہیں ملتی گویا مسجد کی اس جدید تر تعمیری و جمالیاتی روایت کو عام لوگوں نے قدیمی روایت کی توسیع یا اس سے الگ تھلگ ہونے کے سبب قبول نہیں کیا۔ نہ تو ہمارے ملک کے ماہرین فنِ تعمیر مسجد کے لیے ایسا جدید تر قابلِ قبول ڈیزائن عوام کو دے سکے ہیں اور نہ ہی ہمارے حکمرانوں نے قدیمی روایت کی توسیع میں بننے والی مساجد کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کی۔ جب عوام کے سامنے ایسا کوئی رول ماڈل نہیں تھا تو ان کے پاس صرف ایک ہی صورت بچتی تھی سو عوام نے مسجد نبویؐ کے گنبد اور مینار کی نقالی کو ترجیح دیتے ہوئے جگہ جگہ ایسی مشابہت والی مساجد تعمیر کر دی ہیں۔ یہ عوامی رویہ ماہرین فنِ تعمیر اور حکمرانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے اور بہت سارے عوامل کی جانب توجہ دلاتا ہے۔

ghafershahzad@hotmail.com

بلدیاتی ادارے اور ہمارے فوجی حکمران

ڈاکٹر ظہور احمد چودھری

برصغیر میں بلدیاتی اداروں کو چار مختلف اداوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

i- 1882ء سے پہلے کا دور

ii- 1882ء سے 1919ء کا زمانہ جو عبوری دور کہلاتا ہے۔

iii 1919ء سے 1935ء کا دور جو اصلاحات کا دور ہے اور

iv 1935ء سے 1958ء کا دور جو غیر فعالیت کا دور ہے۔

میں اپنی بات کا آغاز اسی آخری دور سے کروں گا۔ قیامِ پاکستان کے بعد سارے برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے، امن وامان اور سیاسی و معاشی صورت حال دگرگوں ہوگئی تو بلدیاتی اداروں کی غیر فعالیت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ (2) چونکہ ملک میں حکومت کو قومی مسائل کا سامنا تھا اس لیے یہ ادارے بری طرح نظر انداز ہوئے۔ 1957 تک جس قدر ادارے بھی قائم تھے ان کی کارکردگی انتہائی خراب تھی۔ (3) پاکستان کا پہلا مارشل لاء 27 اکتوبر 1958ء کو فیلڈ مارشل ایوب خان نے نافذ کیا اور مذکورہ غیر فعال اداروں کو متحرک کرنے کے لیے 1959ء میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام رائج کیا جو عرفِ عام میں ''بی ڈی سسٹم'' کہلاتا تھا۔ اس کے تحت ڈویژنل کونسل، ڈسٹرکٹ کونسل، تحصیل یا تھانہ کونسل، میونسپل کمیٹی اور کنٹونمنٹ بورڈ تشکیل دیئے گئے جن کی سربراہی ڈپٹی کمشنر اور تحصیلدار جیسے افسران کے سپرد تھی جبکہ یونین کونسل، ٹاؤن کمیٹی اور دیہی علاقوں میں یونین کمیٹی کے سربراہوں کو منتخب کیا جاتا تھا۔ اس نظام کی سب سے بڑی خاصیت اسی ہزار اراکین کا انتخاب عمل میں لانا تھا جو آگے چل کر ملک کی مرکزی اسمبلی اور دونوں صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کو چنتے تھے اور صدرِ پاکستان کے انتخابی ادارے (الیکٹرال کالج) کا

کام سرانجام دیتے تھے۔ چنانچہ ان اراکین نے فروری 1960ء میں جنرل ایوب خان کو پانچ سال کے لیے صدر منتخب کیا اور اپریل، مئی 1962ء میں مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کو منتخب کیا گیا۔ بی ڈی اداروں کے انتخابات پہلی بار 1959ء میں اور دوسری بار اکتوبر 1964ء میں منعقد ہوئے جس کے بعد جنوری 1965ء میں صدارتی انتخابات ہوئے جن میں جنرل ایوب خان کو دوسری بار ملک کا صدر منتخب کیا گیا اور محترمہ فاطمہ جناح کو شکست سے دوچار کرایا گیا۔ پھر اسی سال مارچ میں قومی اسمبلی اور مئی میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے مارشل لاء کی چھتری تلے پروان چڑھنے والے ان اداروں میں عملے اور اراکین کی تربیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ افسر شاہی کی دخل اندازی، منتخب سربراہوں کے محدود اختیارات، فرقہ وارانہ تعصب، جاگیرداروں اور وڈیروں کا عوام پر تسلط، سیاسی رشوتوں کی گرم بازاری اس نظام کا حصہ بن چکی تھی اور سب سے بڑھ کر ان اداروں اور اراکین کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے ان کے مثبت پہلو بھی اسے زوال پذیری سے نہ بچا سکے۔

پانچ جولائی 1977ء کو ملک میں تیسرے مارشل لاء کا آغاز ہوا اور جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد بلدیاتی اداروں کے نئے نظام کے نفاذ کے لیے چاروں صوبوں، وفاقی دارالحکومت، فاٹا، شمالی علاقہ جات اور آزاد کشمیر کے لیے لوکل گورنمنٹ آرڈی ننس 1979ء الگ الگ جاری کیے جن کے تحت دیہی علاقوں میں ڈسٹرکٹ کونسل اور یونین کونسل جبکہ شہری علاقوں میں میٹروپولیٹین کارپوریشن، میونسپل کارپوریشن، میونسپل کمیٹی اور ٹاؤن کمیٹی کے ادارے قائم ہوئے۔ (5) جنرل ضیاء کے دور میں مقامی حکومتوں یعنی بلدیاتی اداروں کے انتخابات تین مرتبہ یعنی ستمبر 1979ء، ستمبر 1983ء، اور نومبر 1987ء میں کرائے گئے۔ (6) ان انتخابات میں بلدیاتی اراکین کو ایک منصوبے کے تحت مالی فوائد دے کر حکمرانوں کا ساتھی بنایا گیا اور وفادار دوستوں کا ایک گروہ تشکیل دیا گیا۔ ملکی سیاست کے آج کے بعض بڑے نام اسی مارشل لاء دور کے بلدیاتی اداروں سے انتساب رکھتے ہیں۔ (7)

12 اکتوبر 1999ء کو جنرل پرویز مشرف نے ایک فوجی انقلاب کے ذریعے وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کو معزول کر کے اقتدار سنبھالا اور مقامی حکومتوں کے قیام کے لیے 2000ء کا ایک نیا نظام متعارف کرایا جس کے تحت 2000ء اور 2001ء میں انتخابات کرائے گئے۔

جنرل مشرف کا دعویٰ تھا کہ وہ اختیارات کو نچلی سطح (Grass Root) تک منتقل کریں گے تاہم روایتی سیاسی خاندانوں اور برادریوں کو سیاست سے باہر کرنے کا مقصد پورا نہ ہو سکا اور نتائج سے معلوم ہوا کہ کسی بھی ضلعے سے کوئی عام شخص ناظم منتخب نہیں ہوا اور ہر جگہ سے سابق وزراء، سرداروں اور جاگیرداروں کے بیٹے بھانجے ہی منتخب ہوئے چنانچہ پنجاب میں ٹوبہ ٹیک سنگھ اور گجرات کے اضلاع میں چودھری، میانوالی میں روکھڑی، پاکپتن میں جوئیے، بھکر میں نوانی، رحیم یار خان میں مخدوم، راجن پور میں دریشک، بہاولپور میں چیمے، بہاول نگر میں وینس اور سرگودھا میں نون جیسے روایتی خاندانوں کے جانشین ہی سامنے آئے۔ ضلع سرگودھا کی تحصیل بھلوال کے تاریخی قصبے بھیرہ میں یہ طرفہ تماشا دیکھنے میں آیا کہ تحصیل بھلوال کی 18 میں 14 نشستوں پر پراچہ خاندان کی تمام خواتین امیدوار کامیاب ہوگئیں۔ (8)

ہماری سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ مقامی حکومتوں اور بلدیاتی اداروں کا نظام ہماری تمام فوجی حکومتوں کو اس لیے عزیز رہا کہ یہ انہیں جمہوری جواز فراہم کرنے کا وسیلہ پیدا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے ذریعے سامنے آنے والے بہت سے سیاستدان بعد میں آنے والی جمہوری حکومتوں کا حصہ تھے۔ (9) فوجی ادوار کے دوران میں بلدیاتی اداروں کے بارے میں ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ مارشل لاء کے منصوبے کا اہم حصہ ہوتے ہیں اور سیاسی جماعتوں کو حتی الامکان نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے ملک میں جنرل ایوب خان، جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف، تینوں نے بلدیاتی اداروں کی شکل میں تین مرتبہ غیر اعلانیہ سیاسی پارٹی بنائی۔ ان اداروں کے اراکین چونکہ لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں لہٰذا وہ فوجی حکومتوں کے لیے ایک سیاسی پارٹی کے رکن کے طور پر کام کرتے ہیں۔ فوجی حکمران یہ کہتے ہیں کہ وہ ان کے ذریعے نچلے طبقات سے جمہوریت شروع کرتے ہیں حالانکہ ایک مروجہ جمہوری نظام میں، جمہوریت وفاقی سطح سے نچلی سطح تک آیا کرتی ہے اور اس کی بنیاد سیاسی ہوتی ہے لیکن ہماری فوجی حکومتیں ان اداروں کو ہمیشہ غیر سیاسی بنیادوں پر استوار کرتی آئی ہیں جس سے سیاسی اور جمہوری عمل آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ (10)

اگر 1959ء سے 2002ء تک 34 سالہ دور کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ 1959ء میں جنرل ایوب خان، 1979ء میں جنرل ضیاء الحق اور 2000ء میں جنرل پرویز

مشرف کے تخلیق کردہ بلدیاتی ڈھانچوں کا بنیادی موضوع گو اختیارات کی عدم مرکزیت تھا تاہم یہ کسی نہ کسی صورت میں تینوں جرنیلوں کے لیے انتخابی ادارے، سیاسی حمایت یا پھر آئندہ سیاسی سیٹ اپ کے لیے نئی بنیاد کی فراہمی کرنا تھا۔ (11) تینوں ادوار میں بلدیاتی انتخابات ہمیشہ غیر سیاسی بنیادوں پر کرائے گئے اور یہ عام طور پر جداگانہ تھے اور یونین کونسل کا بنیادی ادارہ ہمیشہ قائم رکھا گیا۔ مجموعی طور پر تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ان تمام فوجی حکومتوں میں جاری بلدیاتی اداروں کا سیٹ اپ تقریباً ایک جیسا تھا۔ تینوں حکمرانوں نے اپنی اپنی حکومتوں کے جواز کی تلاش کے لیے عوامی شرکت کی ضرورت محسوس کی اور اپنے اپنے سیاسی نظام میں عوام کی شرکت ظاہر کرنے کے لیے اپنی شخصی اور فوجی حکومتوں کے لیے ''جواز'' کا مقصد حاصل کیا۔ (12) یہ تینوں جرنیل سیاستدانوں کے رویوں پر ناراض رہے اور انہوں نے مختلف ناموں سے پابند اور رہنما جمہوریت (Controlled and Guided Democracy) کے پرانے تصورات کو عملی جامہ پہنایا۔ جنرل ایوب خان نے ان اداروں کو انتخابی ادارہ بنا کر سیاسی آلائشوں سے آلودہ کیا تو جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف نے بھی اپنے اپنے ریفرنڈم کے ذریعے مقامی حاکموں کو جنرل ایوب کی طرح ہی استعمال کیا۔ (13) جنرل پرویز مشرف بھی شروع میں بلدیاتی اداروں کو الیکٹرل کالج بنا کر صدر بننے کے خواہش مند تھے کیونکہ فی زمانہ ان اداروں کا نیٹ ورک بہت وسیع ہے اور کسی بھی منظم سیاسی جماعت کی طرز پر کام کرتا ہے تاہم انہوں نے آئین میں 17 ویں ترمیم کے ذریعے من پسند تبدیلی کرنے کے بعد یہ قدم نہ اٹھایا۔ (14)

تینوں فوجی ادوار میں غیر جماعتی انتخابات کے ذریعے سیاسی قائدین اور جماعتوں کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ بلدیاتی ادارے، کسی بھی قوم کی اقتصادی اور سیاسی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اس سطح پر افراد میں صلاحیت، استعداد اور رجحانات پذیری فروغ پاتی ہے لیکن ہمارے فوجی حکمرانوں نے اپنے اپنے دور میں اس پہلو پر سنجیدہ فکر کی بجائے سیاسی خوش گمانی پر انحصار کیا جس سے نتائج، توقعات کے مطابق برآمد نہ ہو سکے۔ (15) یہی نہیں بلدیاتی اداروں کے اس نظام نے ہمارے ملک میں ''چودھراہٹ'' کا ایک نظام بھی پیدا کر دیا جس سے بڑی برادریوں کے اندر معروف خاندانوں کی بنیاد پر برادری ازم کی ایک نئی شناخت نے جنم لیا۔

اس چھوٹی اکائی نے بڑی برادری کی یک جہتی اور ووٹ بینک سے فائدہ اٹھایا جس کی بڑی

مثال گجرات سے چودھری ظہور الٰہی کا خاندان ہے۔صوبے کے دیگر علاقوں میں بھی بی ڈی سسٹم اور مقامی حکومتوں کے مروجہ نظام کی وجہ سے مختلف برادریوں کی اجارہ داریوں اور چودھراہٹوں نے جنم لیا ہے جس سے ہمارے سماج میں بہت سی برائیاں در آئی ہیں۔ بلدیاتی ادارے، فوجی حکمرانوں کی قائم کردہ ایسی نرسریاں ہیں جنہوں نے آگے چل کر نام نہاد سیاسی قیادت تو پیدا کی مگر وہ ان جرنیلوں کے سیاسی عزائم کے بنیادی آلہ کار بھی ثابت ہوئے۔

Refrences

1- S. Shalw d Ali Rizvi Phd, Local govt in Pakistan, Karachi, University of Karachi, 1980, p-01

2- Ibid P-28,29

3- شمع فردوس، پاکستان میں فوجی ادوار میں مقامی حکومتیں، مقالہ ایم اے سیاسیات، لاہور پنجاب یونیورسٹی، 2003ء ص52۔

4- پروفیسر احمد جمال فاروقی، پاکستان کا نظریہ حکومت اور سیاست، لاہور عبداللہ برادرز، 2006ء، ص708,707۔

5- B. Shahid Ali Rizvi Phd of Cif P-48 to 50۔

6- انٹرویو، شوکت علی سیکریٹری الیکشن اتھارٹی پنجاب مورخہ 20 نومبر 2007ء۔

7- روزنامہ نوائے وقت لاہور 28 دسمبر 1991ء۔

8- ابوالحسن، پنجاب کے بلدیاتی انتخابات 2001ء، مضمون مشمولہ ماہنامہ ''بدلتی دنیا'' کراچی شمارہ اکتوبر 2001ء ص25۔

9- سلمان عابد، پاکستان کا نیا سیاسی نظام اور مقامی حکومتوں کا کردار، لاہور، جمہوری پبلی کیشنز، 2002ء، ص21,20۔

10- انٹرویو چوہدری مسعود اختر ایڈووکیٹ ہائیکورٹ، گجرات مورخہ 22 اکتوبر 2007ء۔

11- شمع فردوس، مقالہ محولہ بالا ص184 تا188۔

12- ایضاً ص190۔

13- ایضاً ص191۔

14- انٹرویو، نفیس احمد انصاری ایڈووکیٹ ہائیکورٹ ملتان سابق اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل پنجاب، سابق ڈپٹی میئر بلدیہ ملتان، سابق ممبر مجلسِ شوریٰ وممبر صوبائی اسمبلی(PML(N، مورخہ 25 اکتوبر 2007ء۔

15- شمع فردوس مقالہ محولہ بالا ص192۔

16- انٹرویو سید بشیر شاہ، یونیورسٹی آف گجرات، مورخہ 22 اکتوبر 2007ء۔

عوامی احساس رکھنے والی عدلیہ کا ظہور

فیصل صدیقی
ترجمہ: انور شاہین

'وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی، چیئرمین سینیٹ فاروق ایچ نائیک، اسپیکر قومی اسمبلی ڈاکٹر فہمیدہ مرزا، وفاقی وزراء، سپریم کورٹ کے ججوں، فوج کے سربراہوں، چیئرمین جوائنٹ چیف آف اسٹاف، ارکان پارلیمنٹ اور سینیئر سرکاری افسران نے عشائیے میں شرکت کی۔ تاہم بحال شدہ ججوں، بشمول چیف جسٹس افتخار چوہدری کے کسی نے دعوت کے باوجود عشائیے میں شرکت نہیں کی'۔

(دی نیوز، مورخہ ۲۱۔ مارچ ۲۰۰۹ء)

'جسٹس افتخار نے سنٹرل جیل کا بارہ گھنٹے کا دورہ کیا انہوں نے کینٹین سے فراہم کے جانے والی غیر معیاری خوراک اور باروچی خانے کے انتظام کا نوٹس لیا اور حکم دیا کہ خوراک کا سامان پہنچانے والوں کے معاہدے منسوخ کیے جائیں'۔

(دی نیوز، مورخہ ۱۱۔ مئی ۲۰۰۹ء)

نو مارچ ۲۰۰۷ء کو شروع ہونے والی وکلاء تحریک اور عدلیہ کی بغاوت ایک ایسا عمل ہے جس کا ردعمل بھی انتہائی ہوا ہے۔ ایک مکتبۂ فکر نے جس کو میں 'رومانوی' کہوں گا، وکلاء کی تحریک کو سماجی انقلابی تحریک سمجھا جو اپنے اندر پاکستانی ریاست اور معاشرے کی تنظیم نو کی اہلیت رکھتی ہے۔ دوسرا مکتبۂ فکر جس کو میں 'جیالوں کی سیاست' کہوں گا وکلاء کی تحریک کو، خصوصاً اس کے اگست ۲۰۰۸ء میں شروع ہونے والے پانچویں مرحلے کو رجعت پسند تحریک سمجھتا ہے جس میں عدلیہ کو

مطلق العنانیت دلانے کی اہلیت موجود ہے اور جسے دائیں بازو کی اور جمہوریت مخالف قوتیں پاکستان میں لبرل جمہوریت کے عمل کو سبوتاژ کرنے کے لیے استعمال کریں گی۔ اس لمبی بحث میں پڑے بغیر کہ کیوں یہ 'رومانوی' اور 'جیالوں' کے سیاسی، تصورات غلط ہیں، میں صرف یہ کہوں گا کہ وکلاء کی تحریک کے عوامی مباحثے کو تحریک کے مخصوص عملی مقاصد سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے مقاصد بہت سادہ سے تھے، یعنی جمہوری عمل کا از سرِ نو آغاز، فوج کو روایتی سیاسی عمل سے باہر نکالنا، معزول ججوں کی بحالی، ۳ر نومبر ۲۰۰۷ء کے اقدامات کو واپس کرنا، اور پی سی او عدلیہ کا خاتمہ۔ اس وقت حاصل شدہ اسکور کچھ یوں ہے 'ساڑھے تین مقاصد پورے ہوگئے اور ڈیڑھ کا نقصان ہوگیا'۔ رومانوی خیال کے حامیوں کے لیے مقام افسوس ہے کہ کوئی بھی معاشرتی تنظیمِ نو کا ایجنڈا وکلاء تحریک میں نہیں تھا۔ جیالے سیاستدانوں کے اختیار کردہ نظریۂ سازش کو بھی اس سے مایوسی ہی ملی کیونکہ وکلاء تحریک کی ڈوریاں کھینچنے والا کوئی بھی ملائی یا عسکری ایجنڈا موجود نہ تھا۔

وکلاء کی تحریک نہ تو انقلابی تھی نہ ہی ملا اور فوج کی سازش، یہ بلکہ پاکستان میں آئین پسندی کو راسخ کرنے، اور عدالتی نظام کی ادارتی، عمرانی اور نفسیاتی تنظیم نو کی ایک اصلاحی تحریک تھی۔ ہاں، جہاں تک آئین پسندی اور عدالتی نظام کی اصلاح کا تعلق ہے، یہ انقلابی تھی لیکن وکلاء کی آئین پسندی سے گہری وابستگی اور 'سول سوسائٹی' کی قانون پر مرکوز توجہ سے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ آئین پسندی کی بھی معاشرتی، معاشی اور سیاسی تبدیلی لانے کی صلاحیت محدود ہوتی ہے۔ روٹی، کپڑا اور مکان سیاسی عمل سے تو مل سکتا ہے، قانونی عمل سے نہیں۔

پاکستان میں وکلاء تحریک اور عدلیہ کی بغاوت کے عدالتی نظام اور آئین پسندی پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اگر وکلاء تحریک کا عدالتی اور آئینی ایجنڈا ایک فرد پر مرکوز اور معزول ججوں کی بحالی پر منحصر ہوتا تو یہ ایجنڈا اگلے عشرے میں تمام بحال شدہ ججوں کے ریٹائر ہونے پر خود ہی آئینی موت مر جاتا۔ لیکن ساختی اعتبار سے تبدیلی لانے والا ایک بنیادی شگاف وکلاء کی تحریک اور عدلیہ کی بغاوت سے ظہور پذیر ہوا ہے، جس کے مضمرات معزول ججوں کی بحالی اور ریٹائرمنٹ سے بھی آگے بہت دور تک جائیں گے۔ آیئے اس ساختی شگاف کا جائزہ لیتے ہیں۔

پاکستان میں عدلیہ کی طاقت کا منبع آئین اور قانون ہے بالفاظ دیگر، آئین اور قانون عدالتی ادارے کو بناتے اور قائم رکھتے ہیں۔ قانون کے ان دو سرچشموں نے دو قسم کی عدالتی قوت

پیدا کی ہے۔ اول تو یہ آئین اور قوانین کی تشریح کے شعبے میں عدلیہ کی بالادستی اور اجارہ داری کی ساختی طاقت ہے۔ سادہ لفظوں میں آئینی اور قانونی تشریحات کے تمام معاملات حتمی طور پر عدلیہ کی تشریح سے ہی طے ہوتے ہیں اور عدلیہ کی آئینی و قانونی معاملات میں تشریح، تعبیر تمام متعلقہ عناصر (سول و فوجی حکمرانوں، حکومت اور شہریوں) کے لیے لازمی ہوتی ہے۔ خواہ یہ صدر، وزیر اعظم اور چیف آف آرمی اسٹاف کے اختیارات کا معاملہ ہو یا حکومت اور دیگر شہریوں کے مقابلے میں شہریوں کے حقوق کی نوعیت طے کرنے کا معاملہ ہو۔ چنانچہ اگر آئین و قانون ہی عاملہ، مقننہ اور شہریوں کے اختیارات، ذمہ داریوں اور حقوق کا تعین کرتے ہوں، اور اگر صرف عدلیہ ہی یہ طے کر سکے کہ قانون کے معنی کیا ہیں، تو پھر عدلیہ ہی وہ ادارہ ہے جو عاملہ، مقننہ اور شہریوں کے اختیارات، فرائض اور حقوق کا تعین کرتا ہے۔ یا پھر جیسا کہ بشپ بنجمن ہوڈلی نے بہت درست کہا ہے کہ 'جس کسی کو بھی کسی تحریری یا زبانی قانون کی تشریح کا مطلق اختیار حاصل ہوگا۔ وہی درحقیقت ہر اعتبار سے اصلی قانون ساز ہوگا، نہ کہ وہ شخص جس نے قانون کو سب سے پہلے لکھا یا بولا ہو'۔ دوسری قسم کی عدالتی طاقت کا تعلق مختلف حکومتی، سیاسی اور نجی عاملین کے مابین ہونے والے تنازعات کے تصفیے کے ادارتی اختیار سے ہے۔ اس دنیا میں تنازعات کے حل کا ادارتی فریم ورک عدالتی اداروں پر مبنی ہے خواہ یہ تنازعہ وزیر اعظم اور چیف آف آرمی اسٹاف کے درمیان ہو یا حکومت اور عام شہری کے درمیان۔

اس قدر انتظامی اور ادارتی اختیار رکھنے کے باوجود عدلیہ اتنی زیادہ انتظامیہ کی جانب مائل اور اس سے مغلوب کیوں رہی ہے؟ جواب بہت آسان ہے۔ پاکستان جیسے کمزور اور عبوری آئینی نظام رکھنے والے ملک میں عدلیہ کا آئینی اختیار درحقیقت ایک کاغذی اختیار ہے۔ سیاسی عاملہ کو تو پولیس اور بیوروکریسی والی مقتدرہ کا اختیار حاصل ہے۔ فوج کو اپنے سپاہیوں اور ملٹری بیوروکریسی والی مقتدرہ کا جابرانہ اختیار حاصل ہے لیکن درحقیقت عدلیہ کے پاس محض حکم نامے جاری کرنے کا اختیار ہے۔ اس کو اپنے احکامات کو نافذ کرنے کا ادارتی اختیار، یا سیاسی، فوجی اشرافیہ کو آزاد ذہن رکھنے والے ججوں کو معزول کرنے سے روکنے کا کوئی ادارتی اختیار حاصل نہیں ہے۔ المختصر، عدلیہ اپنے انتظامی اور عدالتی احکامات کی تعمیل کے لیے حتیٰ کہ اپنے تحفظ کے لیے بھی انتظامیہ پر انحصار کرتی ہے۔

کوئی عدالتی ادارہ جو کہ آئینی اعتبار سے یعنی تحریری طور پر تو خود مختار ہو لیکن درحقیقت انتظامیہ پر انحصار کرتا ہو، یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا ممکنہ (جو فیصلہ کن نہ ہو تو بھی) جواب مہیا کرنے کے لیے وکلاء کی تحریک اور عدلیہ کی بغاوت نے کوشش کی۔ اس کا جواب یہ ملا کہ عدالتی ادارہ اپنے انتظامی اور اداراتی اختیارات کو سہارا دینے کے لیے اپنی تحرّک (mobilization) قوت میں اضافہ کرے۔ ۲۰ جولائی ۲۰۰۷ء کے عدالتی فیصلے کی جس کے تحت معزز چیف جسٹس کو بحال کیا جانا تھا، فوری تعمیل کی گئی، جبکہ ۳ نومبر ۲۰۰۷ء کے حکم کی، جس کے تحت کسی بھی جج کی معزولی کو روکنا تھا، بالآخر مکمل طور پر معزز معزول ججوں کی بحالی کے ساتھ تعمیل ہوئی۔ لیکن اس کا سبب وکلاء تحریک اور عدلیہ کی بغاوت کے پس پردہ کارفرما تحرک کی قوت تھی۔ مختصر یہ کہ، نہ صرف عدلیہ کے احکامات کی تعمیل ہوئی بلکہ عوامی طاقت کے سبب خود مختار ججوں کو بحال کیا گیا۔ عوام نے عدلیہ کا ساتھ دے کر اس کا انحصار سیاسی اور فوجی اشرافیہ پر بھی کم کیا۔ عوام بالآخر اعلیٰ عدلیہ کے چیمبروں میں داخل ہو گئے تھے اور اس طرح عوامی احساس رکھنے والی عدلیہ کے ظہور کے لیے بنیاد ڈال دی گئی۔

اعلیٰ عدلیہ بدترین صورت میں انتظامیہ سے مغلوب اور بہترین صورت میں اپنے رجحان میں مقتدرہ کی طرف مائل ہوتی ہے۔ عوامی احساس رکھنے والی اس اُبھرتی ہوئی عدلیہ کے دو پہلو نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلا پہلو یہ ہے کہ عوام کی تحرک طاقت کو باقی رکھنے کے لیے عدلیہ اپنے احکامات کے عوامی جواز کے لیے کوشاں ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں اعلیٰ عدلیہ اب انتظامیہ اور عوام دونوں کی آواز کو برابر سنے گی اور دونوں کے لیے احساس رکھے گی۔ اب عوامی جواز منظر عام پر ایک نئے طاقت کے کھیل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور عوام کی رائے اس عوامی احساس رکھنے والی عدلیہ کی حقیقی طاقت کا سرچشمہ بن گئی ہے۔ دوسرا پہلو اسی حقیقی طاقت کے سرچشمے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تحریک کی قوت ہے جس نے اعلیٰ عدلیہ کی خود مختاری کو کافی اعتبار سے زیادہ گہرائی عطا کی ہے۔ نہ صرف یہ کہ عدلیہ کو گذشتہ دو سالوں میں خود مختاری حاصل ہوئی ہے بلکہ اس قوت نے عوامی جواز کی صورت میں اجارہ دارانہ انتظامیہ کی قانونی اور حقیقی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی ایک ممکنہ جواب فراہم کیا ہے۔ اس طرح قومی منظر پر ایک نیا طاقت کا بلاک ظہور پذیر ہوا ہے جس کا نام 'عوام پر منحصر اور عوامی احساس رکھنے والی عدلیہ' ہے۔

عدلیہ اور عوام کے درمیان یہ نیا استوار ہوتا ہوا رشتہ اعلیٰ عدلیہ کو بھی جمہوریت کی راہ پر

ڈال رہا ہے۔ عوامی جواز عدالتی فیصلوں کو متعین کرنے والے عوامل میں شامل ہو کر یہ طے کرے گا کہ کن معاملات کو عدالتی ترجیح ملے گی۔ اس سے عدالتی فیصلوں کو قانونی جواز بھی عطا ہوگا۔ لیکن عوامی جواز کے ان معاملات کو کون طے کرے گا کیونکہ عوام اور عدلیہ کے درمیان کوئی براہ راست تعلق موجود نہیں ہے؟ اعلیٰ عدلیہ کے اندر کوئی انتخابات تو ہوتے نہیں۔ عدلیہ کے سامنے عوام کی سفارت کاری کون کرے گا؟ عوام اور عدلیہ کے درمیان پیدا ہونے والے طاقت کے تعلقات ایک نئی طاقتور اشرافیہ کو جنم دیا ہے جو وکلاء مقدمہ بازوں (یعنی وہ لوگ جن کے مقدمات عدلیہ کے سامنے زیر سماعت ہیں)، میڈیا اور سول سوسائٹی کے متحرک شدہ افراد اور گروہوں پر مشتمل ہے یہ لوگ وہ نئے سفیر اور پیشوا ہوں گے جو کہ عوامی جواز کے نئے بیانیے کی تخلیق، پائیداری اور تخریب کے ذمہ دار ہوں گے۔ کسی بھی طاقتور اشرافیہ کی طرح، وکلاء مقدمہ بازوں، میڈیا اور متحرک افراد اور گروہوں پر مشتمل اس سفارتی کلاس کے اپنے مخصوص مفادات بھی ہوں گے جو کہ عوامی امنگوں سے ہم آہنگ بھی ہو سکتے ہیں اور برعکس بھی لیکن جب تک کہ آئین میں ترمیم نہ ہو اور اعلیٰ ججوں کا انتخاب عوام نہ کریں، تب تک ہم اس سفارتی کلاس سے ہی جڑے رہیں گے جو کہ عدالتی ترجیحات اور عدالتی عمل کو عوامی توقعات کا نادانستہ اور دانستہ طور پر صحیح یا غلط انداز میں پتا لگا کر متاثر کرتی رہے گی۔

اس نئی عدالتی طاقت کے بلاک کے ظہور پذیر ہونے کے کیا نتائج ہوں گے جس کی حقیقی طاقت عوام ہیں۔ اس کی چار ممکنہ صورتیں سامنے آئی ہیں۔ اول، اعلیٰ عدلیہ کی زیادہ خودمختاری کا مطلب انتظامیہ اور مقننہ کا زیادہ تنازعہ ہے جب تک کہ سیاسی عاملہ، مقننہ اور عدلیہ کے مابین نئے کام کرنے کے تعلقات نہ بن جائیں۔ اگر جمہوری عمل باقی اور جاری رہتا ہے تو یہ نئے تعلقات بن جائیں گے لیکن ان تنازعات کے ختم ہونے میں ایک تاریخی عرصہ درکار ہوگا کیونکہ تاریخ میں کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتے۔ ہم سب کو ان تنازعات کو برداشت کرنا اور ان میں سے زندہ بچ کر نکلنا ہوگا۔ دوئم سیاسی عاملہ، مقننہ اور عدلیہ کے مابین قلیل مدتی تنازعات سے قطع نظر، ایک طویل مدتی ساختی نوعیت کا تضاد اور تصادم حقیقی اعلیٰ عدلیہ اور حقیقی ملٹری بیوروکریسی کی حکمران اشرافیہ کے درمیان ہوگا۔ یہی وکلاء تحریک کا ایک تاریخی عطیہ ہے کہ اس نے آئین پسندی میں اضافے کا مطلب ملٹری بیوروکریسی کی حکمران اشرافیہ کا زوال بنا دیا ہے۔ لیکن یہ رجحان بھی

جمہوری عمل کے تسلسل پر بہت زیادہ منحصر ہے کیونکہ آئین پسندی کے بغیر کوئی آزاد عدلیہ نہیں ہوسکتی اور جمہوریت کے بغیر کوئی آئین پسندی نہیں ہوسکتی۔ سوئم اعلیٰ عدلیہ کو معاشرے کے ہاتھوں بنے والے 'عوامی مسائل' پر 'عوامی جواز' کے فروغ اور قیام کی خاطر مستقل بنیادوں پر توجہ دینا پڑے گی۔ اس عمل میں اعلیٰ عدلیہ کو قانون سے ہٹ کر غیر حقیقی توقعات کا بھی جواب دینا پڑے گا (مثلاً افراطِ زر میں کمی وغیرہ) اور اسے آئین میں تیکنیکی اعتبار سے مشکل نوعیت کی تصحیح بھی کرنا پڑے گی (مثلاً تین نومبر ۲۰۰۷ء کے ذمہ داروں کی جواب دہی) یوں غیر حقیقی اور قانون سے دور توقعات اور تیکنیکی اعتبار سے مشکل آئینی تصحیح کا ایک طویل سلسلہ چل نکلے گا جن کے لیے قانون کی کسی بھی کتاب میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ چہارم، عدالتی اصلاحات کا ایک سلسلہ، خصوصاً فوجداری نظام انصاف کے شعبے میں شروع ہوگا۔ لوگ، خاص کر وکیل طبقہ ان اصلاحات کے موضوعات سے اختلاف کرسکتا ہے خصوصاً اگر ان کی زد وکلاء کی مقدمات کو ملتوی کروانے کی پیشہ وارانہ کمزوری پر پڑتی ہو۔ لیکن اب عدالتی اصلاحات کا عہد آچکا ہے اور اب یہ تواتر کے ساتھ اصلاحات لاتا جائے گا۔ اعلیٰ عدلیہ کو لازماً زوال پذیر عدالتی نظام کا بچانے کے لیے کوششیں کرنا ہوں گی ورنہ ہمارے بنیاد پرست طالبان بھائی تو ہمارے عدالتی نظام کو اپنے متشددانہ انصاف کے ہاتھوں مفلوج اور مسدود کردیں گے۔

تاہم خواہ عدالتی نظام کا مستقبل کچھ بھی ہو، وکلاء تحریک اور عدلیہ کی بغاوت نے کم سے کم عدالتی نظام کو صحیح راستے پر گامزن کردیا ہے۔ اس کی علامت یہ حقیقت ہے کہ عدالتی ادارہ پاکستانی جیلوں میں سڑتے ہوئے دنیا کے مظلوم ترین انسانوں کو دی جانے والی غیر معیاری خوراک کی طرف توجہ دے رہا ہے اور انتظامیہ کی طرف سے دی گئی عشائیوں کی دعوت کو ٹھکرا رہا ہے۔

نظریئے میں ملفوف آمریت

تحریر اشفاق سلیم مرزا

صدیوں سے استبدادی قوتوں کی یہ حکمتِ عملی رہی ہے کہ استبداد اور ننگی آمریت کے جواز کے لیے وہ کسی نظریئے یا اخلاقی منشور کا سہارا لیتے ہیں تا کہ عوام کو یہ باور کرایا جا سکے کہ جو کچھ اس آمرانہ تسلط کے تحت ہو رہا ہے اس کے پیچھے کچھ اعلیٰ مقاصد کارفرما یا پنہاں ہیں۔ جو ان کے نزدیک ریاست کے استحکام اور بقاء کے امین ہوتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کئی ہزار سال پہلے حمورابی نے معلوم تاریخ میں سب سے پہلے جو تعزیر متعارف کروائی اسے مُردک دیوتا سے منسوب کر دیا گیا۔ تا کہ لوگ دیوتا کی طرف سے آئے ہوئے الہامی قوانین کو تقدیس کا درجہ دے کر ان کا احترام کریں اور ان پر عمل پیرا ہوں۔ اس کی جو لوح دریافت ہوئی وہاں مردک حمورابی کو وہ تعزیر پیش کر رہا ہے۔ یہ لوح پیرس کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

الوہی اور مذہبی تقدیس کی آڑ میں آمریت قائم کرنے کی ریت بہت پرانی ہے لیکن آمریت اور استبدادیت کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے یہ جواز صرف مذہبی تقدیس تک ہی موقوف نہیں بلکہ استبدادیت کو مستحکم کرنے کے لیے دوسرے نظریات بھی اختراع کئے جاتے ہیں۔ یورپ میں اس کی ایک باضابطہ شکل (Divine Right of King) تھی۔ عہدِ وسطیٰ کی بہت سی سلطنتوں کی توسیع عیسائیت اور اسلام کے نام پر کی گئی۔ صلیبی جنگیں (Crusades) دراصل وینس اور نیپلز کے تاجروں کی مشرقی ممالک کی منڈی پر قبضہ کرنے کا شاخسانہ تھیں اور وہی ان جنگوں کے اخراجات پورے کر رہے تھے۔ لیکن یورپ کی توثیق اور آشیر باد نے انہیں عیسائیت کی کفر کے خلاف جنگوں کا روپ دے دیا۔

صلیبی جنگیں 1096 عیسوی میں شروع ہوکر 1270 عیسوی تک جاری رہیں۔ پہلی جنگ کا محرک پوپ اربن دوئم، (Pope Urban II) تھا۔ (Webstert.232)

رومیوں اور ایرانی کے خلاف حضرت ابوبکر نے جو جنگی اقدامات کیے ان کا بیان کچھ یوں ہے کہ مرتدین کے خاتمے کے بعد وہاں اسلامی حکومت کی عمل داری قائم ہو چکی تو حضرت ابوبکر کی توجہ اس ضروری مسئلے پر مبذول ہوئی کہ اعلاء کلمہ الحق اور دین حقہ کی اشاعت کے لیے مسلمانوں کو آئندہ کیا قدم اٹھانا چاہیے اور اپنی جدوجہد کو کس شکل میں مرتکز کرنا چاہیے۔ ص .Haikal 1979.304)

لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ جب بدوی قبائل شام کے دلکش مرغزاروں اور پُر فضا باغات، تاکستانوں اور وہاں کی حسین وجمیل عورتوں کے قصے اور تذکرے مکہ و مدینہ اور حجاز میں سنتے تو ان کے دل اس طرف مائل ہو جاتے اور کشور کشائی کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ لیکن اسے رنگ اشاعت اسلام کا دیا جاتا۔ (Haikal. 283) ایسی کئی مثالیں بھی تاریخ عیسائیت اور اسلام میں موجود ہیں۔ جہاں مذہب کو مطلق العنانی اور کشور کشائی کا سہارا بنایا گیا۔ لیکن اب ہم جدید دور سے چند مثالیں دینے پر ہی اکتفا کریں گے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جرمن قوم نے جو سر اٹھانا شروع کیا تو دوسرے بڑے عوامل کے علاوہ اس کے پس منظر میں جو بڑے جرمن فلسفیوں کے نظریات بھی کارفرما تھے بعض جرمن تاریخ دانوں کے مطابق جرمن فاشزم کا ضمیر ہی انہی سے اٹھا۔ 1807ء میں زینا (Jena) میں جرمن قوم کی نپولین کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کے بعد فختے (Fichte) کے قوم کے نام خطاب نے جرمن قوم میں بیداری کی نئی روح پھونک دی۔ اس نے فرانسیسیوں ور یہودیوں کو زوال پذیر اقوام کے نام سے یاد کیا اور جرمن قوم کو مستقبل کا معمار کہا۔ اس کے نزدیک جرمن زبان پوتر اور اعلیٰ تھی اور یہ بھی کہا کہ جرمن قوم کی سرکردگی میں تاریخ میں نئے دور کا آغاز ہوگا۔ (Shirer. 1989. 143)۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اس نے جرمنی میں نیشنل سوشلزم (National Socialism) کی بنیاد رکھی۔ اس کے خیال میں نپولین نے فرانسیسی انقلاب کی حق تلفی کی۔ انسانیت کو اعلیٰ منازل کی طرف لے جانے کا سہرا صرف جرمن قوم کے سر بندھتا ہے۔ (Coplestrno 1963.74)

نیٹشے (Neitzsche) نے طاقت (Power) اور سُپر مین (Superman) کے جو نظریات دیئے، جرمن قوم ان سے سرشار ہوگئی۔ اس نے جنگ کو ہی اعلیٰ اقدار کی علامت اور ذریعہ قرار دیا۔ وہ اپنی کتاب ''اورزرتشت نے کہا (Thus Spake Zarathushtra) میں کہا ہے'' کہ تم اس سے محبت کرو کیونکہ وہ تمہیں ایک نئی جنگ کی طرف لے جاتا ہے۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ کام نہ کرو بلکہ جنگ کرو میں تمہیں امن کی بجائے فتح کی طرف بلاتا ہوں۔ یاد رکھو جنگ اور جرأت نے دنیا میں حیرات سے زیادہ اعلیٰ ترین حصول کئے ہیں (Shirer-1989.147) ہٹلر اکثر نیٹشے کے مزار کے چکر لگاتا تھا اور وہاں کی تصویریں بنواتا تھا۔

نیٹشے ایک طاقتور انسان کے سامنے لاکھوں انسانوں کو ہیچ قرار دیتا تھا۔ اس کے نزدیک ایسے طاقتور انسان کا دکھ ایک قوم کے اجتماعی دکھوں سے افضل ہے۔ (Russel - 1996.736)۔

وہ مزید کہتا تھا کہ روایتی نیکی کے برعکس صحیح نیکی سب کے لیے نہیں بلکہ یہ صرف آمرانہ اقلیت کی خصوصیت ہے۔ عظماء کے لیے لازم ہے کہ وہ عام ہجوم پر ٹوٹ پڑیں اور اس عہد کے جمہوری رویئے کی مزاحمت کریں۔ کیونکہ ہر طرف عامیانہ درجے کے لوگ خود کو آقا بنانے کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں۔

وہ آمرانہ حکمران نسل چاہتا تھا۔ جنہیں زمین کا آقا ہونا چاہیے ایک نئی وسیع آمریت جو سخت ترین ضبطِ نفس کی بنیاد پر قائم ہو جن میں فلسفی مقتدرین اور فن کار جابروں کا ارادہ ہزار سال تک اپنی مُہر ثبت کرے گا۔

ہٹلر نے فختے ہیگل (Treitscke) اور واگنر (Wagner) کے نظریات کو اپنے فسطائی ارادوں کو بروئے کار لانے کے لیے استعمال کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ عوام کے گردان نظریات کی ایسی فسوں کاری کی کہ تمام جرمن قوم کو خیرہ کر کے رکھ دیا۔ وہ کہا کرتا تھا جو نیشنل سوشلزم کو جاننا چاہتا ہے اسے واگنر کو جاننا ضروری ہے۔

جدید دور میں جو متحارب قوتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہیں وہ بھی جنگی ہتھیاروں کو استعمال کرنے سے پہلے اور عوام کو اخلاقی جواز فراہم کرنے کے لیے نظریات کا تانا بانا

بُنتی ہیں۔ مغربی نظریہ سازوں نے موجود ''عالمگیریت'' کے ذریعے دنیا کی منڈیوں پر قبضہ کرنے سے پہلے نظریات کی یلغار شروع کر دی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اس سلسلے میں دو نظریہ سازوں کے خیالات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں فوکوہاما(Francis Fukuyama) نے ''انتہائے تاریخ'' (End of History) کا نظریہ پیش کیا۔ وہ نظریہ کچھ یوں ہے کہ ''موجودہ آزاد دنیا میں آزاد خیال جمہوریت کے مقابلے میں کوئی دوسرا نظام قابلِ عمل نہیں رہا۔ اس صدی میں صرف دو مکاتیبِ ہائے فکر یعنی فسطائیت اور اشتراکیت نے سیاسی نظام کی شکل اختیار کی جس میں فسطائیت تو دوسری جنگِ عظیم میں بحران کے ملبے کے نیچے دب گئی یا پھر ہیروشیما میں جوہری دھوئیں کی نذر ہوگئی۔ اشتراکیت بھی آہستہ آہستہ آزاد خیالی کے مقابل زوال پذیر ہوتی جارہی ہے۔ فرانسس فوکویاما جب انتہائے تاریخ کی بات کرتا ہے تو اس کے مطابق بنی نوع انسان کے نظریاتی اور فکری ارتقاء کا آخری نقطہ مغربی آزاد خیال جمہوریت کی عالمگیریت ہے''۔

فرانسس فوکویاما جب انتہائے تاریخ کا نقطہ نظر پیش کر رہا تھا تو سیموئیل پی ہنٹنگٹن (Samuel. P. Huntington) اور برزنسکی (Brezeniski) ثقافتوں اور تہذیبوں کے تصادم کی بات کر رہے تھے۔ ہنٹنگٹن کا کہنا یہ ہے کہ مستقبل قریب میں بین الاقوامی تقاد تہذیبوں کے تصادم کی شکل میں سامنے آئے گا۔ وہ اس نظریئے کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ سرد جنگ کے دوران جو تضادات آزاد خیال جمہوریتوں اور مارکسی لینی نظریات تھے انہیں ہم مغربی خانہ جنگی کا نام دے سکتے ہیں۔ اب چونکہ سرد جنگ ختم ہو چکی ہے اس لیے عالمی سیاست کا اصل تضاد مغربی اور غیر مغربی ثقافتوں کے تضاد کے طور پر ابھر کر سامنے آئے گا۔ اس کے ایک طرف مغربی تہذیب اور ثقافت ہوگی جبکہ دوسری طرف مشرقی تہذیبوں اور ثقافتوں کے مختلف روپ سامنے آئیں گے۔ جو نئے تصادم کی طرف بڑھیں گے ان نظریات کی اساس پر بعد ازاں امریکہ کے جمہوری آمر نے عراق اور جنگ پر اپنی یلغار شروع کی۔

دنیا بھر میں اکثر آمروں نے آمریت کے تسلسل اور اخلاقی جواز کے لیے دو ہتھیاروں کو استعمال کیا۔ کبھی ایک اور کبھی دونوں کا رسلطنت کے کام آئے۔ یعنی تشدد اور نظریہ جو عمومی طور پر لازم و ملزوم ہیں۔ اور یہی کام 1977ء سے لے کر 1988ء تک پاکستان میں ضیاء الحق کی آمریت نے کیا۔ آمر جب کسی ریاست کو کسی نظریئے کی آڑ میں چلاتا ہے تو عوام سے توقع رکھتا

ہے کہ اختراع شدہ نظریئے کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں۔ اگر وہ اس سے انحراف کرتے ہیں تو تشدد کے ذریعے انہیں اس بات کے لیے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس پر عمل پیرا ہوں یا پھر وہ مکمل طور پر خاموشی اختیار کرلیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو ریاستی اداروں کے ذریعے انہیں خاموش کردیا جاتا ہے۔ کسی ایک سماج کی مختلف پرتوں میں نظریاتی ریاست مختلف راستوں سے داخل ہوتی ہے اور یہ کام ضیاء الحق کے دور میں مذہبی، تعلیمی، قانونی، خاندانی، ثقافتی اور سیاسی اداروں کے ذریعے عمل میں لایا گیا۔

آمر ضیاء الحق نے ایسا کرتے ہوئے اپنی Hegemony کو برقرار رکھنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے۔ اس نے دانشوروں کے اپنے گرد ایسے گروہ پیدا کیے جو اس کے ذاتی مفاد کے لیے پیدا کیے ہوئے نظریات کو مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعے عوام میں منتقل کرتے تھے۔ تشہیر کا یہ ذریعہ تشدد کی بناء پر اس قدر مؤثر طریقے سے پیش کیا جاتا کہ عوام کو ان کے جھوٹ میں سچائی دکھائی دینے لگتی۔

وہ اس قسم کے نظریے کے پرچار میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اعلانیہ طور پر اس کا اعتراف کرتا تھا۔ ضیاء نے 13 مارچ 1978ء کو مکہ سے شائع ونے والے (Muslim World League) کے سید مختار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

"As far as Pakistan is concerned there is no doubt that it is a fortress of Islam: The only individual country which came into existence because of Islam, alone example in the whole world and, from that point of view it is not the fortress, the bastion of islam not only in this particular part of the world. If God

created this country then God is going to look after this country. From that point of view whether it's me at the helm of affairs or somebody else, I am sure we will be, Inshallah able to withstand pressure from those who are against Islam."

In that interview he also said that, "And I have a firm conviction that God made us to do what we did on the day of 5th of July, it must be in the interest of the country, in the interest of Islam and this must succeed. Otherwise why should I have come into this process or what I have done... there must be something which God eventually wants me to do. May be it is up to me or if He destined me to perfom this I will do that".

Zia-ul-Haq's Interview to Foreign Media. Vol.I (March-December), Ministry of Information Pakistan. 127-128

اس سے پہلے وہ کہیان انٹرنیشنل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہہ چکا تھا کہ آئین چند صفحات کا کتابچہ ہے جس کو پھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے۔

اس طرح کے آمر اپنے اقتدار کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے سے پہلے ہونے والے تمام نظریات اور اقدامات کو یک قلم برخاست کرتے ہوئے نظر آتے ہیں سوائے ان نظریات اور اقدامات کے جو ان کے نظریات کو استحکام بخشتے ہیں اور ان کو اخلاقی جواز فراہم کرتے ہیں۔

لیکن ان نظریات کے استحکام اور اطلاق کی تیاری اس نے COAS بننے کے بعد ہی شروع کر دی تھی۔ اس نے فوج میں میں نئے موٹو (Motto) متعارف کروائے جن میں ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کو اولین حیثیت حاصل تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے فوجیوں میں نماز کو لازم قرار دے دیا۔ یونٹس میں نئی مساجد اور عبادت گاہوں کا انتظام کروایا۔

یہ اس نے صرف فوج تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ تمام معاشرے پر اس کا اطلاق کرنا شروع کر دیا۔ Jahandad- 1999.158۔ خصوصاً ترقی پسند تنظیمیں، اساتذہ، تعلیمی ادارے اور نصابی کتب بری طرح متاثر ہوئیں۔ حقائق کو اپنے حوالے سے تروڑ مروڑ کر پیش کرنا روز کا معمول بن گیا۔ ایک نصابی کتاب کو جس طرح پیش کیا گیا وہ کچھ یوں ہے:

''5 جولائی 1977ء سے پہلے جس خارجہ پالیسی کو اپنایا گیا اس میں بہت سی خامیاں تھیں۔ اقوام عالم نے پاکستان پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ وہ مستقل جھوٹ فریب اور دھوکہ دہی پر مبنی تھی۔ سوائے دو ایک کے تمام اسلامی ممالک پاکستان سے تنگ آ چکے تھے اور ناراض تھے۔ ضیاء الحق کی سربراہی میں موجودہ فوجی حکومت نے ملکی خارجہ پالیسی کو راہ راست پر ڈالا اور ایسی پالیسی وضع کی جو ملک اور قوم کے مفاد میں تھی ((Aziz. 2004.50۔ پھر کہا گیا کہ ضیاء الحق کے آنے کے بعد قوم نے سکھ کا سانس لیا۔

روبینہ سہگل کہتی ہیں کہ بنیادی تبدیلیاں ضیاء الحق کے گیارہ سالہ مارشل لاء کے دور میں لائی گئیں جہاں نصاب کو اسلامی رنگ میں رنگنے کی شعوری کوششیں کی گئیں۔ یعنی کسی بھی مضمون کو پڑھانے کے طریقہ کار کو تبدیل کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ مثبت اور طبعی علوم کو بھی اسلامی سائنس میں تبدیل کر دیا گیا۔ (Rubina. 1993. 4)

جنرل خالد محمود عارف کا کہنا ہے کہ جنرل ضیاء الحق سمجھتے تھے کہ مذہب اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایک اسلامی ریاست کو قرآن اور سنت کے مطابق چلنا چاہیے۔ (Arif. 2001.. 143)۔

جنوری 1979ء کو برطانوی صحافی (Ian Stephens) آئین سٹیفنز کو انٹرویو دیتے ہوئے ضیاء الحق نے کہا:

"The moral fibre of the society has been completely broken and this was done in the last seven and a half years. Mr Bhutto's way of flourshing in the society was eroding its moral fibre.... he did it by pitching the students against teachers, sons against fathers, tenents against landlords and factory workers against mill owner. I think it is the moral rejuvenation which is required first and that will have to be done on the basis of Islam."

ضیاء الحق نے اسلام اور نظامِ مصطفیٰ کی پناہ میں آئین عدالتی نظام ریاستی قوانین اور اسلامی تعزیرات اور سزاؤں کے ساتھ جو کھیل کھیلا وہ سب پر عیاں ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ کس طرح اس کے تعصّبات اس معاشرے کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوئے۔ خواہ وہ تعلیم کا شعبہ ہو، مذہبی فرائض کو ادا کرنے کی طرف شخصی رجحانات ہوں یا پھر انسانی تعلقات کا مسئلہ ہو ضیاء الحق کی چھاپ ہر جگہ نظر آنا شروع ہوگئی۔ اور آج کا سرطان زدہ سماج ضیاء الحق کی دین ہے۔

ضیاء الحق نے تشدد اور نظریئے کی آمیزش سے جو تبدیلیاں کیں ان کے نتائج نہ صرف اندوہناک ہیں بلکہ اقوامِ عالم میں پاکستان اکیلا ہو کر رہ گیا ہے۔

عمرانیات اور بشریات کے طالب علم یہ جانتے ہیں کہ کسی بھی روایتی سماج کے ارتقاء کا عمل بہت سست ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک سماج کو بدلتے ہوئے صدیاں لگ جاتی ہیں۔ لیکن جہاں تشدد اور نظریے کے تال میل سے سماج کو بدلنے کا عمل شروع کیا جاتا ہے وہاں زمان و مکان کی

وسعتیں سکڑنے لگتی ہیں۔ حالیہ تاریخ عالم میں ہٹلر اور مسولینی کی فسطائیت نے یہ کام جرمنی اور اٹلی میں کیا جبکہ پاکستان میں یہ کام ضیاء الحق نے نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ کیا۔

ایک اور خصوصیت جو ان (Authoritarian) حکومتوں میں یکساں ہے کہ وہ کثیر الجماعتی جمہوری سیاست کی طرف منفی رویہ ہے۔ وہ یا تو سرے سے ہی جمہوری سیاست کا خاتمہ کر دیتے ہیں یا پھر یک جماعتی سیاست کی سربراہی کرتے باقی سیاسی آوازوں کو دبا دیتے ہیں۔ یہ بات بہت سے ممالک میں ایسی حکومتوں میں مشترک رہی ہے خواہ ایسی حکومتیں اور ریاستیں اشتراکی بنیاد پرستی کی آڑ میں حکومت کرتی رہی ہیں یا پھر مذہبی بنیاد پرستی کی آڑ میں مطمع نظر ایک ہی تھا یعنی مطلق العنانیت کو فروغ دینا۔ وہ خمینی کا ایران ہو یا صدام کا عراق یا اشتراکی سٹالنیت انہیں پارٹی کے اندر یا باہر تنقید بالکل پسند نہیں تھی۔

جہاں سیکولر یا اشتراکی نظام کے تحت چلنے والی حکومتیں مذہبی رجحانات کا قلع قمع کرنے پر تلے ہوتی ہیں وہاں بنیاد پرست ترقی پسند سیکولر خیالات اور روئیوں کی بیخ کنی کر رہے ہوتے ہیں۔ ان میں یہ بہت کم سوچا جاتا ہے کہ آج کی ضرورت اور مانگ کیا ہے۔

یہاں یہ بات مدِنظر رکھنی پڑے گی کہ جبر وتشدد کے ساتھ نظریات کا ملاپ جب متعارف ہوتا ہے تو عوام کی ایک کثیر تعداد اس کی پذیرائی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان میں آبادی کے کچھ حصے تو نظریاتی سطح پر ان کا ساتھ دے رہے ہوتے ہیں باقی ماندہ آبادی استبدادی قوتوں کے ساتھ یا تو مفاہمت کر لیتی ہے یا پھر سرنگوں کر لیتی ہے۔

کوڑے مارنے والوں اور کھانے والوں کا نظارہ کرنے کے لیے ہزاروں افراد جمع ہو جاتے تھے جن میں بچے بھی شامل ہوتے تھے وہ سر قلم کرنے اور گولی مار دینے کے عمل کو بھی بے حسی کے ساتھ دیکھتے ہیں وہ ذہنی سطح پر قبولیت کی سطح سے گزر رہے ہوتے ہیں یا گزر چکے ہوتے ہیں۔

تشدد اور نظریات کا یہ دباؤ وقتی طور پر مجہولیت کو جنم دیتا ہے جو اس کی زد میں ہوتا ہے وہ کرب اور اذیت سے گزر رہا ہوتا ہے اور جو کٹ کر ایک طرف بیٹھ جاتا ہے وہ خوف کی وجہ سے چپ سادھ لیتا ہے۔

عشق کو دار پہ کھینچا تو کئی زہرہ جمال
اپنی تنہائی پے روتے تھے صنم خانوں میں

ایسا آمرانہ یا مارشل لائی دور کبھی تو اندرونی تضادات اور ابھار کی وجہ سے اپنے انجام کو پہنچتا ہے یا پھر خارجی اور داخلی عوامل کے مشترکہ دباؤ کے تحت زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ لیکن اپنی باقیات رہن سہن کے ہر ڈھنگ پر چھوڑ جاتا ہے۔ ہم آج بھی اس دور کے آسیب تلے زندگی گزار رہے ہیں۔ اس دور میں حکومت کی آشیر باد سے پیدا ہونے والی عفریتیں دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے علاقوں پر تسلط جمانے کے بعد اب مشرقی علاقوں پر بھی حملہ آور ہو رہی ہیں۔ تمام ریاستی ادارے ان کے سامنے آہستہ آہستہ ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ سارا نظام بدل رہا ہے۔

ترقی پسند دانشور یہ سوچ رہے ہیں کہ سب کچھ قاطع تاریخ تہذیب سے ان کی سوچ کے آگے ایک بہت دیو ہیکل سوالیہ نشان منہ کھولے کھڑا ہے کیا یہ جو سب منظر بدل رہا ہے غیر حقیقی ہے۔ کیا میرے اور آپ کے پاس ہتھیار ڈالنے یا ہتھیار اٹھانے کے علاوہ کوئی Option رہا ہے۔ عوامی مزاحمت ہی اس سے نجات دلا سکتی ہے۔

Bibliography کتابیات

1. Russel, B. A History of Western Philosophy, Routledge. London, 1996

2. Shirer, W.L. The Rise and Fall of Third Reich Fawcet. N.Y. 1989.

3 Fukuyaman, F. The End of History and the Last man, Penguin London 1992

4. Huntigton, S.P. The Clash of Civilization and Remaking of World order Viking. W. Delhi 1996

5. Aziz K.K. The Murder of History Yanguael

Lahore 2004.

6. Rubina Saigal Education, Critical Perspective Progress Publisher, Lahore 1995

7. Arif, K.M. Khaki Shadows 1947-97 Oxford Karachi, 2001

8. Khan J.D Pakistan Leadership Challenges, Oxford Karachi 1999

9. Ali, Shaukat Pakistan. A Religio-Political Study NIHCR, Islamabad, 1997

10. Haqqani, Hussain Pakistan Between Mosque and Military Vanguard, Lahore 2005.

11. Chengappa, B.M. Pakistan Islamisation Army and Foreign Policy APH new Delhi 2004.

12. Sawhney, R.G. Zia's Pakistan ABC N. Delhi. 1985.

13. Baxter, C Edit Zia's Pakistan vanguard Lahore 1985.

14. Burk, S.T. Baxter, C. Pakistan Under the Military Eleven years of Zia ul Haq West view oxford 1991.

15. Jalal. A. The State of Martial Rule
Vangurad Lahore. 1991.
16. Woddis, Jack. Armies and Politics, Lawrence and
Wishart, London 1977.
17. Haikal, M.H. Abu Bakr, Siddique, Akbar (Urdu)
Meri Library Lahore 1079.

بعد از نو آبادیاتی ریاست میں سلامتی کا تصور:

پاکستان کا المیہ

تحریر: ڈاکٹر مطاہر احمد

تاریخ کے شعوری مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر دور کی طاقت ور سامراجی قوت اپنے سے نسبتاً کمزور طاقت کو نہ صرف قوت کے بل بوتے پر اپنی نو آبادیات بنا لیتی ہے بلکہ ان کے وسائل پر بھی قبضہ کر لیتی ہے۔ کبھی اس استحصال کی شکل سیاست و معیشت کے نام پر ہوتا ہے، کبھی سلامتی کے نام پر اور کبھی مذہب کی بنیاد پر۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں سامراجی استعمار کے خلاف حق خود اختیاریت کی بنیاد پر جدوجہد کا آغاز ہوا جسے قومی جدوجہد کہتے ہیں۔ اس جدوجہد کا بنیادی مقصد بیرونی استعمار سے آزادی حاصل کرنا تھا۔

قومی تحریکوں کی بنیاد جدید قومی ریاست کو تشکیل دینا، قومی آزادی اور تشخص کو برقرار رکھنا اور قومی وسائل کو قومی ترقی سے مشروط کرنا تھا۔ قومی آزادی کی تحریک بنیادی طور پر سیکولر تحریک ہوتی ہے جس کا مرکز قومی آزادی کا حصول ہوتا ہے۔ مذہب بنیادی طور پر کلچر کا حصہ ہوتا ہے۔ قومی آزادی کی تحریکیں دراصل یورپ کی ان تحریکوں سے متاثر تھیں جنہوں نے پاپائیت، بادشاہت اور قرونِ وسطیٰ کے ان تمام فرسودہ اداروں کے خلاف تحریکیں چلائیں اور یورپ کو جدید قومی ریاست کے تصور سے آگاہ کیا۔

ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ میں چلنے والی قومی آزادی کی تحریکوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل وہ تحریکیں جو معاشی اور سیاسی آزادی کے حصول کے لیے چلائی گئیں جن کا واضح مقصد حقِ خود ارادیت اور قومی آزادی کا حصول تھا۔ دوئم وہ تحریکیں تھیں جو استعمار سے مصالحانہ

رویہ اختیار کرتے ہوئے آزادی کے حصول کے لیے کوشاں تھیں۔

وہ تحریکیں جو سامراج سے غیر مصالحانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھیں آزادی کے حصول کے بعد وہاں کے مسائل حل کرنے کے لیے نوآزاد ممالک کی حکومتیں یک سوئی کے ساتھ معاشی مساوات، سیاسی آزادیاں اور قومی تشخص جیسے مسائل کو حل کرنے کے لیے پالیسیاں بنانے لگیں تاکہ نوآبادیاتی باقیات کو جڑ سے اُکھاڑ پھینک سکیں۔

تاہم نوآبادیاتی طاقتوں سے مصالحانہ رویہ اختیار کرنے والی تحریکیں جب آزادی حاصل کر بیٹھیں تو یہاں مسائل کے انبار لگ گئے چنانچہ ان نوآزاد ممالک کے حکمران طبقات ان کا حل نوآبادیاتی ڈھانچے میں ڈھونڈنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان نوآزاد ممالک کے ریاستی ڈھانچے کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی اداروں کو انہی خدوخال میں ڈھالا گیا جو سامراج چھوڑ گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں آزادی حاصل کرنے کے باوجود حکمران طبقہ نے فوجی اور سول نوکر شاہی کے اداروں کی تشکیل نوآبادیاتی ڈھانچے کو سامنے رکھ کر تشکیل دی جس کے نتائج حوصلہ افزا نہیں تھے۔ تاہم قومی ریاست تو تشکیل پا گئی لیکن یہ ریاست بنیادی مسائل کو حل کرنے کے قابل نہیں تھی۔ چنانچہ اس ریاست کی یہ مجبوری تھی کہ ریاستی ڈھانچے کو مضبوط بنانے کے لیے بین الاقوامی استعمار سے تعلقات قائم رکھے جائیں۔

ان نوآزاد ریاستوں کا سب سے بڑا مسئلہ قومی تشخص (National Identity) تھا۔ قومی تشخص ایک دن کی پیداوار نہیں ہوتا، اس کی ایک تاریخ ہے، اور اس تاریخ کے پیچھے ثقافت، تمدن، تہذیبی افکار اور مشترکہ تجربات شامل ہوتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں زیادہ تر ممالک (State Nations) تھے قومی ریاست (Nation States) نہیں تھے۔ بقول اشیقاق احمد (State Nations) آبادی، ثقافت، نسل، زبان اور مذہبی افکار شامل ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر یہ عناصر مشترکہ جدوجہد کے ذریعے پیدا کرتے ہوئے استعماری قوتوں سے برسرِ پیکار رہتے ہوئے آزادی تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کے بعد جدید ریاست ہونے کے ناطے اپنے آپ کو نئی ریاست کا حصہ (Sense of Belonging) نہیں سمجھتے۔ دوسرے الفاظ میں نوزائیدہ ریاست میں اپنائیت کا فقدان رہتا ہے۔ یہ رجحان کثیر القومی ریاست (Multi Nation State) میں زیادہ شدت سے اُبھرتا ہے۔

چنانچہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی پالیسیاں تشکیل دے جس سے ''آبادی'' کو ''قوم'' میں ڈھالہ جاسکے۔ وسائل کو اسی طرح سے تقسیم کیا جائے کہ جس سے تحفظات رفع ہوں، سیاسی اداروں کی تشکیل ان خطوط پر ہو کہ جس سے آبادی کی اکثریت مطمئن ہو۔ قومی جبر یا بالادست قوم کے تصور سے صرف اسی وقت نجات حاصل ہوسکتی ہے کہ جب آبادی کی اکثریت اپنے آپ کو ریاستی امور چلانے میں اپنے آپ کو شامل پائے۔ اس عمل سے قومی تشخص اُجاگر ہوتا ہے اور قوم جذباتی سطح پر اپنے آپ کو ریاست کا حصہ سمجھتی ہے اور یوں قومی ریاست کا تصور ہر سطح پر پختہ ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ریاست کو معاشرے کی حمایت ہر سطح پر درکار ہوتی ہے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب ریاستی پالیسیاں معاشری قوتوں سے ہم آہنگ ہوں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ (State Nation) قومی ریاست (Nation State) میں ڈھل جائے جیسا کہ یورپ کے بیشتر ممالک میں ہوا ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں یہ عمل ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہاں کے حکمرانوں کی ذہنیت اور طبقاتی مفادات عوامی مفادات کے خلاف ہیں اور کیونکہ حکمران طبقہ کی باقیات اور جڑیں نوآبادیاتی طرزِ فکر میں بہت گہری ہیں اور یہ ایک بہت بڑی وجہ ہے کہ بعدازنوآبادیاتی ریاستوں میں قومی تشکیل (Nation Building) کا عمل سُست روی کا شکار رہا ہے۔

مزید برآں ان ممالک کا حکمران طبقہ انتظامی اُمور اسی طریقہ سے چلا رہا ہے جیسا کہ نوآبادیاتی حکمران چلایا کرتے تھے۔ اسی طرزِ فکر کا منفی پہلو یہ ہے کہ ریاست کا پورا ڈھانچہ مرکزیت کا شکار ہوا۔ (Quer- Centralized State Structure)۔

پاکستان بعدازنوآبادیاتی ریاست

پاکستان اس حوالے سے ایک کلاسیکی مثال پیش کرتا ہے۔ یہاں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ایک بعدازنوآبادیاتی ریاست مین بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ تاہم اس عمومی تجربہ کے حوالے سے ہم پاکستان میں قومی تشکیل (Nation Building) نہ ہونے کی خصوصیات کا بغور مطالعہ کرسکتے ہیں۔

ابتداء ہی سے پاکستانی ریاست عدم تحفظ کا شکار رہی۔ اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔
اوّل نوآبادیاتی حکمرانوں سے مسلم لیگ کی قیادت نے براہِ راست تصادم سے گریز کرتے ہوئے افہام وتفہیم کی پالیسی پر عمل کیا۔ دوئم آزادی حاصل کرنے کے بعد سول نوکر شاہی نے حد سے زیادہ اختیارات حاصل کیے جس کی وجہ سے جمہوری عمل میں رخنہ پڑا اور جمہوری طاقتیں کمزور ہوئیں۔ سوئم قومی تشخص کا معاملہ جس پر ایک جانب مذہبی عناصر جن میں سے بیشتر نے مسلم لیگ کے دو قومی نظریہ کو خلاف تنقید بنایا ہوا تھا قیام پاکستان کے بعد دو قومی نظریہ کو مذہبی نقطہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسری جانب سیکولر عناصر مسلم قومیت کی بنیاد پر ریاست کے خدوخال وضع کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد ایک جدید جمہوری ریاست کا قیام عمل میں لانا تھا جس کی بنیاد روشن خیالی پر مبنی تھی۔ مگر ریاست نے ان عناصر کی پشت پناہی کرنے کے بجائے مذہبی عناصر کی حمایت کی جس کی وجہ ریاستی عناصر کے طبقاتی مفادات اور طرزِ فکر تھی اور جس کی جڑیں نوآبادیاتی نظام سے جڑی ہوئی تھیں۔ چہارم حکمران طبقہ کا یہ خوف تھا کہ ہندوستان پاکستان کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے لہٰذا پالیسیاں تشکیل دیتے وقت اس بات کو مدِ نظر رکھا گیا کہ ہندوستان سے تعلقات پاکستان کی بقاء کے لیے خطرہ ہیں لہٰذا اس کا حل توازن طاقت قائم رکھ کر کیا جائے۔ اسی پالیسی کا منفی پہلو یہ نکلا کہ پاکستان کا بیرونی قوتوں پر انحصار بڑھ گیا نتیجتاً آج تک پاکستان کے اہم فیصلے بیرونی عناصر کے منشاء سے باہر ہوتے ہیں۔

ان نکات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان ایک دفاعی ریاست ''War fare state'' بن گیا۔ مزید یہ کہ بعد کے ادوار میں ایسی پالیسیاں بنائیں گئیں جن کے تباہ کن اثرات آج مذہبی جنونیت، فرقہ واریت یا طالبان کی شکل میں سامنے آ رہے ہیں۔ ریاست کو عوامی فلاح کے لیے کام کرنا چاہیے تھا تاکہ معاشرہ میں اندرونی گہرائی (Internal Depth) حاصل ہو اور جس کے نتیجے میں ایک طاقتور وتوانا معاشرہ وجود میں آ سکے۔ اس کے برعکس اربابِ اختیار کے ایک حصے نے اندرونی مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے بیرونی عوامل میں ان کا حل ڈھونڈا جس کی ایک مثال عسکری گہرائی یعنی (Strategic Depth) تھا جس کا مقصد افغانستان میں مداخلت کر کے وہاں پر اس گہرائی کو حاصل کیا جائے۔ مگر تاریخ نے یہ ثابت کیا کہ اس قسم کی پالیسیوں نے پاکستان کو آج اس مقام تک لا کھڑا کیا ہے۔

اس پوری بحث کے نتیجے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کا جواب پاکستان کی بنیاد میں تلاش کرنا پڑے گا۔ پاکستان کو وراثت میں برطانوی ہندوستان کا مضبوط مرکز ملا۔ دوسری بعد از نوآبادیاتی ممالک کی طرح ایک ایسی نوکر شاہی ملی جو مضبوط مرکز کی حامی تھی۔

ابتداء ہی سے پالیسی سازوں نے ہندوستان سے سلامتی کو جواز بنائے ہوئے ایسی پالیسیاں وضع کیں جن سے وسائل کا رُخ بیرونی سلامتی سے نمٹنے میں صرف ہوا خاص طور پر دفاعی امور سے متعلق۔ صوبائی خودمختاری، جمہوری عمل کو شبے کی نظر سے دیکھا جاتا رہا کیونکہ پالیسی سازوں کے نزدیک اختیارات مرکز سے صوبوں کو منتقل کرنا قومی اتحاد کو کمزور کرنے کے مترادف ہے۔ دراصل مرکز پسند قوتیں سلامتی کے مسئلے کو اندرونی سے زیادہ بیرونی عوامل کو سمجھتی ہیں۔

ان تمام عوامل کو سامنے رکھنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ سول اور فوجی نوکر شاہی کے مفاد میں یہ تھا کہ ملک کا نظم و نسق سیاسی جمہوری قوتوں کی بجائے ان کے ہاتھوں میں رہے اور یہ صرف اس وقت ممکن ہوگا جب سیاسی و جمہوری قوتیں اور جمہوری ادارے کمزور اور مرکز مضبوط رہے۔ حکمران طبقہ کے مفادات کو عالمی سرد جنگ نے خوب جلا بخشی۔ مرکزیت پر مبنی پالیسیاں سرد جنگ کے زمانے میں تسلیم کی جاتی تھیں کیونکہ اس دور میں سلامتی کا مسئلہ اندرونی عوامل کے بجائے بیرونی عوامل کو سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ حکمران طبقات کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ کسی ایک سپر طاقت سے اتحاد کرتے ہوئے سرد جنگ کے نظام میں ڈھل جائیں۔ پاکستان کے حکمران طبقات سرد جنگ کے ڈھانچے میں پاکستان کو دھکیلنے میں کامیاب رہے۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جب بین الاقوامی سطح پر تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں اور ترجیحات میں ریڈیکل تبدیلیاں آئیں تو ان کا براہِ راست اثر پاکستان پر پڑا۔ پالیسی سازوں نے اس تبدیل ہوتی ہوئی صورت حال سے ہم آہنگ ہونے کی کوششیں کیں لیکن مسائل اور چیلنجز شدت اختیار کر گئے۔ آج پاکستان بے شمار مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ اس میں سرفہرست صوبائی خودمختاری کا معاملہ ہے۔ مرکز کی جانب سے صوبائی خودمختاری نہ دینے سے چھوٹے صوبوں میں سخت سیاسی بے چینی پائی جاتی ہے جو بعض اوقات نسلی منافرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سماجی سطح پر طبقاتی ناہمواری شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ امیر اور غریب کے درمیان خلیج وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ دوسری جانب درمیانہ اور متوسط طبقہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں مذہبی فرقہ واریت اور

مذہبی منافرت نے معاشرے کو اپنی گرفت میں جکڑ رکھا ہے۔ فاٹا اور بلوچستان میں بغاوتیں موجود ہیں اور ریاست طاقت کے ذریعے ان کو کچلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ریاست کے بعض حصوں میں رِٹ کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ یہ صورت حال ایک دن کی پیداوار نہیں ہے۔ اس صورت حال کی ایک بڑی وجہ ماضی میں ریاستی اداروں نے اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ پھیلایا "Quer Stretch" کیا خصوصاً افغانستان کے حوالے سے۔

ضیاء دور میں پاکستان اگلی صف کی ریاست (Front Line State) ہونے پر فخر محسوس کرتا تھا کیونکہ سوویت یونین سے نبرد آزما ہونے کی وجہ سے مغرب میں پاکستان کو قابلِ ستائش نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن اس جنگ کے نتیجے میں پاکستانی معاشرہ شدید انتشار کا شکار ہوا۔ مذہبی فرقہ وارانہ قوتوں نے پاکستانی معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ چنانچہ سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد جب اہلِ مغرب کی ترجیحات تبدیل ہوگئیں تو ایک بار پھر پاکستان اگلی صف کی ریاست بنا مگر اب کی بار دہشت گردی کی جنگ کے حوالے سے۔ اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج پاکستان ایک نہ ختم ہونے والے مسائل سے دوچار ہے۔ پاکستان کا قومی تشخص پر جہادی قوتوں نے سوالیہ نشان ڈال دیا ہے۔ یہ وہ قوتیں ہیں جو سرد جنگ کے زمانے میں مشرق وسطیٰ، وسطی ویشیاء سے یہاں لائی گئیں تھیں اور اب ان قوتوں نے پاکستانی معاشرے کو ہر سطح پر تقسیم کرنے میں ایک بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ افغان جنگ کے نتیجے میں پاکستان ایک عسکری معاشرے (Militrastic Society) بنا دیا گیا ہے۔

اس صورت حال سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ریاست اور معاشرے کے تعلقات (State - Society Relations) میں خلیج گہری ہوتی جا رہی ہے۔ دوسری جانب حکمران آج بھی ان معاملات کو سرد جنگ کے پس منظر میں دیکھ رہے ہیں جبکہ صورت حال یکسر تبدیل ہوگئی ہے۔ 9/11 کے بعد نہ صرف یہ کہ بین الاقوامی سیاست کے خدوخال بدل گئے بلکہ ان کا براہ راست اثر پاکستان پر پڑ رہا ہے۔ ریاست کو ان تمام اقدامات کو بیرونی دباؤ کے نتیجے میں بدلنا پڑ رہا ہے جو کبھی اس کی خارجہ پالیسی کا حصہ رہے تھے۔

اس ساری بحث سے جو نکات سامنے آئے وہ یہ ہیں کہ پاکستان ایک بعد از نوآبادیاتی ریاست ہے اسے ایک سے زائد المیوں (Multiple Dilema) کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

قومی تشخص کو کیسے اُجاگر کیا جائے جبکہ جمہوری ادارے کمزور ہیں اور ریاستی ڈھانچہ انتہائی مضبوط مرکزیت کا حامی ہے۔ مزید معاملات میں صوبائی خودمختاری، سلامتی کی ریاست (Security State) مذہبی فرقہ واریت جیسے مسائل کا سامنا ہے۔

پاکستان کا مسئلہ نوآبادیاتی طرزِ فکر اور طرزِ حکمرانی میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے باوجود ریاستی ڈھانچہ مرکزیت پر قائم ہے اور بعدازنوآبادیاتی ریاست کی کلاسیکی شکل پیش کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں فوجی اور سول نوکرشاہی کی مرکزیت پر مبنی پالیسیاں و ریاست میں معاشی، سیاسی اور سماجی انتشار (Anarchy) پھیلا رہی ہیں جس کی وجہ سے ریاست (State) اور معاشرہ (Society) کے درمیان خلیج بڑھتی جارہی ہے۔

دستاویزات

موجودہ خصوصی نمبر کے اس حصے میں ہم اپنے قارئین اور مستقبل کے محققین کے لیے چند تاریخی دستاویزات پیش کر رہے ہیں۔ ان دستاویزات میں ملک میں اقتدار میں آنے والے چاروں فوجی حکمرانوں کی ابتدائی تقاریر درج کی جا رہی ہیں۔ یہ سب تقاریر مسعود الحسن کی مرتب کردہ کتاب 'پاکستان میں مارشل لاء حکومتیں' (لندن، دائرۂ کاروانِ ادب، ۲۰۰۱ء) سے نقل کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ سندھ سے تعلق رکھنے والے معروف سیاستدان اور صحافی پیر علی محمد راشدی جو ایک زمانے میں پاکستان کے مرکزی وزیر بھی رہے، کے ایوب خان کے نام لکھے گئے خطوط درج کیے جا رہے ہیں۔ ان خطوط میں انہوں نے ایوب خان کو پاکستان میں بادشاہت قائم کرنے اور بادشاہ کے منصب پر فائض ہونے کا مشورہ دیا۔ یہ خطوط لکھتے وقت پیر علی محمد راشدی فلپائن میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے مقیم تھے اور یہ خط منیلا ہی سے ارسال کیے جا رہے تھے۔

ہم نے ان خطوط کا اردو متن ہفت روزہ 'معیار' کی ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء کی بعض اشاعتوں سے حاصل کیا۔ خطوط کے اوپر دی گئی سرخی بھی ہفت روزہ 'معیار' کی قائم کردہ ہے۔

اصلی انگریزی خطوط اب The Altaf Gauhar Papers نامی کتاب میں شامل ہو کر شائع ہو چکے ہیں جن کو امان اللہ میمن نے مرتب کیا ہے اور سنگِ میل پبلشر (لاہور) نے شائع کیا ہے۔ (ایڈیٹر)

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جنرل ایوب خان کا قوم سے خطاب

ہم وطنو!

میں آج آپ سے ان معاملات پر بات کرنا چاہتا ہوں جو اہم بھی ہیں اور سنگین بھی اور یہ ضروری ہے کہ آپ ان باتوں کو غور سے سنیں اور انہیں سمجھنے کی کوشش کریں تا کہ آپ تعمیری کام کر سکیں اسی میں ہماری اور آئندہ نسلوں کی نجات مضمر ہے۔ آپ صدر کا وہ اعلان سن چکے ہوں گے جس کے ذریعے انہوں نے آئین کو منسوخ کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا ہے۔ صدر نے مجھے مارشل لاء کا چیف ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا ہے اور پاکستان کی تمام برّی، بحری اور فضائی افواج اور سول فورسز بھی میری کمان میں دی ہیں۔ یہ ایک انتہائی سخت اقدام ہے جو بڑے تردّد اور تذبذب کے بعد لیکن اس یقین کے ساتھ کیا گیا ہے کہ ملک کو پارہ پارہ ہو جانے اور مکمل تباہ ہو جانے سے بچایا جائے۔ اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اگر یہ صورتِ حال باقی رہنے دی جاتی تو آئندہ نسلیں ہمیں کبھی معاف نہ کرتیں۔ سب جانتے ہیں کہ انارکی کی یہ کیفیت خود غرض عناصر، سیاسی لیڈروں کی پیدا کردہ ہے جنہوں نے ملک کو برباد کیا اور ذاتی اغراض کے لیے اسے فروخت تک کر دینے پر تُل گئے۔ بعض لوگ تو یہ حرکتیں اپنا حق سمجھ کر کرتے رہے ہیں کہ کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ پاکستان انہوں نے بنایا ہے۔ ان کے علاوہ بعض ایسے لوگ ہیں جو خود نظریۂ پاکستان ہی کے خلاف تھے۔ ان لوگوں نے کھلم کھلا ملک کو تباہ کرنے اور اس کے مسائل کو زیادہ خطرناک بنانے کی کوششیں شروع کر دیں، ان کا مقصد صرف اپنی ذاتی اغراض کا حصول ہے اور اس دوران کمزور حکومتیں خاموشی اور بزدلی کے ساتھ ان حرکتوں کو برداشت کرتی رہیں اور انہوں نے حالات کو خراب سے خراب تر ہونے دیا۔

قائداعظم محمد علی جناح اور قائد ملت لیاقت علی خاں کی وفات کے بعد ہی سے لڑنا شروع کر دیا اور اپنی ہوسِ اقتدار کو پورا کرنے کے لیے ایک دوسرے کے خلاف مسلسل نبرد آزما رہے اور اس

بات کی بالکل پروانہ کی کہ اس سے ملک کو کیا نقصان پہنچے گا۔ ان کے پاس کوئی تعمیری پروگرام تو نہ تھا اس لیے انہوں نے صوبائی فرقہ وارانہ مذہبی تعصبات کو ابھار کر پاکستانیوں کو ایک دوسرے سے دست وگریباں کرنے کی کوشش کی، ان لوگوں کو صرف اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا چاہے ملک رہے یا تباہ ہو جائے۔ کچھ دیانت دار آدمی اس سے مستثنیٰ تھے لیکن ان کا ضمیر بھی مردہ ہو چکا تھا اور اسمبلیوں میں اپنے حامیوں کی پارٹیاں بدلتے رہنے کی روش سے وہ خود بے اثر ہو کر رہ گئے تھے۔

دو باتیں ایسی ہیں جنہیں ایک باخبر آدمی مشکل ہی سے کر سکتا ہے۔ ایک مذہب کی تبدیلی اور دوسری اپنی پارٹی سے وفاداری کی تبدیلی، لیکن اسمبلیوں میں ہمارے نام نہاد نمائندے اپنی وفاداریاں بدلتے رہے اور ان کے ضمیر نے اس پر ذرّہ برابر بھی ملامت نہ کی اور اس طرح ملک میں اسلام کے مقدس نام پر جمہوریت کو چلایا جاتا رہا اور اس طرزِ عمل کے نتیجے میں ہماری تمام مذہبی روایات اور ہمارا کلچر تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ ان چیزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک انتظامی، اقتصادی و سیاسی و اخلاقی تباہی تک پہنچ گیا جسے بہر حال زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ ملک کو اس صورتِ حال سے نجات دلانے کے لیے استحکام کی ضرورت ہے۔ ہمارے عوام محبِّ وطن اور امن پسند ہیں وہ سمجھ دار بھی ہیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہوتا رہا ہے اسے خوب سمجھتے ہیں لیکن وہ خود کو بے بس پاتے تھے اور وہ حالات کو زیادہ خراب کرنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے اور غالباً وہ فوج کے جذبات کو بھی مجروح نہ کرنا چاہتے تھے جو بالآخر ملک میں امن وامان کی ذمّے دار ہے اور جس نے ہمیشہ وفاداری اور فرض شناسی کے ساتھ ملک کی خدمت کی ہے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب تو عوام کا فوج پر سے اعتماد بھی اٹھتا جا رہا ہے کیونکہ ہم نے انہیں ظلم اور ذہنی و روحانی کوفت سے نجات دلانے کے لیے کارروائی نہیں کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عوام ان بددیانت سیاست دانوں سے بے زار ہیں جنہوں نے ملک کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فوج بھی یہی محسوس کرتی رہی ہے لیکن ہم نے بعض وجوہ سے جن کا اب میں ذکر کروں گا ضبط اور تحمل سے کام لیا ہے۔

اس موقع پر محسوس کرتا ہوں کہ مجھے فوج کے رویّے اور طرزِ عمل کے متعلق اپنے ہم وطن بھائیوں اور بہنوں کو اعتماد میں لینا چاہیے۔ قیامِ پاکستان کے وقت سے ہم فوجی ملک کے اندرونی مسائل اور بیرونی خطروں کو صاف طور پر دیکھ رہے ہیں، ہم اپنے محدود وسائل سے بھی آگاہ ہیں،

ہم نے مصمم ارادہ کیا ہے کہ ایک صحیح معنوں میں قومی فوج قائم کریں جو سیاسی ارادوں سے پاک ہو، فرض شناسی کا نمونہ ہو اور عوامی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو اور ملک کا مؤثر دفاع کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ علاوہ ازیں میں اپنے فوجیوں کو ہمیشہ یہ تلقین کرتا رہا ہوں کہ ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ایک ایسا پشتہ بن جائیں جس کے پیچھے ایک ٹھوس جمہوری نظام پروان چڑھ سکے اور مستحکم مستقبل کی بنیاد رکھی جا سکے اور سیاست سے قطعاً غیر متعلق رہے۔

شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ مرحوم مسٹر غلام محمد نے مجھے کئی بار ملک کا نظم و نسق سنبھال لینے کی پیشکش کی لیکن میں نے ہر بار انکار کیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میں جس جگہ ہوں وہاں سے پاکستان کے مفادات کی زیادہ خدمت کر سکتا ہوں اور پھر مجھے یہ دھندلی سی امید تھی کہ کوئی نہ کوئی سیاست دان اٹھے گا۔ حالات و واقعات نے اس امید کو موہوم ثابت کر دیا اور ہم اس صورت حال کو پہنچ گئے ہیں۔ ایک اچھے خاصے معقول و مستحکم ملک کو جگ ہنسائی کا سامان بنا دیا گیا ہے۔ یہ سخت افسوسناک ہے لیکن حالات کا مقابلہ کیا جانا چاہیے اور ان کا علاج ہونا چاہیے اگر اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔

میں واضح طور پر اعلان کرتا ہوں کہ ہمارا قطعی مقصد جمہوریت کی بحالی ہے لیکن ایک ایسی جمہوریت جو فعال ہو اور جسے عوام سمجھ سکیں جب وقت آئے گا تو آپ سے رائے طلب کی جائے گی لیکن ایسا وقت کب آئے گا اس کا جواب حالات دیں گے۔ دریں اثنا ہمیں اس گڑبڑ کو دور کرنا اور ملک کو یکساں سطح پر لانا ہے۔ بعض مسائل ایسے ہیں جو فوری حل کے طالب ہیں لیکن بعض ایسے ہیں جو طویل نوعیت کے حامل ہیں ہم انہیں حل کرنے اور برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے لیکن اس کے لیے میں آپ سے دلی فہم و تفہیم، تعاون اور صبر کا طالب ہوں۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ ہمیں اپنی مملکت کو مستحکم کرنا ہے لیکن یہ جب ہی ممکن ہے کہ عوام کام کریں۔ نعرے بازی کبھی بھی سخت محنت کی جگہ نہیں لے سکتی۔ یاد رکھیں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی درستگی ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ یہاں یہی وعدہ کر سکتے ہیں کہ ہم نتیجہ خدا پر چھوڑتے ہوئے اپنی انتہائی کوشش کریں گے۔ لہٰذا آپ ہماری کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے زندگی کے ان تلخ حقائق کو ضرور ذہن میں رکھیں گے۔

جہاں تک مارشل لاء کے نظم و نسق چلانے کا تعلق ہے میری تجویز ہے کہ سول محکموں کی موجودہ سزاؤں کو بڑھا کر سخت کر دیا جائے گا۔ ان امور سے نہایت سختی اور عجلت کے ساتھ نمٹا جائے گا۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ غنڈوں اور انتشار پسندوں کی سرگرمیوں کو سختی کے ساتھ کچل دیا جائے گا تا کہ پاکستان توازن کا احترام کرنے والے شہریوں کے لیے محفوظ بنایا جا سکے۔

چونکہ مارشل لاء کا نظم ونسق بڑی حد تک سول محکموں کے ذریعے چلایا جائے گا اس لیے میں ان سے کہتا ہوں کہ وہ یہ فرض جو شاید انہیں ناخوشگوار معلوم ہو، ایمانداری، خلوص اور راست بازی سے ادا کریں۔ یہ آپ کے لیے اپنی صلاحیتیں ظاہر کرنے کا موقع ہے۔ آپ اس سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ آپ عظیم روایات کے امین ہیں آپ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور ان روایات کے احیا کا کام ہاتھ میں لے لیں اور آپ یقین رکھیں کہ فوج آپ کی پوری مدد کرے گی۔ اس نازک موقع پر پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ ہماری فوجیں ہر وقت بیرونی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں۔

ان میں سے بعض کو مارشل لاء کے ضمن میں ڈیوٹی کے لیے بلایا جا سکتا ہے۔ ان کی ڈیوٹی خواہ کچھ بھی ہو، مجھے توقع ہے کہ وہ وفاداری، اہلیت اور بلا تامل کام کریں گے۔ ان کا طرزِ عمل اور رویہ ہمیشہ درست، منظم اور غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ مجھے ان کی اہلیت پر پورا اعتماد ہے وہ ہر قسم کے چیلنج کا جواب دینے کی ہمت رکھتے ہیں۔

یہاں انتشار پھیلانے والوں، سیاسی موقع پرستوں، اسمگلروں، چور بازاری کرنے والوں اور دیگر سماج دشمن عناصر کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ عوام اور ہمارے نوجوان تمہاری صورت سے بے زار ہیں۔ اب بھلا اسی میں ہے کہ اپنا طرزِ عمل درست کر لو ورنہ تمہاری کارروائیوں پر سخت اور فوری کارروائی کی جائے گی ان کارروائیوں کو کسی قیمت پر بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

میرے ہم وطنو! میں نے ساری تصویر خاصی تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر دی ہے تا کہ آپ کے شکوک وشبہات دور ہو جائیں اور آپ کو یقین ہو جائے کہ یہ انتہائی قدم آپ کے مفاد اور پاکستان کے استحکام کی خاطر اٹھایا گیا ہے۔ آیئے ہم سب مل کر عاجزی کے ساتھ خدائے بزرگ وبرتر کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں کہ وہ بہتر مستقبل کی طرف ہماری رہنمائی کرے اور ہم اس امتحان سے سرخ رُو نکلیں اور قوم ٹھوس اور مضبوط ہو جائے آمین۔

پاکستان پائندہ باد

مارشل لاء کے نفاذ پر جنرل یحییٰ خان کا قوم سے خطاب

پاکستانی بھائیو! آپ فیلڈ مارشل ایوب خان کی تقریر سن چکے ہیں جو کل نشر ہوئی تھی اور اب آپ نے ان کا ۲۴ مارچ کا وہ خط بھی پڑھ لیا ہوگا جو انہوں نے مجھے لکھا ہے اور جو اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیلڈ مارشل ایوب خان نے گذشتہ چند ہفتوں کے دوران کوئی ایسا انتظام کرنے کے لیے تمام ممکن اقدامات کیے جن کے ذریعے اقتدار پُر امن اور آئینی طور پر منتقل ہو سکے مگر ہم سب جانتے ہیں کہ ان کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں اس لیے انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اس ملک کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے اپنا بنیادی فرض انجام دوں جس کا پہلے ہی اعلان ہو چکا ہے کہ پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا ہے۔ مسلح افواج سے وابستہ لوگوں کو توقع تھی کہ دانشمندی غالب آ جائے گی اور اس انتہائی اقدام کی ضرورت نہ پڑے گی لیکن صورتِ حال اس حد تک بگڑ گئی تھی کہ نفاذِ قانون کے تمام طریقے بالکل بے اثر ہو کر رہ گئے اور مکمل طور پر ٹھپ ہو گئے۔ جان و مال کا سنگین نقصان ہوا اور قوم کے اندر خوف و ہراس کی ایسی فضا طاری ہو گئی جس نے زندگی کو درہم و برہم کر ڈالا، پیداوار خطرناک حد تک گر گئی اور معیشت کو بالعموم ایسا دھچکہ لگا کہ جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ہڑتالیں اور تشدد آئے دن کا معمول بن گئے اور ملک دریائے ذلالت کے کنارے پہنچ گیا۔ قوم کو تحفظ کی جانب واپس لانا تھا اور بلا تاخیر حالت کو معمول پر بحال کرنا تھا۔ مسلح افواج طوائف الملوکی کی طرف پہنچنے والی اس صورتِ حال کو خاموش تماشائی بن کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ انہیں اپنا فرض ادا کرنا اور ملک کو مکمل تباہی سے بچانا تھا اس لیے میں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ میرا مارشل لاء نافذ کرنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ عوام کے جان و مال کا تحفظ کیا جائے اور انتظامیہ کو دوبارہ کام پر لگا دیا جائے اسی لیے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے میرا پہلا اور اوّلین کام ہوش و حواس بحال کرنا اور اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ انتظامیہ عوام کے اطمینان کے مطابق اپنے معمولات انجام دے سکے۔ ہماری انتظامیہ میں سست روی اور ابتری بہت

ہو چکی۔ اب میں دیکھوں گا کہ اس کا کسی صورت اور طریقے سے اعادہ نہ ہو۔ انتظامیہ کے ہر رکن کو یہ امتباہ سنجیدگی کے ساتھ ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

میرے ہم وطنو! میں آپ پر قطعی طور پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ایک آئینی حکومت کے قیام کے لیے سازگار حالات پیدا کرنے کے سوا اور کوئی مقصد نہیں رکھتا۔ یہ میرا پختہ ایمان ہے کہ دانشمندی اور تعمیری سیاسی زندگی اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر اس منتخب ہونے والے عوامی نمائندوں کو اقتدار کی پُر امن منتقلی کے لیے ایک مستحکم، صاف ستھری اور دیانت دار انتظامیہ شرطِ اوّل ہے۔ یہ کام ان منتخب نمائندوں کا ہوگا کہ وہ ملک کو ایک قابلِ عمل آئین دیں اور ان تمام سیاسی، معاشی و معاشرتی مسائل کا حل تلاش کریں جنہوں نے عوام کے ذہنوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ میں طلبا، مزدوروں اور کسانوں سمیت اپنے معاشرے کے مختلف طبقوں کی حقیقی مشکلات اور اشد ضروریات سے باخبر ہوں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میری ایڈمنسٹریشن ان تمام مشکلات کو دور کرنے کی ہر ممکن جدوجہد کرے گی۔ میں مسلح افواج میں شامل آپ کے بھائیوں کے بارے میں بھی چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ بہادری اور بے لوث طریقے پر قوم کی ہمیشہ خدمت کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ پاکستان کے تحفظ مستعدی اور لگن کے ساتھ فرض کی پکار پر لبیک کہا ہے۔ انہوں نے پاکستان کے تحفظ اور اس کی عظمت کو یقینی بنانے کے لیے کسی قربانی کو عظیم نہیں سمجھا۔ مسلح افواج عوام کی ہیں وہ سیاسی عزائم نہیں رکھتیں اور کسی شخص یا کسی جماعت سے جانبداری نہیں برتیں گی۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم نے جو مشن شروع کیا ہے اسے قوم کی توقعات کے مطابق پورا کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ہم اپنی تاریخ کے انتہائی نازک اور فیصلہ کن دور سے گزر رہے ہیں۔ حالیہ واقعات نے ہمارے قومی وقار اور ترقی پر بڑی کاری ضرب لگائی ہے۔ مارشل لاء انتظامیہ کسی قسم کے ایجی ٹیشن یا تخریبی سرگرمیوں کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتی اور نہ کرے گی۔ میں آپ میں سے ہر شخص پر زور دوں گا کہ وہ ملک کو ہوش مندی کی راہ پر واپس لانے میں میری انتظامیہ سے تعاون کرے۔ ہر شخص خواہ اس کا رتبہ کچھ بھی ہو اپنے کام پر واپس پہنچ جائے اور پاکستان کی معیشت و بہبود کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرے۔

پاکستان پائندہ باد

مارشل لاء کے نفاذ کے موقع پر جنرل ضیاء الحق کا قوم سے خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم.

خواتین وحضرات! السلام وعلیکم۔ میں آج اس عظیم ملک کی عظیم قوم سے خطاب کرنے کا اعزاز حاصل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ختم ہو چکی ہے اور اس کی جگہ ایک عبوری حکومت قائم کی گئی ہے۔ یہ تبدیلی جو گذشتہ شب آدھی رات کو شروع ہوئی آج علی الصبح ختم ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ پُرامن طور پر ختم ہوئی۔ یہ تمام کارروائی میرے حکم پر عمل میں لائی گئی۔ اس عرصے میں وزیراعظم اور ان کے اکثر رفقاء کو بھی حفاظت میں لے لیا گیا ہے سوائے بیگم نسیم ولی خان صاحبہ کے۔ اس اقدام پر اب تک موصول ہونے والے تاثرات حسبِ توقع نہایت حوصلہ افزا ہیں۔ مختلف جگہوں سے مبارکباد کے پیغامات کی بھرمار ہو گئی ہے۔ اپنی قوم اور اپنی زندہ دل افواج کا شکر گزار ہوں۔ یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہوگا کہ معدودے چند حضرات نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ کہیں یہ کارروائی کسی کے ایما پر تو نہیں کی گئی۔ کہیں جنرل محمد ضیاء الحق کی سابق وزیراعظم سے کوئی خفیہ ملی بھگت تو نہیں ہے، اس کے متعلق یہ عرض کروں گا کہ حقائق کبھی چھپے نہیں رہتے۔ پچھلے چند ماہ کے تجربے سے اتنی بدگمانی ہو گئی ہے کہ اچھے بھلے لوگ بھی شک وشبہ میں پھنس گئے ہیں۔

آج صبح آپ نے خبروں میں سن لیا ہوگا کہ افواجِ پاکستان نے ملک کا نظم ونسق سنبھال لیا ہے۔ پاکستان کا ملکی نظام سنبھالنا کوئی مستحسن اقدام نہیں کیونکہ افواجِ پاکستان دل سے چاہتی ہیں کہ ملک کی باگ ڈور عوام کے ہاتھوں میں رہے جو صحیح طور پر اس کے حق دار ہیں۔ عوام یہ حق اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرتے ہیں اس کے لیے ہر جمہوری حکومت میں وقتاً فوقتاً انتخابات ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی سات مارچ کو انتخابات ہوئے جس کے نتیجے کو ایک فریق نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انتخابات میں دھاندلی کے الزام نے دوبارہ انتخابات

کے مطالبے کی شکل اختیار کر لی۔ اپنے دوبارہ انتخابات کرانے کے مطالبے پر زور دینے کے لیے انہوں نے ملک میں تحریک چلائی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ملک میں جمہوریت نہیں چل سکتی لیکن میرا یقین ہے کہ اس ملک کی بقاء جمہوریت اور صرف جمہوریت میں ہے اسی یقین کی وجہ سے اشتعال انگیزیوں اور سیاسی دباؤ کے باوجود افواجِ پاکستان نے اقتدار سنبھالنے سے گریز کیا۔ مسلح افواج کی ہمیشہ یہ خواہش اور کوشش رہی ہے کہ سیاسی مسائل کا سیاسی حل تلاش کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فوج نے حکومت پر زور دیا کہ جلد از جلد مذاکرات کے ذریعے اپنے سیاسی حریفوں کے ساتھ سمجھوتہ کیا جائے۔ ان مذاکرات کے لیے حکومت کو وقت درکار تھا جو افواجِ پاکستان نے نظم و نسق برقرار رکھ کر فراہم کیا۔ سول انتظامیہ کی مدد کے لیے فوج نے جو کردار ادا کیا جس پر بعض حلقوں کی جانب سے نکتہ چینی کی گئی ہم نے اسے برداشت کیا۔ ہمیں یقین تھا کہ قوم جب جذباتی اور ہیجانی کیفیت سے نکلے گی تو تمام شکوک و شبہات دور ہو جائیں گے اور قوم مسلح افواج کے صحیح اور آئینی کردار کو سراہے گی اور تمام خدشات دور ہو جائیں گے۔

میں نے ابھی آپ کے سامنے ملک کو درپیش صورتِ حال کا اجمالی نقشہ پیش کیا ہے۔ آپ پر واضح ہو گیا ہو گا کہ جب سیاستدان بحران کو حل کرنے میں ناکام رہے تو افواجِ پاکستان کے لیے خاموش تماشائی بنے رہنا ناقابلِ معافی جرم ہے۔ فوج کو مجبوراً یہ اقدام کرنا پڑا جو ملک کو بچانے کے لیے کیا گیا ہے۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد کے درمیان سمجھوتے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا جس کی وجہ ان کے آپس کی بداعتمادی اور بدگمانی تھی۔ ان حالات میں اندیشہ تھا کہ اگر پیپلز پارٹی اور پی۔ این۔ اے کے درمیان سمجھوتہ نہ ہوا تو ملک ایک بار پھر افراتفری اور سنگین بحران کا شکار ہو جائے گا۔ یہ خطرہ ملک کے مفاد میں ہرگز نہیں لیا جا سکتا تھا، اسی لیے فوج کو کارروائی کرنا پڑی جس کے نتیجے میں اب جناب بھٹو کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔ پورے ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا ہے قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں گورنر اور صوبائی وزیر ہٹا دیئے گئے ہیں۔

میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آئین منسوخ نہیں کیا گیا لیکن اس کے بعض حصوں پر عمل درآمد روک دیا گیا ہے۔ صدر فضل الٰہی چوہدری حسبِ سابق اپنی ذمّے داریاں جاری رکھنے پر رضامند ہو گئے ہیں جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ وہ آئین کے تحت صدرِ مملکت کے

فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ اہم قومی مسائل کو حل کرنے کے لیے ان کی مدد کے لیے ایک ملٹری کونسل کی تشکیل کی گئی ہے۔ یہ کونسل چار افراد پر مشتمل ہوگی جس میں چیئرمین جوائنٹ چیف آف اسٹاف اور بری، بحری و ہوائی افواج کے چیف آف اسٹاف شامل ہوں گے۔

میں چیف آف آرمی اسٹاف اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ذمّے داریاں ادا کروں گا۔ حسبِ ضرورت مارشل لاء آرڈر اور ضابطے جاری کیے جائیں گے۔ آج صبح میں چیف جسٹس آف پاکستان جناب یعقوب علی سے بھی ملا۔ میں ان کے مشورے اور قانونی رہنمائی کے لیے ازحد ممنون ہوں میں یہ بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے کوئی سیاسی عزائم ہیں نہ ہی فوج اپنے سپاہیانہ پیشے سے اکھڑنا چاہتی ہے۔ مجھے صرف اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے آنا پڑا ہے جو سیاست دانوں نے پیدا کیا ہے اور میں نے یہ چیلنج صرف اسلام کے ایک سپاہی کی حیثیت سے قبول کیا ہے۔ میرا واحد مقصد آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کروانا ہے جو اس سال اکتوبر میں منعقد ہوں گے اور انتخابات مکمل ہوتے ہی میں اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو سونپ دوں گا اور میں اس لائحہ عمل سے ہرگز انحراف نہیں کروں گا۔ آئندہ تین مہینوں میں میری ساری توجہ انتخابات پر مرکوز ہوگی اور میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اپنے اختیارات کو دوسرے معاملات پر ضائع کرنا نہیں چاہتا۔

اس مرحلے پر یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ملک کی عدلیہ کے لیے میرے دل میں بہت احترام ہے، میری پوری کوشش ہوگی کہ جہاں تک ممکن ہو عدلیہ کے اختیارات محدود نہ ہوں، تاہم بعض ناگزیر حالات میں خصوصی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے مارشل لاء آرڈر اور مارشل لاء ریگولیشن جاری کرنا ضروری ہوں گے، جب بھی یہ آرڈر اور ریگولیشن جاری ہوں گے ان کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔ میں انتخابات کروانے کے لیے عنقریب مفصل ٹائم ٹیبل اور طریقۂ کار کا اعلان کروں گا۔ سیاسی محاذ آرائی کے دوران جو کشیدگی پیدا ہوگئی تھی اسے دور کرنے اور عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے آج سے تاحکمِ ثانی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ تاہم انتخابات سے قبل سیاسی سرگرمیاں بحال کر دی جائیں گی۔ میرے عزیز ہم وطنو! میں نے اپنے دل کی بات کھول کر کہہ دی ہے۔ اس نیک مشن کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے رہنمائی اور آپ سے تعاون کا خواستگار ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ عدلیہ، انتظامیہ اور عام شہری مجھ

سے مکمل تعاون کریں گے۔ میری یہ کوشش ہوگی کہ مارشل لاء انتظامیہ نہ صرف ہر ایک کے ساتھ انصاف اور برابری کا سلوک کرے بلکہ ان میں بھی ایسا احساس پیدا کرے۔ سول انتظامیہ کو بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔ اس لیے میں مسرت کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ صوبائی ہائی کورٹوں کے چیف جسٹسوں نے میری درخواست پر اپنے متعلقہ صوبوں کا قائم مقام گورنر بننا قبول کرلیا ہے۔ سول انتظامیہ کے ان افسران کو جنہیں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی خدشات ہیں، میں یقین دلاتا ہوں کہ کسی کو ناکردہ گناہوں کی سزا نہیں ملے گی لیکن اگر کوئی سرکاری ملازم اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکام رہا یا اس نے جانبداری برتی یا قوم کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تو اسے سخت سزا دی جائے گی اسی طرح اگر کسی شہری نے ملک میں امن وامان میں خلل ڈالنے کی کوشش کی تو اس سے بھی سختی سے نمٹا جائے گا۔

جہاں تک خارجہ تعلقات کا تعلق ہے، میں بالکل واضح کردینا چاہتا ہوں کہ سابقہ حکومت نے جو سمجھوتے، وعدے اور معاہدے کیے ہیں، میں ان کا پابند رہوں گا اور مسلح افواج کے افسروں اور جوانوں سے کہوں گا کہ وہ اپنے فرائض مکمل جانبداری اور انصاف کے ساتھ انجام دیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ہر صورتِ حال اور ناجائز نرمی کا مظاہرہ کیے بغیر نمٹیں گے۔ میں ان سے یہ توقع بھی کروں گا کہ ماضی میں بعض لوگوں نے اگر انہیں لعن طعن کا نشانہ بنایا ہو تو اسلامی اصولوں کے تحت اسے معاف کردیں گے۔ میں ان سے اپیل کروں گا کہ وہ اپنے فرائض ادا کرتے وقت اپنے اور اپنے پیشے کے وقار کو پیشِ نظر رکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی نئی ذمّے داریوں سے احسن طریقے پر عہدہ برآ ہوں گے جس سے ان کے وقار اور مرتبے میں اضافہ ہوگا۔

چند نکات کی تشریح ضروری سمجھتا ہوں:

۱۔ اوّلاً سول عدالتیں اپنے فرائض معمول کے مطابق انجام دیتی رہیں گی۔

۲۔ فیڈرل سیکیورٹی فورس کی عنقریب تنظیمِ نو کی جائے گی۔

۳۔ حال ہی میں سول انتظامیہ میں جو تبادلے کیے گئے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

۴۔ عبوری حکومت کا ڈھانچہ اس طرح تشکیل دیا گیا ہے:

(الف): جناب صدر فضل الٰہی چوہدری بدستور سربراہِ مملکت ہوں گے۔

(ب): ملک کے اہم انتظامی امور ملٹری کونسل ادا کرے گی۔ جس کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔

(ج): انتظامیہ کا سربراہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہوگا۔ سیکریٹری جنرل ڈیفنس جناب غلام اسحاق خان تمام وفاقی محکموں میں رابطے کے ذمّے دار ہوں گے۔

(د): وفاقی حکومت کے سیکریٹری اپنے اپنے محکمے کے سربراہ ہوں گے۔

(ہ): ہر صوبے کے ہائی کورٹ کا چیف جسٹس اس صوبے کا قائم مقام گورنر ہوگا۔

(و): صوبے کی انتظامیہ کے سربراہ صوبے کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہوں گے اور صوبائی محکموں کے انچارج بدستور سیکریٹری رہیں گے۔

میری خواہش ہے کہ:

(الف): انتظامیہ بلاخوف وخطر اپنے فرائض انجام دے۔

(ب): پولیس میں بے لوث خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔

(ج): اخبارات آزاد صحافت کے علمبردار ہوں مگر ضابطۂ اخلاق سے انحراف نہ کریں۔

(د): قوم میں ہوش مندی پیدا ہو۔

(و): ملک میں امن وامان قائم رہے اور غنڈہ گردی کا خاتمہ ہو۔

(ز): درس گاہیں سیاسی اکھاڑے نہ بنیں۔

آپ کی اطلاع کے لیے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرحدیں محفوظ ہیں اور مسلح افواج اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں اور سرحدیں جائز نقل وحرکت کے لیے کھلی ہیں۔ آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حالیہ تحریک میں اسلام کا جو جذبہ دیکھنے میں آیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا وہ اسلام کے نام پر ہی قائم رہے گا جس کے لیے اسلامی نظام کی اشد ضرورت ہے۔

اقتدار پر فوجی قبضے کے بعد

جنرل پرویز مشرف کا قوم سے خطاب

میرے عزیز ہم وطنو!

السلام علیکم! آپ سب اس بحرانی اور غیر یقینی صورتِ حال سے آگاہ ہیں جس سے ملک حالیہ دنوں میں گزر رہا ہے۔ تمام اداروں کے ساتھ نہ صرف چھیڑ چھاڑ کی گئی اور انہیں منظم طریقے سے تباہ کیا گیا بلکہ معیشت بھی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ ہم ان خود غرضانہ پالیسیوں سے بھی آگاہ ہیں جنہوں نے وفاقِ پاکستان کی بنیادوں تک کو ہلا کر رکھ دیا۔ مسلح افواج پر مسلسل عوام اور مختلف سیاسی حلقوں کی طرف سے دباؤ تھا کہ ملک کی تیزی سے بگڑتی ہوئی صورتِ حال کا مداوا کیا جائے، ملک کے بہترین مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پورے خلوص کے ساتھ وزیراعظم کو ہمیشہ ان خدشات سے آگاہ کیا گیا۔ یہ واضح رہے کہ انہیں کبھی بھی درست معنوں میں نہیں لیا گیا، میری ان کوششوں کا واحد مقصد ملک کی فلاح تھا، صرف یہی وجہ تھی کہ فون نے خوشی سے تعمیرِ ملت کے کاموں کے لیے اپنی خدمات پیش کیں جن کے نتائج کا آپ بخوبی اندازہ کر چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری تمام کوششوں اور مشاورت کا کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ اس کے بجائے اب وزیراعظم نے اپنی تمام توجہ فوج پر مرکوز کر دی۔ میرے تمام مشوروں کے باوجود انہوں نے مسلح افواج میں مداخلت کرنے کی کوشش کی حالانکہ فوج وہ کارآمد ادارہ ہے کہ ملک کے استحکام و اتحاد کے لیے اس کی طرف دیکھتے ہیں اور اس پر آپ سب بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ ہمارے خدشات ایک مرتبہ پھر غیر مبہم انداز میں حکومت تک پہنچائے گئے۔ مسٹر نواز شریف کی حکومت نے انہیں نظر انداز کیا اور فوج کو سیاست میں ملوث کرنے کی کوشش کی، اسے غیر مستحکم کرنے اور اس کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ میں سرکاری دورے پر سری لنکا میں تھا۔ میری واپسی پر پی۔آئی۔اے کی کمرشل پرواز کو کراچی ایئرپورٹ پر اترنے کی اجازت نہ دی گئی اور ایندھن کی انتہائی کمی کے باوجود حکم دیا گیا کہ

اسے پاکستان سے کہیں باہر اتارا جائے، اس طرح تمام مسافروں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ فوج کے تیز رفتار ایکشن نے ان کے مکروہ، عزائم کو ناکام بنا دیا۔ میرے عزیز ہم وطنو! اس پس منظر کی اختصار سے وضاحت کرنے کے بعد میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلح افواج نے آخری چارۂ کار کے طور پر ملک کی باگ ڈور سنبھال لی ہے تاکہ ملک کو مزید عدم استحکام سے بچایا جا سکے۔ میں نے یہ کام پورے خلوص و وفاداری اور ملک کے ساتھ بے غرض وابستگی کے جذبے سے کیا ہے اور مسلح افواج مضبوطی کے ساتھ میرے پیچھے ہیں۔ میں اس وقت کوئی طویل پالیسی بیان جاری نہیں کرنا چاہتا لیکن میں جلد ہی طویل پالیسی بیان جاری کروں گا۔ اس وقت میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ملک میں صورتِ حال مکمل طور پر پُر امن، مستحکم اور قابو میں ہے۔ پیارے بھائیو اور بہنو! آپ کی مسلح افواج نے آپ کو کبھی مایوس نہیں کیا اور نہ آئندہ کرے گی۔ انشاء اللہ ہم ملک کے اتحاد اور اقتدارِ اعلیٰ کا اپنے خون کے آخری قطرے تک تحفظ کریں گے۔ میں آپ سب سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ پُر امن رہیں اور اپنی مسلح افواج کی حمایت کریں تاکہ پاکستان کا مستقبل روشن ہو اور خوشحال بنانے کے لیے اسے دوبارہ مستحکم بنا دیا جائے، اللہ ہمیں سچائی اور عزت کی راہ پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ حافظ، پاکستان پائندہ باد۔

پاکستان میں بادشاہت کے قیام کے حق میں
جنرل ایوب خان اور ان کے وزیرِ خارجہ منظور قادر کے نام
پیر علی محمد راشدی کے خطوط

(۱)

''میں سابق سیاستدانوں کے پر، پرواز سے پہلے کاٹنے کی تجاویز دوں گا''*

آئینی تجاویز کے سلسلے میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے نام پیر علی محمد راشدی کا پہلا خط جس کے بعد انہوں نے آئینی بادشاہت کا فارمولا بھیجا تھا

سفارت خانہ پاکستان

منیلا

فلپائن

۱۹ دسمبر ۱۹۶۰ء

جنابِ صدر!

اس عریضے کے ساتھ میں وہ اصل کاغذات لوٹا رہا ہوں، جو آپ میرے پاس چھوڑ گئے تھے، مستقبل میں حوالے کے لیے ان میں سے اہم باتیں میں نے لکھ لی ہیں میرے خیال میں اس کے لیے مجھے آپ کی اجازت حاصل ہے، وہ میری ذاتی تحویل میں رہیں گے۔

---

* ہفت روزہ 'معیار'، کراچی، جلد ۹، شمارہ ۱۲، ۲۴ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۸۳ء

۲۔ جیسا کہ میں نے ذاتی طور پر بھی آپ کو بتایا تھا۔ اب بھی میرا یقین ہے کہ میری رائے اس صورت میں اور زیادہ وقیع اور وزنی ہوگی۔ اگر میں ایک زیرک سیاستدان کی نظر سے وطنِ عزیز کی اندرونی کیفیت کا ایک تیز اور خفیہ جائزہ لے کر اور مندرجہ ذیل نکات کے سلسلے میں کسی نتیجے پر پہنچ کر آپ کو لکھوں۔

ا۔ معاملات کی سرکاری توجیہہ اور انٹیلی جنس کی رپورٹوں کے علاوہ میں اپنے انداز میں جاننا چاہوں گا کہ عین اسی وقت عام طور پر لوگوں کا مزاج کیا ہے۔ اور سوچ کا رُخ کیا ہے (میرے موجودہ مقصد کے ضمن میں یہ اندازہ اور تخمینہ صرف ایک تجربہ کار سیاستدان ہی لگا سکتا ہے۔)

۲۔ سابق سیاستدان خود اس وقت کن خطوط پر سوچ رہے ہیں بہرحال وہ ذہنی طور پر بے کار تو نہیں بیٹھے ہوں گے۔

۳۔ سابق سیاستدان آخر کار مجوزہ آئین کے کن کمزور نکات کے خلاف اور کن محاذوں پر اپنے حملوں کو مرکوز رکھیں گے۔ یہ جاننے کے بعد میں اس قابل ہو سکوں گا کہ ان حملوں سے مدافعت کے طریقے بتا سکوں اور پرواز سے قبل ہی ان کے پر کاٹنے کی تجاویز دے سکوں۔ اور جب آئین کا نفاذ ہوا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ زمین ان کے پاؤں تلے سے پہلے ہی نکل چکی ہے۔ یہ فنِ سیاست ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جائز یا ناجائز قانونی دماغ کتنے بھی روشن ہوں، فنِ سیاست کے مثالی شعبدے نہیں دکھا سکتے۔

۴۔ آئندہ پانچ سے دس برس کے دوران عام اندازِ فکر کن خطوط پر نمو پائے گا۔ تاکہ اس کی کیفیت کو مختلف اوقات میں اس کے مختلف مدارج کو سامنے رکھتے ہوئے آئینی ڈھانچے کی حاشیہ بندی اس طرح کی جائے کہ ہمارے اس وقت پیشِ نظر قومی اور انتظامی مقاصد کو بھرپور انداز سے پورا کرے۔ آنے والے وقت میں فرسودہ نہ ہو۔ اور نہ فروغ پذیر سیاسی فکر کی جولانیوں کے سامنے دم بخود رہ جائے۔ کیونکہ آنے والے برسوں میں کسی موقع پر اگر۔ آئین میں لچک کی حد اور سیاسی فکر میں وسعت کی حد کے درمیان فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ تو خود آئین پر اتنا دباؤ پڑے گا کہ اس صورتِ حال سے عہدہ برآئی کے لیے ایک اور انقلاب کی آمد کا خطرہ ہوتا۔ بہرحال ہمارے ہم وطن انقلاب کے عشرات سے آشنا ہو چکے ہیں۔ اور مزید برآں ہم مستقبل

کے عشروں اور نسلوں کے انداز سے پیش بینی کر رہے ہیں۔ (میں عرض کروں گا کہ ایک تربیت یافتہ سیاستدان اور عوامی نفسیات کا ایک انتہائی عیار طالب علم ہی یہ توجیہہ پیش کر سکتا ہے۔ اگرچہ میں ان خوبیوں پر پورا اترنے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔ میں کم از کم ایک مخلصانہ کوشش ضرور کروں گا)۔

۵۔ کوئی آئین بھی اس وقت تک کام نہیں چلا سکتا جب تک اسے برقرار رکھنے کے لیے ایک پارٹی کی شکل میں سیاسی حمایت حاصل نہ ہو۔ میں اپنی ذاتی تحقیقات کے ذریعے یہ جاننا چاہوں گا کہ بنیادی جمہوریت کے ذریعے کیا مناسب مقدار میں ایسی حمایت کا یقینی امکان ہے۔ (میری معلومات اب تک یہ ہیں کہ حکمت عملی کے تقاضوں کے تحت سابق سیاستدانوں نے اپنے آپ کو باہر رکھتے ہوئے، اپنے بیٹوں، بھائیوں، برادرانِ نسبتی اور حواریوں کو اس میں دھکیل دیا ہے۔ میں ذاتی طور پر ان معلومات کی تصدیق کروں گا)۔

۶۔ آنے والے دنوں میں پاکستان کے اندرونی حالات پر بیرونی واقعات کا ممکنہ اثر۔ اور آئین پر ان کے ممکنہ اثرات۔

ایسے جائزے کے لیے مجھے تین ہفتے سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ اس کی کامیابی کا بنیادی انحصار اس امر پر ہوگا کہ اس کا اخفا برقرار رکھا جائے، اور صدر کے علاوہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں یہ کام کر رہا ہوں۔ مجھے سفارتی مشوروں کے لیے طلب کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر مختصر سی چھٹی کی اجازت دی جا سکتی ہے جس کے دوران میں اپنے اس فرض کو انجام دے سکتا ہوں۔

۳۔ اسی اثناء میں آپ کے حکم کے مطابق آپ کے کاغذات پر میں اپنا ابتدائی اور فوری تاثر دینا چاہوں گا۔ جو درج ذیل ہے (یہ سب ان معروضات سے منسلک ہے۔ جو میں نے پیرا نمبر ۲ میں بیان کیا ہیں۔ اور سرکاری تجاویز میں مضمر روح سے توثیق کے ساتھ جس حد تک ممکن ہو اسی دائرہ کار میں رہتے ہوئے)۔

۱۔ ایک کی بجائے دو ایوانوں کا نظریہ بہت اچھا ہے۔

۲۔ ایوان بالا کی تشکیل منصبی نمائندگی کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ لیکن منصبی نمائندگی بڑا حساس قسم کا مواد (دانشور، آزاد سوچ رکھنے والے پر بھی فراہم کر دے گی۔ جو بعض مواقع پر ایوانِ زیریں کے ارکان کی نسبت زیادہ نظریاتی اور زیادہ پریشان کن واقع ہوگا۔ اس لیے پہلے پانچ سال کی

میعاد کے لیے اس میں ۵۰ فیصد نامزد ہونے چاہئیں۔ دوسری میعاد کے لیے ۲۵ فیصد۔ تیسری میعاد کے لیے اور بعد ازاں ۱۰ فیصد۔ یہ ایک طرح سے اندرونی تحفظ ہوگا۔

۳۔ ایوانِ زیریں کی تعداد ضروری نہیں کہ کم ہو۔ ایک کم تعداد کا ایوان بڑے ایوان کی نسبت زیادہ متلون اور سیماب طبع ثابت ہوا ہے۔ کم تعداد کے ایوان میں مٹھی بھر افراد کی وفاداریوں کی تبدیلی راتوں رات قوت کا توازن بدل کر بحران پیدا کر سکتی ہے۔ ایوان جتنا بڑا ہوگا، اتنا ہی زیادہ استحکام ہوگا۔ میرے خیال میں کم از کم ۲۰۰ سے ۳۰۰ ارکان ہونے چاہئیں۔ پہلی میعاد میں اس میں سے ۲۵ فیصد ارکان نامزد ہوں تا کہ نشیب و فراز کو ہموار کیا جا سکے۔ پانچ برس کے بعد یہ فیصلہ دونوں ایوانوں پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ مشترکہ اجلاس میں طے کریں کہ ایوان زیریں میں نامزدگیاں جاری رکھی جائیں یا نہیں۔

۴۔ مالیاتی بلوں کے لیے میں یہ طریقِ کار تجویز کروں گا۔

ا: صدر تخمینے بھیجے گا۔

ب: تخمینوں کی دو اقسام ہوں گی۔ (i) معمولی، (ii) وہ جو قوم کی بقاء کے لیے 'ناگزیر' ہیں۔

ج: معمولی امور کے لیے عام طور پر ایوان زیریں کا ووٹ قیمتی ہوگا۔ لیکن اگر صدر سوچتا ہے کہ ایوانِ زیریں کے ووٹ میں عقل کا استعمال پورا نہیں ہوا ہے تو اسے اختیار ہو کہ وہ ان امور کو مسترد کر کے ایوان بالا کے حوالے کر دے۔

د: اگر ایوان بالا بھی ان امور کو مسترد کر دیتا ہے تو یہ امور مسترد ہو جائیں گے۔ تا آنکہ صدر دونوں ایوانوں کی تنقید سننے کے بعد قومی مفاد میں ضروری سمجھے کہ ان مسترد شدہ امور کو 'ناگزیر' امور کی طرف منتقل کر دے، جس کے لیے صدر کو مطلوبہ اختیار حاصل کرنے ہوں گے۔

ر: 'ناگزیر امور' پر دونوں ایوانوں میں بحث ہو سکتی ہے۔ لیکن ان پر ووٹنگ نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی ایک ایوان بھی کسی خاص امر کے لیے خاص رائے رکھتا ہے۔ وہ ایک قرارداد کی صورت میں صدر کے نام ایک عرضداشت بھیج سکتا ہے لیکن بالآخر یہ صدر کی صوابدید پر منحصر ہوگا کہ وہ اس عرضداشت کو قبول کرے یا نہیں۔ (نوٹ: ان دونو عیتوں یا شیڈول کی تشکیل کے لیے ابتدائی احتیاط اور پیش بینی کی ضرورت ہوگی۔

س: پہلے دس سال تک صدر پر کوئی الزام عاید نہیں ہو سکے گا۔ خواہ اس کے لیے کوئی بھی تحفظ فراہم

کیا جائے۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء کے درمیان صدر کے مقام کو بہت نقصان پہنچایا گیا ہے۔ اب کچھ وقت اسے ملنا چاہیے تاکہ یہ ماضی کی گرد اتار سکے۔ اور اپنی بنیاد دریافت کر سکے۔ الزام تراشی کی گنجائش خواہ وہ کتنے ہی تحفظات سے منتھی ہو، نفسیاتی طور پر اس مقصد کی نفی کرے گی۔ اگر ایسی گنجائش ابتداء سے رکھنی ہی ہے تو پہلے سے طے کر لیا جائے کہ اس گنجائش پر ۱۰ سال بعد عملدرآمد اس وقت ہو سکے گا جب دونوں ایوان اپنے مشترکہ اجلاس میں تین چوتھائی اکثریت سے اس کا فیصلہ کریں۔ اور جب دونوں ایوان اس مقصد کے لیے اجلاس کریں تو انہیں یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اس گنجائش کو جس انداز میں چاہیں ڈھال لیں یا تبدیلی کر دیں۔

ش: کسی بھی صورت میں اس امکان یا صورتحال کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیے، کہ صدر اور پارلیمنٹ میں تنازعے کی صورت میں صدر پر لازم ہو کہ وہ عوامی ریفرینڈم کی مشقت برداشت کرے (میری مجوزہ اسکیم میں تو ایسے تنازعے کے وقوع پزیر ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا)۔ اگر مجھے حکم دیا جائے، تو میں اپنے اس نظریے کے حق میں وزنی دلائل دے سکتا ہوں۔

ص: کسی بھی شکل میں کسی بھی نام کے تحت دوہری رکنیت نہیں ہوگی۔ نہیں ہوگی۔ (اگر مجھے حکم دیا جائے تو میں بڑے قوی دلائل دے سکتا ہوں)۔

ض: عام قانون سازی کے میدان میں (مالیاتی بلوں سے الگ) بھی یہی اصول اپنائے جائیں جو مالیاتی بلوں کے ضمن میں بتائے گئے ہیں (ذیلی پیراگراف (ا) سے (ش) تک)۔

ط: اب رہا یہ سوال کہ پارلیمنٹ کو چلانے کے لیے سیاسی پارٹیاں ہونی چاہئیں یا نہیں۔؟ سرکاری تجاویز کا متعلقہ حصہ تتمہ چہارم کے گیارہویں اور بارہویں پیرے میں موجود ہے بدقسمتی سے اس میں مجوزہ طریقِ کار کے قابل عمل ہونے کی بھی حمایت ظاہر نہیں کر سکتا ایسے نازک مسئلے پر اپنی رائے دینے سے پہلے مزید روشنی حاصل کرنا چاہوں گا۔ کیونکہ یہ مسئلہ اگر حقیقت پسندی سے طے نہ کیا گیا تو یہ صدر اور عوام کی اکثریت کے درمیان تنازعے کے پہلے سبب کے طور پر اُبھر سکتا ہے۔ جو پیش نظر مقصد کے حصول کی بھی کوشش کرے گا۔ ناقابلِ عمل بھی نہیں ہوگا۔ اور پاکستانیوں کے وقار میں عزتِ نفس کے احساس کو بھی مجروح نہیں کرے گا۔

۵۔ آخر میں پھر بتکرار عرض کروں گا کہ مجھے موقع پر حالات کا مختصر سا مشاہدہ کر کے اپنا حتمی فارمولا پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس وقت تو ایسا لگ رہا ہے جیسے میں بوسہ بہ پیغام، بھیج رہا ہوں۔

انتہائی مودبانہ تعظیمات اور اپنی وفادارانہ خدمت کی یقین دہانیوں کے ساتھ۔

آپ کا تابعدار خادم
پیر علی محمد راشدی سفیر

(۲)

''صرف بادشاہت ہی ہمیں تباہی سے بچا سکتی ہے''*

جنرل ایوب خان کے نام
سفارت خانہ پاکستان
منیلا
ٹاپ سیکرٹ اور پرائیویٹ
بذریعہ بیگ
۱۲ جون ۱۹۶۱ء
موضوع۔ آئین

جب سے آپ نے مستقبل کے آئین پر مجھے مشورے کا شرف بخشا ہے، میں ایک شدید ذہنی بحران سے دوچار ہوں۔ اسے حل کرنے کے لیے اور اس سوال کا تمام غلطیوں سے مبرا جواب حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنے ذہن پر اس کی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ زور دیا ہے۔ میں تنہائی میں کئی ماہ تک خیالات میں غوطہ زن رہا ہوں۔ میں نے پاکستان کی گذشتہ ۱۴ سال کی تاریخ کا

* ہفت روزہ 'معیار'، کراچی، جلد ۹، شمارہ ۱۴، ۷ تا ۱۳ جنوری ۱۹۸۴ء

دوبارہ بغور مطالعہ کیا ہے اس عرصے کے سیاسی واقعات اور حادثات کا فکری تجزیہ کیا ہے۔ ان کی جڑوں تک پہنچنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان اسباب کی نشاندہی ہو سکے۔ جن کے یہ قدرتی نتائج تھے۔ ۱۴ برس سے آگے جا کر میں نے پاکستان سے پہلے کے واقعات بھی ذہن میں تازہ کیے ہیں جن کے پس منظر میں یہ نئی مملکت وجود میں آئی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنی روزانہ یادداشتوں کی ورق گردانی بھی کی ہے۔ پرانی دستاویزات اور ریکارڈ دیکھے ہیں میں نے از سرِ نو ان تمام ادوار کو دوبارہ طے کیا ہے جن میں ۱۹۵۶ء کا دستور بنانے والوں نے سفر کیا تھا۔ میں نے تاریخِ کائنات اور دساتیر عالم پر بے شمار کتابوں کے اوراق پلٹے ہیں۔ میں نے مختلف قدیم مسلمان مملکتوں کے زوال و عروج کے اسباب کی تحقیق کی ہے۔ میں نے یہ بھی جاننے کی سعی کی ہے کہ عین اس لمحے ہمارے اپنے عوام کے ذہن کس نہج پر سوچ رہے ہیں۔

میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ وہ کچھ سنسنی خیز ہے۔ یہ کچھ اس طرح ہے۔

'اگر ہمیں اپنے حالیہ ناگوار ماضی سے مستقلاً دامن چھڑانا ہے اور ہمیں بے یقینیوں، تضادات، اور تنازعوں کو ختم کرنا ہے پاکستان کا استحکام اور اتحاد برقرار رکھنا ہے اور ایک مملکت کی حیثیت سے اس کی جانبداری اور قابلِ عمل ہونے کا تحفظ کرنا ہے تو ہمیں ایک متحد قومیت کی پُرشکوہ انسانی علامت پیش کرنا ہوگی جو ایک ایسا مرکزی مینار ہو جس میں توازن کی مقناطیسی کشش ہو جو مستقل ہو، ناقابلِ تبدیل ہو، غیر متزلزل ہو اور تمام روزمرہ تضادات اور تنازعات سے بالاتر ہو۔ یہ صرف شہنشاہیت کے قیام کے ذریعے ممکن ہے۔

اس فارمولے میں پناہ لینے کے علاوہ مجھے اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ جو ہمیں تباہی کی طرف ہمارے مسلسل سفر سے ہمیں روک سکے۔

مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میرے نظریے کو اگر میری پیش کردہ صورت میں پوری دانشمندی اور قاعدے قرینے سے عوام کے سامنے پیش کیا جائے تو یہ ان کی رضامندی ضرور حاصل کرے گا۔ میں نے اس معاملے کے اس پہلو پر ابھی روشنی نہیں ڈالی ہے کہ اس نظریے کی تشہیر کے کیا طریقے ہوں گے۔ کیونکہ جب تک اس اصول کو قبول نہ کیا جائے اس کا طریقِ کار تجویز کرنا قبل از وقت ہے لیکن میں اپنی جگہ اس کے بارے میں مکمل یقین رکھتا ہوں۔ اگر مجھے ذمّے داری سونپی جائے تو میں اس منصوبے کو عوام میں مقبول کروانے کی ذمّے داری کا بڑا حصہ قبول کرنے کو تیار ہوں۔

مجھے معلوم نہیں کہ میری اس تجویز پر آپ کا ردِعمل کیا ہوگا۔ میں امید کرتا ہوں اور دعا بھی ہے کہ آپ مجھ پر ناراض نہ ہوں چونکہ آپ نے مجھ سے مشورہ کیا ہے اور آپ نے مجھے ہمیشہ پدری شفقت دی ہے۔ اس لیے اگر میں آپ کے سامنے اپنی ذہنی کیفیت کو کھل کر بیان نہ کروں تو میں آپ سے بے وفائی اور بے ایمانی کا مرتکب ہوں گا۔

مزید برآں میری تجویز میں صرف بادشاہت ہی نہیں ہے جس کا میں نے مشورہ دیا ہے اس کے علاوہ بھی بہت سے امور ہیں جو غور طلب ہیں۔

تاہم اگر آپ اس تجویز کو کاملاً بے وقعت سمجھتے ہیں تو آپ اسے ضائع کر سکتے ہیں۔ میں اپنی طرف سے یہ باب ختم سمجھوں گا۔

اگر بصورت دیگر آپ یہ خیال کریں کہ کابینہ کی کمیٹی کے اس پر غور کرنے میں کوئی حرج نہیں تو میں انتہائی احترام سے یہ گذارش کروں گا کہ آپ منسلکہ یادداشت مسٹر بھٹو کے حوالے کر دیں تا کہ وہ اسے اپنی کمیٹی تک پہنچا دیں۔ میرا یہ خط اس میں سے نکال لیا جائے اور یہ حقیقت ریکارڈ میں نہیں آنی چاہیے کہ یہ تجویز میں نے پہلے آپ کو بھیجی تھی۔ کابینہ کی کمیٹی کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے تو مجھ پر جتنی چاہے جرح کرے تا کہ وہ میری تجاویز میں کچھ گہرائی اور مغز دریافت کر سکے۔

احترامات و آداب کے ساتھ

آپ کا تابعدار خادم

پیر علی محمد راشدی

(۳)

''پارلیمانی بحرانوں، انقلابات اور جوابی انقلابات کے خاتمے کے لیے 'بادشاہ' اور 'امیر پاکستان' کا تصور''*

پاکستان کے وزیر خارجہ منظور قادر کے نام پیر علی محمد راشدی کا خط جس میں آئینی بادشاہت کا مکمل فارمولا پیش کیا گیا ہے

خفیہ

سفارتخانہ پاکستان،
پی او بکس نمبر ۲۱۶۹
منیلا (فلپائن)
۱۴ جون ۱۹۶۱ء

موضوع: پاکستان کا مستقبل کا آئین

جناب وزیر خارجہ

اب جبکہ آپ کو ہمارے محکمے کے وزیر کو کابینہ کی اس کمیٹی کا سربراہ چنا گیا ہے۔ جسے مستقبل کے آئین کے مسائل کو جانچنا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات بہت مناسب اور برمحل ہوگی کہ میں اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کروں۔

۲۔ میں یہاں جو فارمولا تجویز کر رہا ہوں وہ پہلی نظر میں کچھ لوگوں کو نامانوس 'رجعت پسندانہ' بلکہ خطرناک بھی محسوس ہوسکتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ صرف یہی وہ فارمولا وہ حل فراہم کرسکتا ہے جسے ہم برسہابرس سے تلاش کر رہے ہیں اور یہ کہ یا تو اب ہم میں ایک بادشاہ ہو یا پھر بعد میں تاریخ کے بہاؤ کے ساتھ بہت سارے بادشاہوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہیں۔

---

* ہفت روزہ 'معیار'، کراچی، جلد ۹، شمارہ ۱۲، ۲۴ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۸۳ء

۳۔ جب اچانک انقلابی اور حیرت انگیز حد تک غیر قدامت پسندانہ تجاویز سامنے آئیں تو یہ فیصلہ کرنے والوں کا ناگریز فرض ہوتا ہے کہ وہ پہلے ان کے خالقوں کے محاسن کا جائزہ لیں اور اس بات کا یقین کریں کہ کیا وہ کسی الجھاوے اور انتشار کا شکار رہے ہیں۔ یا کسی معقول اور پختہ ذہن کی ترجمانی کرتے ہیں؟ کیا یہ تجاویز کسی ٹھوس تجربے پر مبنی ہیں یا کسی مبتدی کے وقتی جذباتی ابال کا نتیجہ ہیں؟ کیا یہ تجاویز حب الوطنی اور بلند مقاصد کے تحت پیش کی گئی ہیں یا ذاتی مفادات کی پیداوار ہیں؟ ان تمہیدی نکات کا تقاضا پورا کرنے کے لیے میں اس تحریر کے ساتھ اپنے کیریئر کا ایک مختصر سا خاکہ منسلک کر رہا ہوں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میں اس موضوع پر اظہار خیال کرنے کی کتنی اہلیت اور کتنا تجربہ رکھتا ہوں میں نے یہ خاکہ بہت انکسار کے ساتھ لکھا ہے اور اس کا مقصد محض ایک رسمی کاروائی کی تکمیل کرنا ہے۔

۴۔ اگرچہ میں نے تیسرے حصے (''وضاحت'') میں تفصیل کے ساتھ توضیح پیش کی ہے تاہم میں یہاں بھی مختصراً یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اپنی تجاویز مرتب کرتے وقت میرے ذہن میں یہ مقاصد کارفرما تھے:

(الف) آئین کے اندر احتساب اور توازن (Check and Balance) کا ایک ایسا طریقہ موجود ہونا چاہیے جسے اس کا مناسب مقام حاصل رہے اور جو نئی آئینی مشین کی متوازن کارکردگی کی ضمانت فراہم کر سکے۔

(ب) میں نے اپنی تجویز میں کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ ضرور فراہم کیا ہے کہ ہر مکتبہ فکر میں ان میں کسی ایک نکتے میں دلچسپی لینے اور آئین سے متعلق اپنے موقف کا اظہار کرنے پر مجبور ہو سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ منصوبہ اصل اجزاء کو نقصان پہنچائے بغیر ممکنہ طور پر اختیار اور قومی خدمت کے وسیع تر امکانات کا موقع فراہم کرتا ہے۔

(ج) میں نے اس میں بہت سے سیفٹی والو (یا راہِ نکاس) رکھے ہیں تاکہ بھاپ مشین کے کسی ایک حصے میں مرتکز نہ ہونے پائے کیونکہ اس قسم کے غیر متوازن دباؤ سے اس مشین میں گڑبڑ پیدا ہو سکتی ہے بلکہ وہ اس مقام سے پھٹ بھی سکتی ہے

(د) میں نے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی ہے کہ آئین کی بقاء کے امکانات معقول حد تک موجود رہیں۔ یعنی یہ بجائے خود انتشار کا سبب نہ بننے پائے یا کوئی ایسا متنازعہ

موضوع نہ بن جائے جس کے تحت مستقبل میں سیاسی کش مکش جنم لے۔ اور یہ بھی کہ اسے وہ ہمیشہ سنگینوں اور بندوقوں کا محتاج نہ بنا رہے۔

(ہ) یہ تجاویز مرتب کرتے وقت میں نے ان ممکنہ خطوط کو پیش نظر رکھا ہے، اور ان کی پیش بندی کرنے کی کوشش کی ہے جن کے تحت مایوس سیاستدان آئین اور اسے وضع کرنے والوں کے خلاف حملہ کر سکتے ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ ہر وہ منصوبہ جس کا تعلق تقسیم اختیارات سے ہوگا۔ خاص طور پر ایک آئینی فارمولا اس پر ہمیشہ اعتراضات ہوتے رہیں گے ان پر تنقید کی جاتی رہے گی۔ اس کے باوجود آئین بنانے والوں کی ہر دانشمند جماعت کی یہ کوشش رہی ہے اور ہونی چاہیئے کہ خود آئین کے ڈھانچے کے اندر ممکنہ اعتراضات کا خاطر خواہ جواب بھی موجود ہو۔ تاکہ مستقبل میں پروپیگنڈہ کرنے والوں کو اس قسم کے الزامات عائد کرنے کی بنیاد نہ مل سکے۔ اگر میرا منصوبہ خاطر خواہ طور پر قبول کر لیا گیا تو میرے خیال میں ہم مستقبل کے تمام مفسدوں کو نہتا کر دیں گے۔

(و) میرا منصوبہ اصولوں اور ادراک دونوں پر مبنی ہے۔ اصولوں سے انحراف اور ادراک سے گریز شری اربندگھوش کی تعلیمات عالیہ کا حصہ ہے جن سے روحانی نجات تو شاید حاصل ہو سکتی ہو لیکن سیاسی نجات حاصل نہیں ہو سکتی یا جیسا کہ ایک پرانے فلسفی نے کہا ہے۔ یک من علم را دہ من عقل باید۔

(ز) مزید برآں میرا منصوبہ ایک اور امکان کی بھی پیش بندی کرتا ہے۔ یہ امر ہمارے لیے ناموافق ہے کہ ہمارا ملک جغرافیائی طور پر عالمی شارع عام پر واقع ہے۔ اس لیے دنیا کے کسی بھی حصے میں خواہ کوئی بھی تصور جنم لے رہا ہو یا کوئی بڑا واقعہ رونما ہو رہا ہو یا دنیا کے کسی دو مقامات کے درمیان حرکت کر رہا ہو تو راستے میں پڑنے والے اس گھر پر بھی اس کا اثر پڑ سکتا ہے اور یہاں بھی اس کے جھٹکے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ میں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ کم از کم کسی حد تک ہمارا آئین اس قسم کے بیرونی دباؤ کی زد سے محفوظ رہے۔

۵۔ میرے ذہن میں بعض ایسے تصورات موجود ہیں جن کے ذریعے اس آئین کو متعارف کرایا

جاسکتا ہے، مقبول بنایا جاسکتا ہے اور اسے کامیابی کے ساتھ چلایا جاسکتا ہے خاص طور سے، میرے ذہن میں یہ آئیڈیا بھی موجود ہے کہ عوام تک بادشاہت کا تصور کسی طرح پہنچایا جائے اور کس طرح ان کی رضامندی اور حمایت حاصل کی جائے۔ میں نے دانستہ طور پر اس پہلو کو یہاں نہیں چھوا ہے۔ یہ قبل از وقت اقدام ہوگا۔ یہ مرحلہ اسی وقت آئے گا جب آپ کی کمیٹی ان اصولوں کو منظور کرے گی اور جب یہ مرحلہ آیا تو میں اس فارمولے (خاص طور پر اس کا 'بادشاہت' ولا حصہ) کو عوام میں لے جانے اور کامیاب کرانے کی بیشتر ذمے داری بھی سنبھالنے کو تیار ہوں۔ جس کا میں پوری طرح اہل ہوں۔ 'سندھ کی علیحدگی کے معاملے میں، خود پاکستان کے معاملے میں اور ابھی حال ہی میں ون یونٹ کے معاملے میں یہ ذمے داری سرانجام دے چکا ہوں۔ اسی جیسی ایک اور مہم میرے لیے مشکل ثابت نہیں ہوگی۔

حصہ دوئم

میری تجاویز

(نوٹ: میں یہاں صرف چند بنیادی اصولوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ تفصیلات بحث و مباحثے کے بعد طے کی جاسکتی ہیں)

۱۔ یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ ہم صرف آئینی مشینری کو متحرک کر کے اور ایک ایسا مقناطیسی محور تخلیق کر کے جو ہر چیز میں توازن قائم کر سکے، یعنی ایک نیم آئینی بادشاہت (جس شخص کو اس کام کے لیے چنا جائے آپ اسے 'بادشاہ' یا 'امیر پاکستان' کہہ سکتے ہیں) قائم کر کے ہی کم و بیش ہمیشہ کے لیے اُلجھاووں، جھگڑوں، آئینی تعطل کے واقعات، پارلیمانی بحرانوں اور انقلابات، جوابی انقلابات اور بغاوتوں کے امکانات کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔

'مزید استدلال کے لیے براہ کرم تیسرا حصہ بعنوان 'وضاحت' دیکھیے۔

۲۔ بادشاہ کے پاس دوسرے اختیارات کے علاوہ یہ اختیارات ہونے چاہئیں۔

(الف) یہ اختیار کردہ (الف) اپنے بیٹیوں میں سے کسی کو یا (ب) باہر سے (اگر وہ اپنے کسی بھی بیٹے کو اپنا جانشین بننے کا اہل نہ سمجھے) کسی کو اپنا جانشین منتخب کر سکے۔ صرف آخر الذکر صورت میں پارلیمنٹ کی فوری منظوری حاصل کرنا ضروری ہوگا۔

(ب) اپنی کابینہ کا تقرر کرنے اور اسے توڑنے کا اختیار۔

(ج) پارلیمانی حکومت کو معطل کرنے (ان حالات کا تعین کیا جانا ہے۔ جن کے تحت اسے یہ اختیار حاصل ہوگا) کا اختیار اور یہ اختیار کہ اگر قومی سطح پر کسی ہنگامی صورت حال کا سامنا ہو تو وہ تمام اختیارات بالواسطہ یہ بلاواسطہ طور پر اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔

(تاہم پارلیمانی مشینری کو کسی ایک وقت میں ایک سال سے زیادہ عرصے تک معطل نہیں رکھا جاسکے گا)

(د) پارلیمنٹ سے خطاب کرنا اور اس کے سامنے اپنے (ذاتی) خیالات پیش کرنا۔

(ہ) پارلیمنٹ کو توڑنا، انتخابات، ضمنی انتخابات اور دوبارہ انتخابات کا حکم جاری کرنا اور دیانتدارانہ طور پر انتخابات کے انعقاد کے لیے ایک مشینری قائم کرنا۔

(و) اعلانِ جنگ کرنے اور معاہدہ امن کرنے کا اختیار۔

(ز) تمام مسلح افواج کا سپریم کمانڈر ہونے کا اختیار۔

(ح) حسبِ مرضی کابینہ کے اجلاسوں کی صدارت کرنا۔

۳۔ مذکورہ اختیارات اور خلقی اور روایتی شاہی مراعات اور اختیارات کے تحت ملک میں ایک نیم پارلیمانی طرز کی حکومت ہو۔ پارلیمنٹ کو سرکاری خزانے پر پورا کنٹرول حاصل ہو۔ اِلاّ یہ کہ بادشاہ خصوصی طور پر کوئی سفارش کرے۔ اس صورت میں پارلیمنٹ اس مطالبے پر بحث تو کرسکتی ہے لیکن اسے مسترد نہیں کرسکتی۔

(۲) وزراء کو صرف بادشاہ ان کے عہدوں سے ہٹا سکتا ہے۔ پارلیمنٹ انہیں ان کے عہدے سے ہٹانے کی سفارش کرسکتی ہے لیکن بادشاہ اس کا پابند نہیں ہوگا۔ وزراء کا انتخابات پارلیمنٹ کے منتخب اراکین میں سے کیا جائے گا لیکن بادشاہ باہر سے ماہرین کا بھی تقرر کرسکتا ہے تاہم پارلیمنٹ سے باہر ان نامزد کردہ وزراء کا تناسب ۳۳ فی صد سے زیادہ نہیں ہوگا ان وزراء کو جن کا تقرر پارلیمنٹ کے باہر سے کیا جائیگا پارلیمنٹ میں بیٹھنے اور بولنے کا حق حاصل ہوگا، لیکن انہیں ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

(۳) پارلیمنٹ کی میعاد عام حالات میں پانچ سال ہوگی لیکن پہلے ۱۲ سالوں تک یہ میعاد ۳ سال تک محدود رہے گی (تاکہ متواتر حق رائے دہی استعمال کر کے لوگ اپنے حقیقی

نمائندوں کو پہچان سکیں)۔

(۴) ملک میں کوئی صوبے نہیں ہونے چاہئیں۔ البتہ انتظامیہ کو موثر بنانے اور بعض امکانات کا تدارک کرنے کے لیے اس کے ہر بازو میں پانچ "cantons" ہونے چاہئیں، ان اکائیوں کو خالصتاً اصول تسمیہ کے اعتبار سے ریاستیں یا 'شعبے' بھی کہا جاسکتا ہے ہر "canton" کا ایک علیحدہ گورنر ہوگا۔ (بادشاہ کا نامزد کردہ) جس کی ایک ایگزیکٹو کونسل ہوگی جس کا تقرر کابینہ کرے گی اور قومی پارلیمنٹ ایک قرارداد کے ذریعے اس کی توثیق کرے گی۔ عام حالات میں گورنر اپنی ایگزیکٹو کونسل کے ذریعے انتظامی امور کو نمٹائے گا۔ بادشاہ انتظامی امور کے اصول طے کرے گا۔ گورنر اور اس کے ایگزیکٹو کونسل کے درمیان اختلافات کی صورت میں بادشاہ کا فیصلہ حتمی ہوگا اور اس کی ایگزیکٹو کونسل کے درمیان اختلاف کی صورت میں بادشاہ کا فیصلہ حتمی ہوگا اور سب اس کے پابند ہوں گے۔

(۵) ہر کنٹین کو پارلیمنٹ کے ایوان زیریں میں اپنی آبادی کی مناسبت سے نمائندگی حاصل ہوگی۔ تاہم دونوں بازوؤں کی مجموعی نمائندگی کے درمیان مکمل برابری قائم رہنی چاہیئے۔

(۶) عدلیہ آزاد ہوگی، عدلیہ کو فوری طور پر انتظامیہ سے الگ کردیا جائے گا۔ آئین میں عدالت ہائے عالیہ کی 'رٹ پاورز' کو تحفظ فراہم کیا جائے گا ججوں کا تقرر بادشاہ کرے گا۔ تاہم ایک بار تقرری کے بعد انہیں ایک خاص عمر تک پہنچنے سے پہلے ہٹایا نہیں جائے گا۔ البتہ اگر کوئی جج بدعنوانیوں یا بدنظمی کا مرتکب پایا جائے تو پارلیمنٹ منصفانہ طور پر سماعت کرنے کے بعد بادشاہ سے ملزم جج کو ہٹانے کی سفارش کرسکتی ہے پاکستان کا چیف جسٹس پارلیمنٹ کے کسی بھی ایوان کے اجلاس میں بیٹھ سکے گا۔ اور اس سے خطاب کرسکے گا لیکن اسے ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

۷۔ آئین میں کوئی ترمیم نہیں کی جاسکے گی، البتہ ایک ریفرنڈم کے ذریعے جس میں تمام بالغان اپنی رائے دیں گے ترمیم کی جاسکے گی۔ ریفرنڈم کرائے یا ریفرنڈم نہ کرانے کا اختیار بہرحال بادشاہ کو حاصل ہوگا۔

۸۔ اگر کسی انتخابی جماعت سے تعلق رکھنے والا منتخب رکن یعنی میعاد پوری کرنے سے قبل اپنی جماعت تبدیل کرے گا تو اسے اس کی نشست سے محروم کردیا جائے گا۔ تاہم وہ دوبارہ الیکشن

لڑ سکے گا۔

۹۔ سرکاری ملازمتوں میں رہنے والا کوئی بھی فرد خواہ اس کی ملازمت برقرار ہو یا وہ ریٹائر ہو چکا ہو؟ کسی بھی وقت کسی سیاسی یا انتخابی عہدے کا اہل نہیں ہوگا (استدلال کے لیے تیرا حصہ بعنوان 'وضاحت' دیکھئے)

۱۰۔ سرکاری ملازمتوں سے تعلق رکھنے والے افراد جن میں گورنر اور ان کی ایگزیکٹو کونسلز کے اراکین بھی شامل ہیں، کی طرف سیاسی معاملات میں ملوث ہونا خلاف قانون فعل قرار پائے گا۔

۱۱۔ پارلیمنٹ کے دو ایوان ہوں گے (الف) سینٹ (ب) ایوان نمائندگان۔ ان کی ہیئت ترکیبی اس طرح ہوگی۔

(الف) سینٹ (بنیادی طور پر ایک توثیق کنندہ اور نیم نگراں ادارہ) ایوان زیریں میں منظور کردہ تمام قوانین اس کے پاس آئیں گے اور وہ ان پر بحث کریگی یہ کسی قانون پر نظرِ ثانی کرنے، اس میں ردو بدل کرنے حتیٰ کہ مسترد کرنے کی سفارش بھی کر سکتی ہے اور اسے ایوانِ زیریں کو واپس بھیج سکتی ہے تا کہ وہ اس پر مزید غور و خوض کر کے کوئی حتمی فیصلہ کر سکے۔ اس قسم کے امور دوسری بار سینٹ کے سامنے پیش نہیں کئے جائیں گے سینٹ اپنے طور پر مجلس قانون ساز کے منظور کردہ کسی اقدام کو مسترد نہیں کر سکے گی اور وہ نہ اس میں ترمیم یا اس پر نظر ثانی کر سکے گی البتہ مجلس قانون ساز ایوان زیریں سفارش مرتب کر کے ایوانِ زیریں سے رجوع کر سکے گی۔ جو حسبِ منشا اس اقدام کا تعین کر سکے گی سینٹ کی ہیئت ترکیبی مندرجہ ذیل ہے۔

مجموعی رکنیت ۱۰۰ (ہر Canton) آٹھ اراکین منتخب کرے گا۔ باقی بیس اراکین کو بادشاہ نامزد کرے گا۔ جو مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے قابل اور ممتاز افراد پر مشتمل ہوں گے۔

میعاد: چھ سال۔ لیکن ہر سال تین سال بعد منتخب اراکین میں سے ۵۰ فی صد اراکین ریٹائرڈ ہو جائیں گے اور اگر وہ چاہیں تو دوبارہ الیکشن لڑ سکیں گے

(ب) ایوان نمائندگان (ہماری آبادی اس وقت دس کروڑ کے لگ بھگ ہے دس لاکھ کی آبادی پر چار اراکین کی تعداد کو بہت بڑی تعداد نہیں کہا جا سکتا مزید برآں، نکاس کی جتنی زیادہ

راہیں ہوں گی یا جتنے زیادہ سیفٹی والوز ہوں گے داخلی بے چینی کے امکانات اسی قدر کم ہوں گے)

مجموعی رکنیت: ۴۰۰ (۲۰۰ مغرب: ۲۰۰ مشرق سے۔ اس تعداد کو آبادی کے مطابق Cantons میں تقسیم کیا جائے گا)

میعاد: پہلے بارہ سال کے دوران تین سال اور اس کے بعد پانچ سال۔

اختیارات: قانون سازی اور مالیات امور سے متعلق تمام تر اختیارات، لیکن مندرجہ بالا اصولوں کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے۔

(۱۲) مجلسِ شوریٰ کے نام سے علماء کا ایک چھوٹا سا ادارہ متعلق بہ قوانین ہوگا (جس کے اراکین کی تعداد تین سے زیادہ نہ ہوگی۔ جو بادشاہ کو تمام مذہبی معاملات میں مشورے فراہم کرے گا۔ ان تین اراکین میں سے ایک سنی، ایک شیعہ اور ایک عربی زبان کا ممتاز عالم ہوگا۔

(۱۳) اقلیتوں کے لئے بھی ایک کمیشن قائم کر یا جائے گا (جس میں دو ہندو اراکین، ایک رومن کیتھولک ایک پروٹسٹنٹ اور ایک دوسری مذہبی برادرویوں کا نمائندہ شامل ہوگا) یہ کمیشن بادشاہ کو اقلیتوں کی بہبود سے متعلق امور کے بارے میں مشورے فراہم کرے گا۔

(۱۴) بادشاہ کو ایک پریوی کونسل قائم کرنے کا اختیار ہوگا جس سے وہ حسب منشاء ایسے امور پر مشورہ طلب کرسکتا ہے جو اس کے خیال میں وسیع تر مشاورت کے متقاضی ہوں۔ مثال کے طور پر:

(الف) قومی سلامتی۔ جنگ اور امن۔

(ب) جانشینی

(ج) کشمیر اور جونا گڑھ

(د) سماجی اصلاحات

(ہ) آئین پر نظر ثانی وغیرہ وغیرہ

پریوی کونسل کے اراکین بادشاہ کے نامزد کردہ ہوں گے لیکن توقع کی جاتی ہے کہ انتخاب کرتے وقت وہ قومی صلاحیتوں، دانش، تدبر، تجربے اور علم کو مجتمع کرنے اور ان سے پورا فائدہ اٹھانے کے مقصد کو پیش نظر رکھے گا۔ پریوی کونسل کی ہیئتِ ترکیبی کم وبیش مندرجہ

ذیل ہوگی۔

(الف) مسلح افواج کے تینوں سربراہان۔

(ب) وزیراعظم

(ج) چیف جسٹس

(د) سب سے سینئر گورنر

(ہ) میرے تجویز کردہ مختلف کمیشنوں کے صدور.....مزید برآں، قومی منصوبہ بندی اور سروسز کمیشن کے صدور

(و) کشمیر کی آزاد حکومت کا صدر

(ز) پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے صدور بہ اعتبار عہدہ

(ح) پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے قائدین بہ اعتبار عہدہ

حزب اختلاف

(ط) شہزادوں اور حکمران سرداروں میں سے ایک ایک سے زائد افراد۔

(ی) چار سینئر وکلاء جو بار کے لیڈر رہوں۔

(ک) ایک ممتاز ماہرِ تعلیم

(ل) ایک ممتاز صنعت کار

(م) شعبہ تجارت کا ایک ممتاز فرد

(ن) وہ 'بزرگ مدبرین' (مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ممتاز افراد نامور علماء اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے تسلیم شدہ ماہرین) جو بادشاہ کے خیال میں اسے اپنی زندگی کے نچوڑ عمیق مطالعے، تجربے اور دانشورانہ ثمرات کی روشنی میں مشورے دے سکتے ہیں ان کی تعداد کا تعین کرنے کا اختیار بادشاہ کو ہوگا۔

(۱۵) قومی آہنگی کے بارے میں ایک کمیشن بہ قوانین ہوگا۔ اس کے فرائض حسب ذیل ہوں گے۔

(الف) ایسے طریقے وضع کرنا جن کے ذریعے قوم میں تفرقہ ڈالنے اور اس کی ہم آہنگی کو نقصان

پہنچانے والے عوامل (جیسے، صوبائیت، علاقائیت، مذہبی اختلافات وغیرہ وغیرہ) کا تعین کیا جاسکے اور ان کا موثر طور پر خاتمہ کیا جاسکے۔

(ب) ایک ایسے ٹریبونل کے فرائض ادا کرنا جو قانون شکنی کے اقدامات پر بلا واسطہ طور پر سزائیں دے سکے مناسب مرحلے پر اس کمیشن کے لیے ایک تفصیلی چارٹر وضع کیا جاسکتا ہے۔

حصہ سوئم *

میری سفارشات کا اوّلین عنصر بادشاہت کا قیام ہے۔ میرے دلائل درج ذیل ہیں:

i۔ صرف ایک بادشاہ کو میعادِ اقتدار کا واضح، غیر مشکوک اور لامحدود تحفظ حاصل ہوسکتا ہے۔ اور وہ اس تقدس سے بھی مشرف ہوتا ہے۔ جس کا دعویٰ ایک قوم کی خود مختاری کی مجسم شکل اور ایک انسانی علامت کرسکتی ہے۔ ایسے بادشاہ کو ہی اتنی طاقت، وقار، عالمی قبولیت عامہ اور اختیار حاصل ہو کہ وہ گذشتہ ۱۴ سال کے انتشار کو مستقل نظم میں تبدیل کرسکے۔

ii۔ ایک مستقل بادشاہ کا وجود ــــ کم از کم ایک خاص سطح سے اوپر حکومتوں اور انتظامیہ کے تسلسل کی ضمانت دے گا اور ایک خاص حد تک قومی اور بین الاقوامی سطح پر حکومت کی پالیسیوں کے دوام کا ضامن ہوگا۔

iii۔ اگر کوئی صدر سربراہِ مملکت ہے تو اسے کسی نہ کسی شکل میں معزول کرنے کے لیے کوششیں جاری رہیں گی اور استحکام قطعاً حاصل نہ ہوگا۔ ایک صدر کو قبل از وقت بھی نہ ہٹایا جائے تب بھی وہ پانچ سال یا ۱۰ سال سے زیادہ برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتا۔ نہ ہی صدر کی شخصیت یا اقدامات کو ایک تقدس حاصل ہوگا۔

iv۔ بادشاہت کا تصور ہمارے عوام کے ذہنوں میں گہرے طور پر راسخ ہے کیونکہ ہمارے ماضی میں اس سے وابستگی بڑی طویل رہی ہے اس میں جذباتی کشش بھی ہے۔ شان و شوکت بھی ہے یہ عوام کو ایک تحفظ کا خاص احساس بھی دے گی۔ ایک نیا ولولہ اور نئی امید کو بھی جنم دے گی۔

---

*ہفت روزہ 'معیار'، کراچی، جلد ۹، شمارہ ۱۳، ۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ء تا ۶ جنوری ۱۹۸۴ء

بادشاہت رائج کرنے سے ہم اپنے ملک میں سربراہِ مملکت کے عہدے کے لیے عزت اور وقار کے احیاء کے قابل ہوسکیں گے۔ دعا دیجیے سابقہ گورنر جرنلوں اور صدور کے رویّے اور اقدامات کو کہ صدر کی 'کہ' اصطلاح ہی ایک شخص کے ذہن میں سازشوں کی یاد تازہ کر دیتی ہے جن میں سیاسی ہتھکنڈے۔ حکومت بنانا توڑنا اور اس قسم کی کئی ناگوار حرکتیں شامل ہیں۔

بادشاہت ماضی (برصغیر میں مسلمان سلطنت) اور پاکستان کے درمیان ایک براہِ راست رابطہ (ثقافتی تاریخی و روایتی) فراہم کردے گی۔ دوسرے لفظوں میں برصغیر میں مسلم ورثے کا تسلسل پھر عمل میں آجائے گا۔ صرف یہ ناقابلِ تبدیل بڑا ڈھانچہ قائم کرکے ہم مستقبل میں انقلابات۔ جوابی انقلابات۔ بغاوتوں اور سازشوں کے خطرات کا مؤثر مقابلہ کرسکیں گے۔ ایک قوم جو ایک بار انقلاب کا تجربہ حاصل کرے شیر کے اس بچے کی طرح ہوتی ہے، جو خون کا مزا پہلی بار چکھتا ہے۔ جب تک انقلاب کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس وقت تک عوام یہ خیال نہیں کرتے کہ پھانسی کے تختے پر لوئیس شانزدہم چڑھتا ہے یا ربیری۔ وہ ہر شخص کو اس کے عبرت ناک انجام سے دوچار ہونے تک زندہ باد کے نعرے لگاتے رہتے ہیں۔

ایک بادشاہ جب مسندنشین ہوگیا تو اس کا کسی صوبے سے تعلق نہیں رہے گا اور وہ صدر کے برعکس کسی صوبے سے وابستہ نہیں ہوگا اور اس طرح صوبوں کے درمیان رقابتیں نہیں ہوں گی۔ اسی طرح کسی ایک صوبے کی طرف اس حکومت کے خلاف کوششیں بھی نہیں ہوں گی۔ جسے وہ دوسرے صوبے کے نمائندوں کی اکثریت پر مشتمل سمجھتا ہے۔ (اس رجحان نے پاکستان کی سیاسی زندگی کو متاثر کیا ہے اور ملک میں صوبائیت اور عصبیت کو جنم دیا ہے) اگر بادشاہ کی جگہ ہمارے ہاں صدر ہوگا تو جن صوبوں سے اس کا تعلق نہ ہوگا ان کی کوشش رہے گی کہ وہ اس کو معزول کریں اور اس کی جگہ اپنے کسی شخص کو تخت پر بٹھائیں۔ اس لیے نہیں کہ یہ تبدیلی پاکستان کے لیے بہتر ہوگی بلکہ صرف اس لیے کہ اس سے ان کی صوبائی انا کی تسکین ہوگی۔

اگرچہ اس موقع پر میں اپنے اس نکتے پر زیادہ زور نہیں دوں گا۔ میں بادشاہت کے قیام میں نام نہاد پختونستان کے ٹینٹ کا مستقل اور بے ضرر خاتمہ بھی دیکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں زیادہ تر امور کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ ہم بادشاہ کسے مقرر کرتے ہیں۔ دانشمندانہ طور پر عمل کرکے ہم کابل کا منہ بھی مستقل طور پر بند کرسکتے ہیں۔

اپنے حالیہ ماضی سے ایسے نمایاں ترکِ تعلق کے بعد ہی ہم اس برائی کا خاتمہ کر سکتے ہیں جو اندر ہی اندر قوم کی توانائیاں کھا رہی ہے۔ یہ برائی 'نک چڑھا پن' ہے جس نے ہمارے عوام کے ذہنوں کو مکمل طور پر گرفت میں لے رکھا ہے لیکن بدقسمتی سے اس کا ادراک صرف ایک تجربے کار آنکھ ہی کر سکتی ہے۔ یہ نتیجہ ہے متواتر بے یقینیوں کا، حکومتوں اور نظام ہائے حکومت میں تیز تیز تبدیلیوں کا۔ حکمرانوں اور رہنماؤں کی طرف سے مسلسل عہد شکنی کا۔ عوام سے کیے گئے وعدوں کی بے وقعتی کا۔ وقتاً فوقتاً عوام کے ذہنوں میں پیدا کی گئی امیدوں کے پورا نہ ہونے کا۔ موقع پرستوں کے مختلف قوموں، جماعتوں اور گروہوں کے درمیان اقتدار کے لیے لامتناہی اور مہلک تنازعوں کا دستوروں کے عدم دوام کا، قریباً تیرہ سال تک ایک خلاء میں گزرنے والی زندگی کا۔ قوانین کی بڑھتی ہوئی سختیوں، جرمانوں اور تکالیف میں اضافے کا۔ حکمرانوں میں اعتبار کے فقدان کا۔ اور اس حقیقت کا کہ وہ روزمرہ کے اخراجات میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ کہ بقا کی جدوجہد دشوار تر ہوتی جا رہی ہے۔

اس طرح سے انتہائی نک چڑھی ذہنی حالت کو پہنچائی گئی قوم حکمران کو تعمیر اور ترقی کے لیے بڑی پُرفریب بنیاد فراہم کرتی ہے۔ یہ نک چڑھا پن اس وقت انتہائی بلند ہو جاتا ہے۔ جب ہر شخص حکمران کے بارے میں ایک ہی طرح سے سوچنے لگتا ہے اور اس حقیقت کو قطعی نظر انداز کر دیتا ہے کہ کچھ توقف کر کے دیکھ لینا چاہیے کہ یہ شخص ولی ہے یا شیطان ہے۔

پاکستان کی گذشتہ ۱۲ برس کی تاریخ پر ایک ہلکی سی نظر اس تاثر کو کافی حد تک اجاگر کر دے گی۔

خواجہ ناظم الدین کو بڑی محبت سے ناظمِ ملت کہا جاتا تھا۔ اور اس ناظمِ ملت کو برطرف کر کے غلام محمد نے محافظِ ملت کا خطاب حاصل کر لیا۔ (باقاعدہ تقریب کے ذریعے یہ خطاب دیا گیا۔ اور جیسا کہ توقع تھی بڑی جھجک کے ساتھ قبول کیا گیا) ناظمِ ملت عزتِ نفس کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے لیکن چونکہ وہ اقتدار کی مسندِ اعلیٰ سے لٹ رہے تھے۔ اس لیے ان پر دشنام طرازی کی گئی۔ ان پر زیادہ مرغ خوری کا الزام بھی عائد کیا گیا۔

محمد علی اوّل (محمد علی بوگرہ) وزارتِ عظمیٰ کے مسند پر ڈرامائی رونق افروزی کے بعد قوم کی جواں قوت کی علامت بن گئے اور ان کی اپنی محبوب قوم کے نام پہلی تاریخ کی نشری تقریر بڑے پُرجوش مدح کے ساتھ سنی جاتی تھی۔ جبکہ فضل الحق جیسے محبِ وطن افراد کو 'غدار' قرار دینے کے لیے ان کا

فیصلہ کافی تھا۔لیکن جب وہ اقتدار کے چکنے کھمبے سے اچانک پھسل گئے انہیں ایک اچھے تعزیت نامے کا مستحق بھی سمجھا گیا۔

ان کے جانشین محمد علی دوم جنہوں نے ۱۹۵۶ء کا آئین بنایا تھا۔ برصغیر ہندو پاک کی مقدس تثلیث میں شمار کیے گئے باقی دو محمد علی جناح اور مولانا جوہر تھے (اللہ ان پر رحمت کرے) لیکن جب اسکندر مرزا نے عیار لومڑی کی طرح انہیں وزارتِ عظمیٰ کی چوٹی سے نیچے اتار دیا تو لوگوں نے انتہائی تن آسانی سے انہیں اپنے ذہنوں سے نکال دیا بہی خواہوں نے انہیں 'ناکارہ ضعیف' قرار دیا۔ جب کہ ناسپاس لوگوں نے ان پر سیدھے سیدھے 'ولی صورت منافق' کا الزام لگا دیا۔ان کے جانشین جناب سہروردی کی پُرشکوہ مسندنشینی کو دیوتاؤں کے زمانے کی واپسی سمجھا گیا عالمی امن کی حمایت میں انہوں نے بین الاقوامی اسٹیج پر جو ڈرامہ کھیلا، اس کی تعبیر کچھ ایسے کی گئی جیسے آسمان روزہ میں مبتلا ہے۔اور قیادت سے محروم اور بے تاب انسانیت کی فلاح کے لیے ایک نیا پیغمبرِ امن پیدا ہونے والا ہے وزارتِ خارجہ کے ایک اعلیٰ افسر جو آج کل ہمارے محترم سفیروں میں سے ہیں (۱۹۵۷ء میں میری منیلا روانگی سے کچھ روز قبل دورانِ گفتگو) اس امر پر مجھے قائل کرنے میں بڑی زحمت اٹھا رہے تھے کہ انہوں نے خود ذاتی طور پر اس عظیم مدبر کو اس وقت مصروفِ عمل دیکھا تھا۔ اور اسی وقت اس دیوتا کا روپ پہلی بار انہیں نظر آیا۔لیکن چار ماہ بعد جب سہروردی پاکستان کے جیالے شکاری کے جال میں پھنس گئے، تو یہ راز کھلا کہ پیغمبرانہ لبادے درحقیقت ایک راسپوتین صغیر کو چھپائے ہوئے تھے۔جن کو زندگی کے بعض حصوں کا ذکر بھی ایک مہذب عوامی دستاویز میں نہیں کیا جا سکتا۔

سہروردی کے تاج کے وارث ملک فیروز خان نون تھے جب قسمت نے ان کی یاوری کی تو حسبِ توقع انہیں فاتح گوادر کے لقب سے نوازا گیا (تحسین باہمی کے عالم میں انہوں نے بھی ہر کس و ناکس پر ہلالوں، نشانوں، تمغوں، تلواروں کی بارش کر دی۔نوازشات پانے والوں میں وہ خود اور ان کی بیگم بھی شامل تھیں۔کلرکوں اور چپراسیوں کا تو ذکر ہی چھوڑیئے) لیکن جلد ہی قسمت نے قلابازی کھائی اور انہیں اتنا وقت بھی نہ ملا کہ وہ اپنے مداحین کے ہاتھوں ایک سیاسی مفلس کی تدفین کا شرف بھی حاصل کر سکتے۔

آخر میں پاکستان کی قسمت کے سب سے بڑے صناع میجر جنرل اسکندر مرزا بھی اپنے

کیفرِ کردار کو پہنچے وہ امریکی معیار کے مطابق پاکستان کے مردِ آہن تھے اور ثقافتی اوزان و پیمائش کے نظام کے اعتبار سے 'پاکستان کے نجات دہندہ' تھے۔ ۷/اکتوبر ۱۹۵۸ء تک وہ پاکستانی سیاست دانوں کے مربی تھے اور ملک کے تمام سیاسی راستے ان کے محل کی طرف جاتے تھے۔ ۸/اکتوبر ۱۹۵۸ء یعنی مارشل لاء کی صبح انہیں فی الحقیقت پاکستانی سیاستدانوں کے پنجوں سے قوم کو نجات دلانے والے پہلے اور آخری مسیحا کا رتبہ دیا گیا۔ اسی پر بس نہیں۔ ملک کے آزاد اور ایماندار اخبارات کی طرف سے صرف اس حقیقت کا اعتراف جب کافی نہ سمجھا گیا تو سول سروس کے رہنما اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے پہنچے۔ کراچی کی انتظامیہ نے اس مسیحا کو خراجِ تحسین اور سلامی پیش کرنے کے لیے عظیم الشان 'مزدور ریلی' منعقد کی۔ لیکن بیس روز بعد تختے الٹ گئے اس تاریخی صبح وہی لوگ اٹھے تو انہیں یہ خبر ملی کہ ان کا نجات دہندہ اپنے 'مسندِ نجات' سے معزول کر دیا گیا اور کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوتے دیکھا گیا۔ اس وقت ان کا فوری ردِعمل یہ تھا کہ اسے جانے کی اجازت دینے سے پیشتر انہیں اس کی ناجائز دولت کا حساب تو لے لینا چاہیے تھا۔ یہ رائے جس بے ساختگی سے سامنے آئی، اس سے اندازہ ہوا کہ اس کی مداح قوم ہمہ وقت حرفِ احتجاج لب پر لائے بغیر اس نجات دہندہ کی بیک وقت روحانی اور دنیوی جبلتوں کا تماشہ بھی دیکھتی رہی ہے اور اپنے آزادانہ پروگرام میں بھی مصروف رہی ہے۔

مجھے مرغوں کی لڑائی کا زیادہ تجربہ تو نہیں ہے لیکن اس پر جوا کھیلنے والے میرے خیال میں اپنے اڈے والوں سے اس سے کہیں زیادہ دیرپا محبت کرتے ہوں گے جو ہماری قوم کو اپنے حکمرانوں اور رہنماؤں سے رہی ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات میں واضح کر دوں۔ میرا یہ نقطۂ نظر تو ہے کہ یہ صورتِ حال ایک ذہنی ابتلا کا عکس پیش کرتی ہے۔ (جس کے بارے میں میں نے ابھی کہا کہ یہ مایوسی، اداسی اور عہد شکنی کے مسلسل دور کا نتیجہ ہے) میں پاکستان کے عوام کی قدرتی صلاحیتوں اور ناقابلِ شمار اہلیتوں کے بارے میں ذرا سا شک بھی نہیں رکھتا۔ مجھے یاد ہے کہ قائدِ اعظم نے ایک بار ہمارا قومی کردار یوں بیان کیا تھا۔ 'آپ کو یہ لوگ مختلف مراحل سے گزرتے نظر آئیں گے۔ اولاً آپ انہیں ناامیدی کی حد تک 'سست' پائیں گے پھر ایک روز آپ پر انکشاف ہوگا کہ وہ اچانک چست ہو گئے ہیں۔ اور آخراً اگر آپ انہیں اسی سطح پر رکھنے کی تکنیک سے آگاہ نہیں ہیں۔ وہ آپ پر ایک 'مست' (ہاتھی)

کی طرح ٹوٹ پڑیں گے۔

قائداعظم نے بالکل درست کہا تھا۔ یہ ہر اس واقفِ حال کا تجربہ ہوسکتا ہے جو عوامی نفسیات سے آگاہ ہے کہ عوام جس قدر خاموش اور بے حس ہوں گے دھماکے کا خطرہ اتنا ہی نزدیک ہوگا۔ میں اپنی بات کہنا چاہوں گا کہ میں درست تھا یا غلط۔ پاکستان کے عوام سے رابطہ قائم کرنے میں ہمیشہ یہ بنیادی امر سامنے رکھا کہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس اَن پڑھ، بے تعلق، خاموش لوگ جنہیں ہم قصبوں میں دھوپ سینکتے دیکھتے ہیں یا جو ہمارے دیہات اور صحراؤں میں استبدادِ زمانہ کا شکار ہیں۔ جو رام اور راون کو ایک ہی طرح سلام کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ سوچنا انتہائی خطرناک ہے کہ وہ نہ سوچ سکتے ہیں نہ محسوس کر سکتے ہیں۔ نہ مزاحمت کر سکتے ہیں نہ بغاوت کر سکتے ہیں اور وہ سیاسی طور پر بیوقوف بنائے جانے اور بیوروکریسی کی شعبدہ بازیوں کا موزوں ہدف ہیں۔ ان سے معاملت کرتے وقت میں نے تاریخ کے بعض نمایاں حقائق پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ پاکستان دس برس سے کچھ زیادہ عرصہ پیشتر میدانِ جنگ میں نہیں۔ سیاسی سطح پر۔ گولیوں اور بندوقوں سے نہیں (کیونکہ مسلمانوں کے پاس وہ تھیں ہی نہیں) بلکہ پاکستان ان بے حس اور اَن پڑھ عوام نے اپنے ووٹ کے باشعور استعمال کے ذریعے ہی حاصل کیا تھا۔ بلاشبہ ان کے ظاہر نے ہمیشہ دھوکا دیا ہے۔ ناتجربہ کار آنکھ کو وہ ہمیشہ پیدائشی باربردار جانور لگے ہیں۔ جنہیں چند سکّے دکھا کر کسی دلدل یا پہاڑ میں دھکیلا جاسکتا ہے انگریزوں نے یہی سوچا تھا ہندوؤں نے اسی بنیاد پر اپنی حکمتِ عملی مرتب کی۔ لیکن جب نازک موقع آیا اور ان جانوروں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو انہوں نے دولتیاں مارنا شروع کر دیں تو انگریز اور ہندو دونوں ہکّا بکّا رہ گئے۔ وہ یہ جان کر انتہائی خوفزدہ ہوگئے کہ جب یہ باربردار جانور انتہائی خاموش تھے۔ اس وقت ان کی مزاحمت سب سے زیادہ گہری تھی۔ یہ مزاحمت پاکستان کے حصول کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی۔ مزید برآں بیس لاکھ مردوں، عورتوں اور بچوں کو اپنی برسوں سے رکی ہوئی تلخی کے دیئے بغیر واقعتاً جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ یہ وہی تسلسل ہے۔ وہی آتش گیر انسانی مادہ ہے جس سے ہمیں اپنی سیاست کے دوران وقتاً فوقتاً معاملہ کرنا پڑتا ہے۔

ایک اور نکتے نے بھی اس سلسلے میں میرے ذہن کو اتنا ہی متاثر کیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان کے سلسلے میں یہ لوگ زیادہ طلب کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ خود اپنے لوگوں اور اپنے

محسنوں سے انہوں نے غیروں کی نسبت برا سلوک کیا ہے۔ حسینؓ کو شہید کر دیا گیا۔ یزید کو خلیفتہ المومنین قبول کر لیا گیا۔

اپنے سنجیدہ پس منظر کی روشنی میں اس اصول پر عملدرآمد میں نے مناسب سمجھا کہ کرے تو بھی ڈرے نہ کرے تو بھی ڈرے۔ پاکستان کے سیاسی اقتدار کے چکنے کھمبے میں سب سے چکنا حصہ یہی ہے۔

میری تحقیق یہ رہی ہے کہ کلبیت جو (نک چڑھا پن) محصور ذہانت اور متاثرہ حساسیت کی ایک انتہائی شکل ہے۔ اسے مکمل قومی بے حسی سے تعبیر نہیں کرنا چاہیے۔ کلبی ذہنیت کا حامل شخص جنون کی حد تک حساس ہوتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ اسے اپنے قیمتی خیالات کے اظہار کا موقع نہیں مل رہا ہے اور جان بوجھ کر اس سے غلط سلوک کیا جا رہا ہے وہ اپنے گردوپیش پر اعتبار ختم کر دیتا ہے اور 'مجھے کیا' کا رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن یہ اس کے ذہنی عمل میں نہ صرف ایک وقت مرحلہ ہے۔ یہ ایک طرح کا زخمی شیر ہے جو سر راہ اپنے شکار کرنے والے کو گرفت میں لینے کا منتظر رہتا ہے۔ جب اسے موقع ملتے تو وہ جوابی حملہ کرتا ہے، اپنے مصائب کی جڑ کو تباہ کر دیتا ہے اور مستقلاً اپنی اداسی کے سبب کو نیست و نابود کر دیتا ہے وہ ایک جنونی کی شدت سے قدم اٹھاتا ہے۔

ذہنی طور پر بحالی اور جذباتی طور پر احیا کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا نقطۂ نظر اور آئینی فارمولا ایسا ہو کہ اس سے عوام پر نئے آفاق کھلیں اور ان کے ذہنوں میں اکبر، اورنگ زیب، سراج الدولہ اور ٹیپو کے زمانے کی یادیں تازہ ہوں۔

مستقبل کا امیر پاکستان ہی ان کے شاندار ماضی سے ان کا گمشدہ رابطہ فراہم کر سکتا ہے۔

سرکاری ملازم اور سیاست

میں نے یہ تجویز کیا ہے کہ سرکاری ملازموں کا سیاسی میدان میں داخلہ مستقل طور پر ممنوع قرار دیا جائے اس کے اسباب درج ذیل ہیں:

(الف): مستقل سرکاری ملازموں پر سیاسی خواہشات کے دروازے مستقل کھلے رکھنے سے ان کا نقطۂ نظر ابتدا ہی سے بدل جاتا ہے۔ وہ سیاست کے بارے میں لاتعلقی، عدم دلچسپی ختم کر دیتے ہیں۔ ان کا رویہ معروض اور صحت مند نہیں رہتا۔ ان کی رائے دھندلا جاتی

ہے۔ وفاداریاں دہری ہو جاتی ہیں۔ ان کے مقاصد تاریک ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے کام پر توجہ مرکوز نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ اعلیٰ خواہشات اور بڑی امیدیں ان کے ذہن میں خلل ڈالتے رہتے ہیں۔

(ب): سیاست بالکل ہی مختلف میدان ہے ایئر کنڈیشنڈ دفتروں کے لوگ جنہوں نے ہمیشہ ایک محدود پس منظر میں زندگی گزاری ہے اور جن کی سیاست میں کوئی بنیاد اور تربیت نہ ہو۔ جنہوں نے ایک تنگ کمرے سے زندگی کو دیکھا ہو۔ جنہوں نے سیاسی تحریکوں کی دشواریوں کا مزا نہ چکھا ہو۔ جنہیں عام ذہنوں کو سمجھنے اور جاننے کی خاص تکنیک کی نزاکت کا تجربہ نہ ہو وہ ملکی نقطۂ نظر سے اس سے زیادہ صحت منداور خوشگوار نتائج برآمد نہیں کر سکتے جو غلام محمد کی گورنر جنرل نے اسکندر مرزا کی صلاحیت نے ــــ اور چوہدری محمد علی کی وزارتِ عظمیٰ نے پیدا کیے۔

(ج): یہ سچ ہے کہ ملک کی سیاسی زندگی ابتدا سے ہی قحط الرجال کا شکار ہے۔ جبکہ پرانی قیادت رخصت ہو رہی تھی اور نئی سیاسی قیادت کو ابھرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ گذشتہ ۱۴ سال کی تنازعات نے اسے مزید ضعیف کر دیا تھا۔ سیاست میں شامل خطرات اس حد تک تہہ در تہہ ہو گئے تھے کہ عوامی زندگی آنے والے دنوں میں اچھے لوگوں کے لیے کوئی کشش پیدا نہ کر سکی۔ یہ سب بجا۔ لیکن اس کا علاج اس امر پر نہیں تھا کہ سیاست میں مستقل سرکاری ملازمین کا داخلہ ہو سکے۔ کسی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ ہسپتالوں میں آپریشن تھیٹروں کے سربراہ اس بنیاد پر بن جائیں کہ ملک میں تربیت یافتہ سرجن نہیں ہیں۔ اس کے لیے تو یہ ضروری ہوگا کہ نئے لڑکوں کو لایا جائے جو سرجری کی تعلیم حاصل کریں اور یہ بھی یقین نہیں ہے کہ سرکاری ملازمت میں ہمیشہ ہی اچھے انسان آگے رہیں گے۔ ہمارے نوجوانوں میں راتوں رات امیر بننے کا لالچ پہلے ہی شروع ہو چکا ہے۔ صنعت تجارت اور ٹیکنالوجی میں زیادہ کشش ہے۔ اور ہمارے معاشرے کے اعلیٰ ذہن پہلے ہی اس طرف مائل ہو رہے ہیں۔ سرکاری ملازمت میں مشکلات مشاہدے کی نسبت زیادہ ہوتی ہیں اور ریٹائرمنٹ کی عمر میں پانچ سال کے اضافے کے بعد تیزی سے ترقی کے امکانات بھی

کافی متاثر ہو گئے ہیں۔

(د): اس لیے سیاست کی صحت مندی اس امر میں ہے کہ دونوں شعبوں کے لوگ اپنی اپنی کدورتوں کا تبادلہ نہ کریں۔

صوبائیت۔عصبیت*

اس تازیانے کے مقابلے کے لیے میں نے اپنی تجاویز میں کچھ گنجائشیں رکھی ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں ہمیشہ کچھ خاص نظریات رکھے ہیں جو میں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔ تاکہ میری متعلقہ سفارشات کا پس منظر واضح ہو سکے۔

اگر خدانخواستہ کبھی پاکستان ٹوٹتا ہے اور عالم اسلام ایک اور سقوطِ غرناطہ کا منظر دیکھتا ہے تو اس کے اسباب یہ ہوں گے۔

i۔ صوبائیت:۔اور

ii۔ پاکستانیوں کی موجودہ نسل کی طرف سے اس مسئلے پر معاملت کرتے وقت اعتبار اور ذہانت کا فقدان۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان میں صوبائیت اپنی خام ترین شکل میں موجود ہے اس سے انکار اگر کرتے ہیں تو یہ تین عناصر:

(۱) اندھے اور ذہنی طور پر معذور۔ (۲) منافق اور (۳) صوبہ پرستوں میں دغاباز ترین۔

ہر وہ شخص جسے قدرت نے ذہانت اور بصیرت ودیعت کی ہے۔ وہ اس ناسور کے وجود کو آسانی سے محسوس کر سکتا ہے اور اس کی تیزی سے پھیلتی تقسیم کے خطرے کا احساس بھی کر سکتا ہے۔

اگر صداقت کا اظہار کیا جائے اور کوئی شخص ان کی جڑ تک پہنچنا چاہے۔ ہماری ۸۰ فیصد تحریکیں اس مہلک بیماری کا ظہور ہوتی ہیں۔ میں نے جس طرح اس کی تباہ کاریاں دیکھی ہیں اگر ان کی مکمل تصویر کشی کرنے لگ جاؤں تو مجھے پاکستان میں کوئی مقام ایسا میسر نہیں آئے گا جہاں میں چین سے زندگی گزار سکوں۔

---

* ہفت روزہ 'معیار'، کراچی، جلد ۹، شمارہ ۱۴، ۴ تا ۱۳ جنوری ۱۹۸۴ء

سب سے اہم سوال یہ رہا ہے کہ اس کی بیخ کنی کیسے کی جائے اور بہت زیادہ تاخیر ہو جانے سے پیشتر ایک متحدہ قوم کی تشکیل کے لیے راہ کیسے ہموار کی جائے۔

کیا یہ اس بیماری کے وجود سے یکسر انکار کر کے ہی کیا جا سکتا ہے یا یہ ان طاقتور صوبہ پرستوں کے ذریعے ہو سکتا ہے جو کسی ایک گروہ یا تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے کا گلا دبانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یا پھر اپنے سخت بھدے اور تنہا پسندانہ طریقوں سے 'قوم پرستی' کے اپنے تصوراتی نسخے استعمال کرتے ہیں۔ یہ نسخے غلط سوچ پر مبنی ہیں بے وقت ہوتے ہیں۔ غیر حقیقت پسندانہ، خالی از تصور اور موقع پرستانہ ہوتے ہیں۔ ردِعمل کے طور پر ان میں صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی کج فکری کے شکار لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں اس زہر کو نیچے اتار سکیں۔ یا یہ ان کے اپنے فارمولے کے متکبرانہ اطلاق کی وضاحتوں اور جواز تلاش کرنے سے ہو سکتا ہے یا یہ قواعد وضوابط سازباز درسازباز سے یا قانونی ہرجانے اور مشقتیں دینے سے کیا جا سکتا ہے۔ یا لیکچر دینے۔ الزامات عائد کرنے سے ممکن ہے جیسے کہ زبان کے پُرجوش استعمال سے انسانی روح دوبارہ تخلیق کی جا سکتی ہے۔ یا صرف انتظامی بندوبست سے ایسا ممکن ہے یا صرف اعداد وشمار کے ذریعے ایسا ہو سکتا ہے۔ یا صرف اسلام کی بات کرنے سے کام چل سکتا ہے یا پھر لوگوں کے بعض نظریات اور روایات سے قدرتی جذبات اور وابستگی کو دبا کر ایسا ممکن ہے۔

گذشتہ ۱۴ برس میں مختلف سیاسی پارٹیوں نے مختلف اوقات میں ان فارمولوں کو استعمال کیا ہے لیکن اس کا اثر توقعات اور امیدوں کے بالکل برخلاف رہا ہے۔

اب وقت ہے کہ نئے طریقے آزمائے جائیں صوبائیت کے خلاف ایک کھلا حملہ کیا جائے میں نے قومی یک جہتی پر ایک ہمہ وقتی اور مستقل کمیشن کے قیام کی تجویز پیش کی ہے۔ جو براہِ راست خودمختار پارلیمنٹ کو جواب دہ ہو۔

(اس کمیشن کے دائرہ کار کے لیے تجاویز دی گئی ہیں۔ ان کا بیان ہم یہاں غیر ضروری سمجھتے ہیں۔)

اسلامی قوانین

پاکستان کا قیام اسلامی نظریات کا مرہونِ منت ہے۔ پاکستان جیسے ملک کے معاملے میں آنے والے کئی برسوں تک ملک کے مختلف حصوں کے درمیان اسلام ایک مضبوط رشتہ فراہم کر سکتا ہے اور

مسلمانوں کے لیے مذہب میں بہت زیادہ کشش ہے۔اس مخصوص معاشرے نے اپنی پوری تاریخ کے دوران نہ تو پیوریٹین ازم کو پسند کیا ہے اور نہ ہی اقتصادی ترقی کو (یہ قسمت، تقدیر، حیاتِ اخروی، رزق، مقسوم وغیرہ پر ایمان رکھتے ہیں) پاکستان کی اسلام سے بالکل قطع تعلقی کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم اس کے وجود کا جواز ہی تباہ کر دیں۔لیکن ہم نہیں چاہتے کہ ناپختہ کار ملاؤں کی اکثریت مملکت کو یمن میں تبدیل کر دے۔

ان دونوں انتہاؤں کے مابین ایک خوشگوار درمیانی راستہ تلاش کرنا چاہیے۔ جہاں ہمیں اپنی انتظامیہ اور امورِ مملکت کو تعصب کے اندرونی اثرات سے محفوظ رکھنا چاہیے۔وہاں ہمیں اپنے عوام کے مذہبی جوش کے نکاس کے لیے ہی ایک ریچ دار ٹونٹی فراہم کرنی چاہیے۔میرے خیال میں اس کے لیے بھی ہمیں ایک کمیشن قائم کرنا چاہیے اور سارا بوجھ اس پر ڈال دینا چاہیے۔

متبادل فارمولے

میں نے کچھ متبادل فارمولوں پر بھی غور کیا ہے۔آمریت کا کوئی دفاع نہیں کیا جا سکتا یہ ناقابلِ عمل فارمولا ہے۔ برطانوی پارلیمانی نظام یہاں بغیر کسی ملاوٹ کے چلایا گیا ہے۔لیکن اس میں بھی کچھ کمی رہی ہے۔امریکی نظام جب اپنی خالص شکل میں کسی ایشیائی قوم یا نسبتاً کم ترقی یافتہ اور اقتصادی طور پر کم خوشحال انسانی وحدت نے آزمایا ہے تو اس نے لاتعداد برائیوں کو جنم دیا ہے۔

(۴)

''بادشاہت رائج کیے بغیر ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوسکتا''*

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے نام پیر علی محمد راشدی کے خط کا متن

منجانب

پیر علی محمد راشدی

سفارت خانہ پاکستان

منیلا

۲۷ جولائی ۱۹۶۱ء

جنابِ عالی!

میں حضور کے یکم جولائی کے نوازش نامے کے لیے تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ یہ خط میری آئینی تجاویز کے جواب میں ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ 'یہ (بادشاہت) کتنی بھی اچھی چیز کیوں نہ ہو مگر آج کے زمانے میں اس کی طرف دوبارہ رجوع کرنا بے موقع معلوم ہوتا ہے۔'

اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ اس خط کے ساتھ منسلک میرا تھیسس اس نقطے کی وضاحت کرتا ہے کہ اب مجھ پر یہ کھلا ہے کہ میرے پہلے سے اس نقطے کی وضاحت نہ کرنے کے باعث اس میں ایک خلاء رہ گیا تھا۔

مجھے آپ کی انصاف دوستی سے امید واثق ہے کہ آپ میری ان گزارشات کے مطالعے کے لیے بھی چند لمحے نکال لیں گے تاکہ اس سلسلے میں جو کچھ میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ بھی آپ پر واضح ہوسکے مجھے یہ بھی امید ہے کہ قابلِ احترام کابینہ کی کمیٹی میری زیرِ نظر گزارشات پر غور کرتے وقت میری ان معروضات کو بھی زیرِ غور رکھے گی جو میں پہلے سے ارسالِ خدمت کر چکا ہوں۔

---

* ہفت روزہ 'معیار'، کراچی، جلد ۹، شمارہ ۱۵، ۱۴ تا ۲۰ جنوری ۱۹۸۴ء

صدر عالی قدر اس گفتگو کو سمیٹتے ہوئے میں اس امر کی اجازت چاہوں گا کہ میں آپ سے بلاواسطہ طور پر چند باتیں عرض کرسکوں۔ میرے جذبات اور حب الوطنی کا احساس مجھے مجبور کرتے ہیں اپنا دل کھول کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ سیاست ایک طرح کی ریاضت ہے اور مجھے اس کے چند گوشوں کا علم ہے، میں نے اس میں کبھی دھوکا نہیں کھایا آپ مجھ پر اعتماد کریں۔

حضورِ والا میں بصد احترام یہ عرض کروں گا کہ جب تک ملک میں بادشاہت رائج نہ کی جائے یہ ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی ایسے نظام کو رائج کرنے کی سعی کی گئی جو بادشاہت سے کم درجے کی شے نکلا تو مجھے اندیشہ ہے کہ یہ چلے گا نہیں کیونکہ یہ غیر فطری ہوگا اور یہ یوں ہم اپنی تاریخ سے غلطی کرنے اور سیکھنے کے باب میں ایک اور پیراگراف کا اضافہ کریں گے اور یوں ہمارا تصادم اور غیر یقینی صورت حسبِ سابق جاری رہے گی۔ اس کے برعکس ہم اپنا آخری صحت یابی کا وہ موقع بھی ضائع کردیں گے جو آپ نے فراہم کیا۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہوگی۔ (یہ جناب صدر آپ کے اور آپ کے ناچیز خادم کے مابین ہے۔)

یہ گزارشات میں ذاتی سطح پر کررہا ہوں۔

مجھے آپ کی ذاتی دشواریوں کا علم ہے۔ اگر آپ میری تجویز مان لیں تو بلاشبہ یہ آپ کی طرف سے ایک عظیم قربانی ہوگی۔ یہ امر کانٹوں کا تاج پہننے کے مترادف ہوگا اور یوں شاید آپ کا وہ ذہنی سکون بھی متاثر ہو جس پر آپ کی شاموں کا حق ہے یوں شاید اس پر آپ کو اپنے خاندان کی آزادی بھی قربان کرنی پڑے اور اس باعث شاید آپ ہدفِ تنقید بھی بن جائیں اور آپ کے بارے میں بعض غلط فہمیاں بھی پیدا ہوسکتی ہیں لوگ ناشکرگزاری بھی کرسکتے ہیں یوں آپ اندھیرے میں جست لگائیں گے آپ کو خدشات کا سامنا بھی ہوگا اور آپ کے رستے میں بے شمار مشکلات بھی آئیں گی۔ یہ سب کچھ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ممکن ہے لیکن میں اس سلسلے میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ میرے خیال میں اس مشکل صورتِ حال سے نپٹنا بھی ممکن ہے حضورِ والا اگر یہ مان بھی لیا کہ سب امکانات موجود ہیں تو بھی مجھے آپ جیسے سپاہی اور محبِ وطن سے یہ توقع نہیں کہ وہ ان مشکلات کے سامنے ہتھیار ڈال دے اور پھر سے اس سارے ملک کو بے یقینی کے عفریت کے حوالے کردے اس ملک کو جس نے آپ سے بے پناہ محبت کی ہے۔ اگر آپ کو آخرکار یہی کچھ کرنا تھا تو پھر آپ نے ہمارے دلوں کو امید کی روشنی سے کیوں منور کیا۔ ہمارے

دلوں کو خوشیاں کیوں عطا کیں اور ہمیں خوش آئند مستقبل کی نوید کیوں دی؟ آپ کو یہ تو علم تھا ہی کہ ہم مکمل تباہی کی طرف تیزی سے گامزن ہیں۔ پھر آپ ہمیں اپنے انجام تک پہنچنے دیتے اور یوں ہماری یہ اذیت تو ختم ہوتی آپ نے ہمیں آخری مرحلے میں کیوں روک لیا۔ اور ہمارے دلوں کو پھر سے زندہ رہنے کی امید دلا کر ہماری اس اذیت کے دن کیوں بڑھا دیئے؟

سپردِ خاک ہی کرنا تھا مجھ کو
تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہوں

آپ خیال فرمائیں کہ اگر آپ کا موجودہ تجربہ ناکام ہو گیا تو پھر کیا ہوگا۔ اس تجربے کو درمیان میں چھوڑ دینے سے اس ملک کے لیے وہ آخری موقع بھی ضائع ہو جائے گا جو اسے ملا ہے؟

مجھے اس میں بالکل کوئی شبہ یا خدشہ نہیں کہ میری دی ہوئی تجویز قابلِ غور اور قابلِ عمل ہے۔ حضورِ والا کیا آپ اس تجویز کو درج ذیل شرائط پر قبول کرنے کو تیار ہوں گے۔

۱۔ اگر ملک کے سیاستدانوں کی بھاری اکثریت جس میں وہ سیاست دان بھی شامل ہیں جو ایبڈو کیے جا چکے ہیں (سوائے ان کمیونسٹوں کے جو ہر اس تجویز کے خلاف ہیں جو پاکستان کے استحکام میں مدد ہو) اگر تحریری طور پر میری تجویز کی توثیق کر دیں تو کیا آپ اسے شرفِ قبولیت بخشیں گے؟

۲۔ اگر قومی سطح پر میری تجویز اور دوسری تجاویز کی بنیاد پر استصوابِ رائے کروایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ قوم کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا؟

۳۔ بین الاقوامی برادری میں جو ممالک ہمارے دوست ہیں جن میں امریکہ بھی شامل ہے اس امر کی پیشگی منظوری دے سکتے ہیں۔

۴۔ قومی اور بین الاقوامی پریس کی حمایت بھی اسے حاصل ہے؟

۵۔ اس خاص موضوع پر پاکستان میں کسی منتخب جگہ استصوابِ رائے کروالیا جائے؟

اگر آپ مجھ سے متفق ہوں اور مجھے اس بات کا موقع دیں اور مناسب سہولتیں فراہم کریں تو مجھے پوری امید ہے کہ تقریباً چھ ماہ میں، میں لوگوں تک اپنی بات بھی پہنچا دوں گا اور مذکورہ بالا بیشتر شرائط بھی پوری کر دوں گا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں۔ مجھے یہ بھی ممکنات میں سے نظر آتا ہے کہ اگر اس کے مقابلے

میں کوئی متبادل اسکیم سامنے آئے تو میں پارلیمنٹ سے اسے رد کروالوں۔ بشرطیکہ پارلیمنٹ ذہنی طور پر مفلوج لوگوں کی نہ ہو۔ مگر اس کے لیے میری دو شرائط ہیں۔ اوّل تو یہ کہ پارلیمنٹ کے اراکین عمومی سوجھ بوجھ رکھتے ہوں۔ روشن دل ہوں اور حب الوطنی کے جذبے سے عاری نہ ہوں اور دوم یہ کہ مجھے ان کے درمیان کام کرنے کے لیے مناسب موقع فراہم کیا جائے اس کامیابی میں میرا کوئی کمال نہیں ہوگا۔ میں ناچیز ہوں اور اپنی حدود کو پہچانتا ہوں۔ یہ سب کچھ اسی باعث شرفِ قبولیت پائے گا کہ ہمارے ملکی حالات میں ہماری تربیت، روایت اور افتادِ ذہنی کے پیشِ نظر آئینی بادشاہت کے نظام کے علاوہ چارہ نہیں۔

حاصلِ کلام یہ ہے جناب والا کہ ہمارے ملک کو ایک باپ کی ضرورت ہے انہیں کسی ایسے صدر کی ضرورت نہیں جو اپنی بقا کے لیے بار بار ووٹ مانگنے کے لیے مستقل گردش میں رہے۔

نہایت عجز و انکسار کے ساتھ

میں ہوں

میں آپ کا خادم

(دستخط)

پیر علی محمد راشدی

ضمیمہ

کیا آج کی دنیا میں بادشاہت کا نظام بے مقصد اور فرسودہ ہو چکا ہے۔

یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ کیا واقعی بادشاہت کا نظام بے مقصد اور فرسودہ ہو چکا ہے میرے لیے ضروری ہے کہ میں بات ذرا کھول کر بیان کروں یہ دیکھنا ہوگا کہ ریاست کے سربراہ کے عہدے کی ابتدا کیسے ہوئی اور اس کے اختیارات کیا ہیں۔ یہ بھی تفصیل میں دیکھنا ہوگا مختلف حالات، مختلف آئین کی روشنی میں ان مقاصد کو پورا کرنے کا اہتمام کیسے کیا جاتا ہے۔

میری ناقص رائے میں ریاست کے لیے بادشاہت کا نظام ابھی فرسودہ نہیں ہوا آج کی دنیا میں بھی مخصوص مقامی حالات کے تحت بادشاہت کو نہ صرف قائم رکھا گیا ہے بلکہ متعارف بھی کروایا

گیا ہے۔ چنانچہ بادشاہت نہ صرف موجودہ ہے۔ بلکہ پھل پھول رہی ہے اور کسی طرح کا بھی کوئی اور نظام اسے نیچا دکھانے میں کامیاب نہیں ہو پایا اور نہ ہی یہ ثابت ہوسکا ہے کہ بادشاہت مقابلتاً کمتر چیز ہے۔

درحقیقت اس ضمن میں مرکزی نقطہ اور خیال یہ ہونا چاہیے کہ:

۱۔ کیا کسی ملک کے مخلوص حالات اور کوائف ایسے ہیں جو حتمی طور پر خاص نوعیت کے ہوں۔

۲۔ اگر ایسا ہو تو پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ سربراہِ مملکت کی کون سی نوعیت ان حالات و کوائف کے تقاضے کماحقہ پورے کر سکے گی۔

میں زیرِ نظر معروضات میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا۔

۱۔ پاکستان میں بعض حالات و کوائف ایسے ہیں جن کی نوعیت خصوصی ہے۔

۲۔ ان حالات و کوائف میں یہ لازم ہے کہ اس ملک میں بادشاہت قائم کی جائے۔ کیونکہ کوئی اور طرزِ حکومت ان مخصوص حالات اور ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی جو پاکستان کو درپیش ہیں۔

مگر اس سے پہلے کہ میں اس منزل تک پہنچوں۔ موجودہ مطالعے کے دوران میں اس کے (۱) پس منظر (۲) عوامل اور (۳) اس کے برعکس نظریات کی محدودیت پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔

میری مراد سربراہِ مملکت کے جمہوری (ری پبلکن) تصور سے ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں صرف یہی ایک نقطۂ نظر ایسا ہے جسے اس مقصد کے برعکس کہا جاسکتا ہے۔ ایسا کرنے میں میرا مقصد یہ ہے کہ میں قابلِ قدر کمیٹی کو یہ باور کرانے کی کوشش کروں:

(الف): کہ آج دنیا میں بھی جمہوری تصور کو نہ کبھی بے سوچے سمجھے سب مسائل کا حل خیال کیا گیا ہے نہ ایسا کرنا ممکن ہے کیونکہ کسی بھی ملک کے خصوصی حالات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوگا اور ایک ہی نسخہ سب ممالک کے لیے تجویز نہیں کیا جاسکتا۔

(ب): اور جب کبھی جمہوریت کا یہ تصور مخصوص حالات کو پیشِ نظر رکھے بغیر لاگو کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو نتائج تباہ کن نکلے ہیں۔

(ج): موجودہ دور میں بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ آزاد دنیا کے اندر بھی بعض ممالک ایسے ہیں جہاں صرف بادشاہت ہی کامیاب ہوسکتی ہے۔

(د): آج کی دنیا میں بھی بعض مخصوص حالات میں بادشاہت کی افادیت کو محسوس کیا گیا ہے

اور بادشاہ کو سربراہِ مملکت کے طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔

ریاستی جمہوریت کیسے۔ کب اور کیوں؟

آیئے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ عظیم انقلابِ فرانس جو ۱۷۸۹ء میں رونما ہوا زبردست تاریخی اور سیاسی محرکات کا منبع ہے۔ جب سے لے کر اب تک اس کے شدید اثرات انسانیت پر مرتب ہوئے ہیں اور یہ ۱۸۰ سال کی تاریخ کے دھارے پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ اس کے باعث سربراہِ مملکت کے بارے میں تصورات بھی تبدیل ہوئے ہیں پہلے ریاستیں سربراہوں کی مرہونِ منت تھیں مگر اب سربراہان ریاستوں کے مرہونِ منت ہیں۔ پہلے ریاستیں ہتھیار تھیں جو سربراہانِ مملکت اپنے مقاصد کی برآوری اور شان و شوکت بڑھانے کے لیے استعمال کرتے تھے مگر اب معاملہ الٹا ہو چکا ہے سربراہانِ مملکت خود ریاست کے ہاتھ میں کھلونا ہیں جو متعین مقاصد حاصل کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

اس ساری گفتگو سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ۱۷۸۹ء کی شورش یہی تبدیلی لے کر آئی تھی۔

لیکن یہاں یہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ یہ متعین مقاصد (جنہیں پورا کرنے کے لیے اب سربراہانِ مملکت کو استعمال کیا جاتا ہے) ہر ریاست میں مختلف ہوتے ہیں اور انہی مختلف النوع مقاصد ہی کے باعث سربراہانِ مملکت کی نوعیت تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے یا دوسرے لفظوں میں ہر ملک یا قوم نے یہ فیصلہ کیا۔ اوّل تو یہی کہ اس کے خصوصی مقاصد کیا ہیں اور دوسرے یہ کہ ان مقاصد کے تحت ان کے لیے کیا سربراہِ مملکت موزوں رہے گا۔ ہر ریاست پہلے ان دو بنیادی نکات کو حل کرتی ہے اور پھر اس کے بعد اس کے مطابق باقی فیصلے بھی کیے جاتے ہیں یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ اس سلسلے میں تمام ممالک ایک ہی نتیجے پر پہنچے ہیں کیونکہ نتیجہ مختلف ریاستوں میں ایک جیسا نہیں ہوتا۔ کوئی بھی دو ممالک خواہ ان کے درمیان کتنے ہی دوستانہ تعلقات کیوں نہ ہوں اس سلسلے میں ایک ہی نتیجے پر نہیں پہنچتے۔ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے انقلابِ فرانس بھی زمانہ مابعد میں تمام ممالک میں ایک جیسے سربراہانِ مملکت پیدا نہیں کر سکا۔ اس کی وجہ مقامی حالات، نسلی تخصیص، سیاسی مسائل اور دوسری قومی ضروریات ہیں۔

انقلابِ فرانس کے بعد آنے والے زمانے میں کیا ہوا اس کا ایک مختصر سا جائزہ اسے ثابت

کرنے کے لیے کافی ہوگا۔

فرانس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس حقیقت پسندی اور صحت مند فکر کی بنا پر نہیں بلکہ ردِعمل کے طور پر بادشاہی ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ اور پھر اس کے باعث بے شمار خرابیاں پیدا ہوئیں یہ فیصلہ انتقامی طور پر کیا گیا کہ بادشاہت ختم کر دی گئی اور جمہوریت (Republicanism) کو اپنا لیا گیا چونکہ یہ فیصلہ خالصتاً غصے نفرت اور جذباتی ہیجان کی بنا پر کیا گیا تھا بعد میں آنے والے حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ نظام چلنے والا نہیں تھا۔ بجائے اس کے کہ فرانس کو ایسی استقامت ملتی جو اسے تاریخ کے طوفانی حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتی۔ انتقامی طور پر ملک کو جمہوری ریاست بنانے کے فیصلے نے فرانس کو ہر طرح کے آئینی تجربوں کے لیے غریب کی جورو بنا دیا۔ چنانچہ پچھلے ۱۸۰ سال کی مدت میں فرانس کن کن عظیم ہیجانوں اور طوفانوں میں سے نہیں گزرا۔ پہلے تو فرانس ری پبلک بنا پھر ایک کونسلیٹ کے تحت آیا اور پھر نپولین کی بادشاہت قائم ہوئی پھر سو دن کی سلطنت بنی پھر ویلنگٹن راج آیا اور ایک بار بوریون کی نسلی بادشاہت قائم ہوئی پھر ری پبلک بنی۔ پھر تیسرے نپولین تشریف لائے پھر ری پبلک کا وہ دور آیا جب وزارتیں پرچھائیوں کی طرح تبدیل ہو جاتی تھیں۔ پھر جرمن راج قائم ہوا ایک بار پھر ری پبلک نے اپنا حصہ وصول کیا۔ پھر ڈی گال کی انفرادی آمریت قائم ہوئی۔ چنانچہ فرانس کی ایمپائر ختم ہوگئی۔ اس کی شان و شوکت اور قوت قصۂ پارینہ بن گئی۔ کوئی بھی تصادم ایسا نہ تھا جس میں اسے شرمناک شکست نہ ہوئی ہو۔ اور ابھی چھ ماہ پہلے فرانس خانہ جنگی کے دہانے پر کھڑا تھا۔ الجزائر نے اس کی رگوں کا خون خشک کر دیا ہے کیونکہ فرانس افریقہ میں ماضی کی کمائی ہوئی کالونیوں کو قائم رکھنے کی جان توڑ کوشش کر رہا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر فرانس اپنا وقار کھو چکا ہے اور اب وہ اس سطح پر پہنچ گیا ہے کہ اسے رسمی طور پر بین الاقوامی اچھوت قرار دے دیا جائے اور آخر کار ساری آزاد دنیا میں وہ اپنے اس کینسر کے پھوڑے کی وجہ سے جلاوطن ہو چکا ہے اس کا مستقبل بھی روشن نہیں ہے کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ ڈیگال کے بعد کیا ہوگا۔

چنانچہ یہ ہے وہ سلوک جو غلط اور بے سمت ریاستی جمہوریت (Republicansim) نے اس ملک سے کیا جو تمام ریاستی جمہوریت کی ماں تھی، اس نے اس کی ہزار سالہ تاریخ کا ستیاناس کر دیا۔ شارمین، سینٹ لوئیس، فرانس اوول ہنری چہارم، لوئیس چہاردہم وہ حال کر دیا کہ گویا فرانس ایک

ایسا جہاز جس کا عملہ ہوائی سفر کے نصف میں سمت کی حس ہی کھو چکا ہے۔ شاید اس عمل کو اپنے آخری نقطے تک پہنچے کے لیے ایک اور تاریخی کروٹ کی ضرورت ہے مگر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ فرانس ریاستی جمہوریت کے تجربات سے تنگ آ چکا ہے۔

اسپین

پیرس کے اس پار ہمعصر اسپین تبدیلی کو قبول کر چکا ہے مگر ایک محلد وجود تک، اس حد تک جہاں اس کے حالات اسے اجازت دیتے ہیں انہیں معلوم تھا کہ ان کا مسئلہ اس مسئلے سے بالکل برعکس ہے جو فرانس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ فرانس اپنے ماضی سے اپنا تعلق کلی طور پر قطع کرنا چاہتا ہے اسپین کے حالات ایسے ہیں کہ وہ اپنے ماضی کے ساتھ اپنا رشتہ قائم کرنے کے حق میں ہے۔ فرانس شدید ردِعمل کی گرفت میں ہے۔ اسپین کے رستے میں ایسی کوئی مزاحمتی دیوار نہیں تھی چنانچہ وہ چیزوں کو متوازن نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے تھے فرانس کا رویہ انتقامی اور تکلیف دہ تھا جبکہ اسپین کا طرزِ عمل ممانعتی اور تعمیری تھا چنانچہ ان کے فیصلے کے مطابق ان کے مقامی حالات سے تھی۔ اسپین نے بادشاہت کو قائم رکھا۔ صرف اس کے دائرۂ کار میں تبدیلی کر دی اور اسے قومی تقاضوں کے مطابق بنا دیا۔ فرانکو کے برسرِ اقتدار آ جانے کے باعث اسپین کے تاریخی عمل اور ملکی فکر میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی فرانکو خود بار بار یہی کہتے ہیں کہ ان کا راج عارضی ہے اور اسپین کا مستقبل ہمیشہ کی طرح اب بھی بادشاہت ہی سے متعلق ہے۔ بڑی سمجھ داری سے فرانکو نے عوام کے ذہن میں بادشاہت کے اعادے کے امکان کو قائم رکھا ہے۔ یہ مشاہدہ بھی کیا گیا ہے جب بھی بادشاہت کا یہ تصور دھندلا جاتا ہے تو اسپین کے عوام میں بے چینی پھیل جاتی ہے اور ان پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ صرف دو ہفتے پہلے ایسا پلاٹ منظرِ عام پر آیا جس کے تحت فرانکو کو ایک شاہراہ پر قتل کرنے کی سازش کا اہتمام کیا گیا۔ چنانچہ ان حالات سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اسپین کی تاریخ کے قدرتی دھارے میں یہ رکاوٹ دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی اس کا موازنہ برطانوی شہنشاہیت کی تاریخ میں کرامول کے کردار سے کیا جا سکتا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بادشاہت اسپین میں واپس آ رہی ہے اور یوں وہ پھر سے اپنی منزل کی طرف سفر جاری رکھے گی۔ بلاشبہ یہ مثال مقصدی

ہے اسے جغرافیے کی کرامت ہی سمجھنا چاہیے۔ کمیونزم کا طوفان مصر کی سات پلیگوں کی طرح حملہ آور ہوا ہے مگر یہ ایک استثنیٰ ہے۔ ایک ایسا عمل ہے جو ہزار دو ہزار برس میں کہیں ایک آدھ بار ہوتا ہے۔ انقلاب نے اس علاقے کی بادشاہتوں کو ختم کر دیا مگر اس کا منبع ان ریاستوں سے باہر تھا۔ وہ ایک امنڈتے ہوئے سیلاب میں بہہ گئے لہٰذا ان کی مثال جداگانہ ہے اور یہ دوسروں کے لیے مثال نہیں بن سکتی۔ اگر کمیونزم کے سامنے بادشاہتیں نہیں ٹھہر سکیں تو ریاستی جمہوریت بھی اس کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھی۔ چند ممالک نے جو کمیونزم کے اس طوفان سے بری طرح خوفزدہ تھے اپنی بادشاہتوں کو ختم کرنے میں بہت جلدی کی اور انہوں نے اس امید پر ریاستی جمہوریت میں پناہ لی کہ شاید وہ اس تبدیلی کے باعث اس خطرے سے محفوظ رہ سکیں مگر جب طوفان نے واقعی دروازے پر دستک دی تو ٹھکرائی ہوئی بادشاہتوں کی طرح ریاستی جمہوریت بھی ان کو حفاظت فراہم کرنے میں ناکام رہی اس کے معانی یہ ہیں کہ جب کمیونزم کسی ملک پر چھا جائے تو معاملہ بالکل ہی مختلف ہو جاتا ہے ایسے معاملے میں ریاستی جمہوریت ویسی ہی بے بس نظر آتی ہے جیسی کہ بادشاہت۔ بادشاہت بھی ریاستی جمہوریت کمیونزم کے زہر کا تریاق نہیں ہے لہٰذا اس سلسلے میں بلقان اور مشرقی یورپ کے ممالک ہمارے لیے کوئی مثال فراہم نہیں کرتے۔

تین اور ممالک اس سلسلے میں ہمارے لیے بلاواسطہ اہمیت کے حامل ہیں بات ختم کرنے سے پہلے مناسب ہوگا اگر ان پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔ ترکی نے اپنے مخصوص جغرافیائی حالات کی معلومات کا مطالعہ کرنے میں جو غلطی کی اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑی انہوں نے اپنے کاندھوں پر جو علاقائی اور نظریاتی بار اس وقت اٹھایا ہوا ہے وہ ان کی استطاعت سے کہیں زیادہ تھا۔ میرا اشارہ ان کی اس سلطنت کی طرف ہے جو مشرق و مغرب میں پھیلی ہوئی تھی اور اس میں ان کا اس وقت کا سلطان اور اس کی روحانی خلافت بھی شامل تھی مگر اس ناکامی میں بادشاہت کے ادارے کا کوئی حصہ نہیں اگر بادشاہت نے ایسا کیا ہوتا جیسا کہ الزام لگایا جاتا ہے تو یورپ کا مردِ بیمار بعد میں لاگو ہونے والی ریاستی جمہوریت کے باعث صحت یاب ہو جاتا۔ تین حقائق اس معاملے میں قابلِ توجہ ہیں (۱) ترقی کے اس دور میں اندرونی خلفشار کا شکار رہا اور اسے حقیقی استحکام کبھی نصیب نہ ہوا۔ (۲) اس کا آئین بار بار بدلتا رہا۔ (۳) جہاں تک بیرونی امداد کا تعلق ہے وہ ان کو روسی کمیونزم کے ہاتھوں فنا ہونے سے بچا نہیں سکتی تھی۔ اگر اس وقت بادشاہت موجود ہوتی تو مجھے

یقین کامل ہے کہ حالات اس سے زیادہ ابتر نہ ہوتے۔

مصر کی بادشاہت ختم ہو چکی مگر اس لیے نہیں کہ وہ بادشاہت تھی بلکہ اس لیے کہ اولاً کیونکہ آخری شاہی خاندان البانیہ کا تھا جو ترکوں نے وہاں مسلط کیا تھا اور بعد میں برطانیہ نے اس کی توثیق کی تھی۔ مگر اس کے باوجود اس خاندان کی جڑیں وہاں گہری نہ تھیں اور ثانیاً شاہی خاندان بھی اپنے تنزلی کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس سے پہلے کے لوگ اس بادشاہت کو خود تبدیل کر دیتے ملٹری نے آگے بڑھ کر اپنی آمریت قائم کر لی ایسے واقعات ہو جاتے ہیں مگر ان کو حادثہ ہی کہا جا سکتا ہے مگر ان کو عمومی اصول نہیں سمجھا جا سکتا جس کی بنیاد پر اس نتیجے پر فوراً جست لگا دی جائے کہ بادشاہت کا ادارہ مستقل طور پر مردود قرار پایا۔ محض اس وجہ سے ہوائی جہاز کا سفر ترک نہیں کیا جا سکتا کہ ایک بار تکنیکی نقص کے باعث جہاز زمین پر آ ٹکرایا تھا۔

جیسا کہ میں شروع ہی میں عرض کر چکا ہوں میری مندرجہ بالا معروضات کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ بادشاہت اب بھی بے وقت اور بے موقع نہیں ہے۔

۲۔ جدید دنیا میں بھی بادشاہت بعض مخصوص حالات و عوامل میں موزوں ہے۔

۳۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ بادشاہت کا مطلب جمہوریت کا خاتمہ ہو۔ بادشاہت اور جمہوریت کا مجموعہ آسانی سے بن سکتا ہے۔